

# Kainat-i-Adab

(Revised & Enlarged)

For  
HIGH SCHOOLS  
*Selected and Edited*

By  
M. A. HAMEED, "HAMEED"

*Editor "NIZARAH"*  
And

کائناتِ ادب

(Third Edition)

AUTHOR OF :—

"BEHRIS LABAN," "JANGGI KARIMA",  
"PAIMANA-I-ISHQ"

etc, etc.

PUBLISHED BY :—

**Educational Book House,**

Civil Lines, ALIGARH.



# کائنات ادب

۸۲ ۳۳ ۳۳  
۱۹۱۰

ترمیم شدہ

مؤلفہ

محمد عبدالحمید حمید میرٹھی سابق ایڈیٹر "نظارہ" میرٹھ

مصنف

بحرین جنگی کریما بیاتہ عشق وغیرہ وغیرہ

CHECKED

(جلدہ تفوق محفوظ میں)



(میسرا ایشین)

کچھ نیشنل بک ہاؤس

بک لینڈ سٹورز  
سول لائن - علی گڑھ







بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مقدمہ

معزز ناظرین! علی گڑھ، بنارس، ہندو یونیورسٹی بنارس، میسور یونیورسٹی، بٹنہ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بنارس ہندو یونیورسٹی، ناگپور یونیورسٹی، اندھرا یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، مراداس یونیورسٹی، جمشیدی یونیورسٹی، کائنات ادب کی خصوصیات کو خاص توجہ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے اپنے نصاب تعلیم میں داخل کر کے جس قدر میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کے شکریہ کے لئے الفاظ میسر نہیں آتے۔

کائنات ادب کے متعلق ہندوستان کے مستند اہل قلم اور سرسرتہ تعلیم کے

مبصر حضرات نے جس قدر کشادہ دلی اور حسن اخلاق سے اظہار خیالات فرمایا ہے وہ میرے لئے ہر حیثیت سے قابل قدر ہے۔

**کائنات ادب** کی خصوصیات پر معزز مدیران اخبارات و رسائل نے جن ریویو فرمائے ہیں وہ میرے لئے ہر طرح باعث فخر ہیں۔

آج کل اُردو کا میدان بہت کچھ وسیع ہو گیا ہے، چند سال پہلے اُردو کی تعلیم میٹرک پولیشن دینا ہائی اسکول تک محدود تھی، مگر اب ایک نئے تک ضروری سمجھی جاتی ہے اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس قدر زبان وسعت اختیار کر رہی ہے اسی قدر اس کے انتخابات کا میار بھی بلند ہو رہا ہے، اس لیے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ کائنات ادب میں موجودہ ضروریات کے مطابق ترمیم و توسیع کی جائے اور اُردو و نصاب تعلیم میں طلباء کے لئے وہ مواد فراہم کیا جائے جو ان کی ترقی کی رفتار کو بھی بڑھائے اور وہ اپنی زبان کی تعلیم میں کسی طرح حقیقت چھپے نہ رہیں۔

**کائنات ادب** کے متعدد مضامین کی عبارات متقنی و سجع تھیں اور بعض اشعار بھی ایسے تھے جن کے استعارات و تشبیہات کے سمجھنے میں طلباء کو دشواریاں پیش آتی تھیں اس قسم کے نذرانہ کو کائنات ادب کے نقش ثانی میں الگ کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ایسے مفید مکتوبات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جو ہندوستان کے بہترین اہل قلم کے اسالیب بیان کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً مولانا محمد حسین آزاد و بلوئی کا خط مولانا نوکاء اللہ دہلوی کے نام، مولانا حافظ نذیر احمد دہلوی کا خط مولانا بشیر الدین کے نام، مولانا ذکا اللہ دہلوی کا خط مولانا سید حسن نظامی کے نام، حضرت اکبر الہ آبادی کا خط مولانا شبلی نعمانی کے نام اور

مولانا نسلی نعمانی کا جواب حضرت اکبر الہ آبادی کے نام

ادبی لحاظ سے یہ مکتوبات بہت دلچسپ اور مفید ہیں۔

مجھے انتخابات جو میٹرکولیشن یا بائی اسکول میں بسلسلہ درس مروج رہے ہیں وہ اگرچہ وسیع النظر موفین کی قابل قدر جاں کاہلوں کا ایک کامیاب نتیجہ ہیں اور ایک حد تک اُن سے طلباء نے فوائد بھی حاصل کئے ہیں تاہم موجودہ زمانے کی ضروریات کو پیش نظر اُن کو میسر انتخاب پر جانچا جاتا ہے تو وہ بہت ہلکے نظر آتے ہیں۔

اس لئے میں نے کائناتِ ادب کی تالیف و ترتیب میں اس مرتبہ جی لا اسکول اس امر کی کوشش کی ہے کہ یہ جدید گورنمنٹ ہر حیثیت سے طلباء کے لئے مفید ہوگا۔ رائے ثابت ہو۔

کائناتِ ادب میں زیادہ تر مضامین انھیں مسلم ثبوت اہل قلم کے لئے گئے ہیں جن کا مرتبہ بہ اعتبار فضل و کمال ممتاز و حدیث لکھا ہے اور ہر مضمون کو نہ صرف میسر ادب پر جانچا گیا ہے بلکہ یہ خیال بھی رکھا گیا ہے کہ اس کا اثر طلباء کی طبائع و اخلاق پر کسی حیثیت سے بھی مضرت نہ پڑے، ہر مضمون نگار کے مختصر و سلیخ حیات کے ساتھ اس کے طرز قلم کا ادبی اور نثری تعلیمی کے متعلق بھی ایک محققانہ تبصرہ کر دیا گیا ہے تاکہ طلباء اہل قلم کی حالات زندگی کی واقفیت کے ساتھ ان کی خصوصیات سے بھی بے خبر نہ رہیں علمی مضامین کی طرح مشہور ادیبوں اور دانشوروں کے مکتوبات بھی ادب اور دُر کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہیں انصاف تعلیم کا اس گراں بہا اور مفید سرمایہ سے اب تک محسوم رہنا تعجب انگیز ہے اور اس کی وجہ صرف ہی علوم ہوتی ہے کہ ہمارے موفین یا نوان کی فراہمی سے عاجز و درماندہ ہیں یا اُن کی نگاہِ انتخاب کا دائرہ ہی تنگ رہا ہے کیوں کہ پچھلے

انتخابات میں حضرت غالب مرحوم کے چند مشہور و مطبوعہ خطوط کے سوا کسی اور اہل علم کے  
مکتوبات مطلق نظر نہیں آئے،

کائناتِ ادب میں ایسے مکتوبات کافی تعداد میں ملیں گے جو ابھی تک طباعت و اشاعت  
کے مرہون منت نہیں ہوئے ہیں، ان مکتوبات سے ہر اہل قلم کے فطرتی مذاق اور صحیح  
اندازِ تحریر، وسعتِ معلومات، طریقہ تعلیمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور ان میں دُرُ مُرَوِّد کی  
سلیس محاورے بے تکلف بول چال، غرضِ شہسوم کی تحقیق و تدقیق کا عنصر لطیف موجود ہے  
حضرت غالب مرحوم کے خطوط میں زبان کے پتھارے مزا دیں گے تو حضرت امیر مرحوم  
کے پند و نصیحت، رموزِ زبانِ دانی، تعلیم و دعائی، تفریح طبع کا سامان نظر آئیں گے،  
حضرت داغ مرحوم کی شوخی تحریر اور طرزِ ادب بندہ کی دل کو ٹہپائے گی تو سرسید مرحوم اور  
حضرت حالی کا قومی سوز و گداز روح کو بے چین کر دے گا۔

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی معجز نگاری از زبانِ انبی کا لطف پیدا کرے گی تو مولانا  
ابوالکلام مرحوم اور حافظ تہجد احمد مرحوم و مولانا شبلی نعمانی کی طرزِ ادب انرا کی شان کھائے گی  
حضرت اکبر الہ آبادی کے اخلاقی و گنہ گرانہ خیالات سے دل کی آنکھیں روشن ہوں  
گی تو بین السلطنت ہمارا جہ سرکش پرشاد نشاد، جناب سید سجاد حیدر، یلدرم جناب  
شوق قدوائی، جناب بیاض نمبر آبادی و جناب جلیل انگویدی وغیرہ وغیرہ حضرات  
کی سحر نگاری اور قلم کی شوخی آپ سے زبردستی خراجِ تحسین حاصل کرے گی۔

موتیف نے برہمنی تجسس و تلاش کے بعد کائناتِ ادب کے لئے اس  
فد کے منتخب مکتوبات فراہم کئے ہیں۔  
کائناتِ ادب میں بہلا مضمون (زبانِ اردو کی تاریخ) شمس العلماء

مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کی وسیع النظری کا بیش بہا نمونہ ہی اس مضمون میں زبان اردو کی تاریخ پر درجہ کا تسلط ملک اور زبان پر اردو کی وجہ تسمیہ زبان ریختہ، الوازب زائے کی گفتگو محمد شاہی شکر کا نمونہ سید انشا اور منظر جاجاناں کی گفتگو، اردو تصانیف کی ابتدا وضع طور پر کئی کئی ہجرتوں سے طلباء کو زبان اردو کی ماہیت بخوبی معلوم ہو جائے، اگرچہ مولانا آزاد نے عالم کسی خاص رنگ کا محتاج نہیں کیا ہے جس میدان میں قدم رکھا ہے ہمیشہ کامیابی کی علامت ہے۔

”سولہ لکھن پانچ سید“ یہ سید مرحوم کا ایک نہایت ہی قابل قلم اور بلند پایہ مضمون ہے جس میں تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہونے کو دو دنیاوی اصول قرار دیے گئے ہیں اور ان کے بیچ دو عواقب پر نہایت نصیحت آمیز اور خوش سرایہ پس منظر کشی ڈالی گئی ہے۔

مولانا جاحکی مرحوم نے مذہب زبان گویا ”میں زبان کی شیرینی مختلف پہلوؤں سے دکھائی ہے اور حکمت و برعظمت کے ایسے لطیف مسائل بیان کئے ہیں جو طلباء کے دل و نصیحت کا ایک مکمل دفتر ہیں اور ان کے خلاق پر نہایت اچھا اثر ڈالتے ہیں۔“

”کارخانہ تقدیرت“ میں مولوی رفیع احمد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ اظہار کا حقہ تھا، یہ مضمون دہلی کی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانی نے حضرت امیس کی شاعرانہ خصوصیات اور فصاحت و بلاغت کو جو فوٹو کھینچا ہے وہ اظہار میں شمس ہے۔

”فرہنگ انگریزی الفاظ“ میں شمس العلماء مولانا ذکار اللہ نے ان الفاظ کی جو عام طور پر ادب اردو میں متعل میں تشریح کی ہے اور ان کا محل صرف اور صحیح مفہوم نہایت عمدہ طریقہ پر سلیس زبان میں بتایا ہے۔

”اردو سے ہندوؤں کا تعلق“ یہ تاریخی مضمون حضرت شمس لکھنوی صاحب

فاضل کی وسیع نظری و معلومات کاملہ کا نتیجہ ہے جس میں زبان اردو کی اصلیت اور اس کی  
 و تقسیمہ اور اس کی ابتدائی حالت اور اس کا ترقی کرنا وغیرہ وغیرہ بہت عمدگی کے ساتھ دکھایا ہے جس  
 طلباء زبان اردو کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔  
 ”وسعت خیال“ میں حضرت مولانا شوکت مرحوم نے ایک فلسفیانہ اور محققانہ بحث  
 کی ہے۔ منہوی پہلوؤں کے اعتبار سے یہ مضمون دریا بہ کوزہ ہے۔

”سفر بغداد“ میں جناب سید سجاد حیدر یلدرم نے حالات سفر ذکر کرنا بھی تا  
 بغداد کا سچا نوٹ اس دل کش انداز سے لکھنا ہے کہ سبحان اللہ اور باشندگان  
 بغداد و بصرہ وغیرہ کے طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات کا ایک  
 بیش قیمت ذخیرہ ہم پہونچا ہے۔

”فروع ادب“ میں سر عبد القادر نے ادبیت کی شان جس عمدہ اصول اور  
 طریقہ سے دکھائی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

”میر واد نہ“ حضرت دلغ و امیر، میں مولانا ندرت صاحب نے دکھایا ہے  
 کہ ایک ہی زمین و قافیہ میں ان دونوں مسلم الثبوت استادوں نے کیا کیا کمال  
 دکھائے ہیں اور کس کا پلہ بھاری رہا ہے۔

”تحفہ نظم“ میں سودا نے قصائد میں بلاغت اور نزاکت کا خاتمہ کر دیا ہے  
 غزلیات میں ادق کی زبان سے قطع نظر کے، بہ اعتبار جوہر کلام جو کچھ کہا ہے سربا پا  
 مرصع ہے،

میر درد نے واردات قلبی سے متاثر ہو کر تصوف میں جو شعر کہا ہے وہ  
 سوز و گداز کا سچا نوٹ ہے

میر تقی نے زبان کی سلاست و فصاحت کا جو پہلو دکھایا ہے اس کی نظیر محال کیا  
 ناممکن ہے۔

سید انشاؤ نے اپنی زور و طبع سے وہ جو ہر دکھائے ہیں جو اہل ادب کے مخفی نہیں اور  
 یہ وہ کلام ہے جو زبان حال میں زبان قدیم کا جزوی پہلو کئے ہوئے ہے۔  
 مصحفی نے فنِ سخن کے قواعد و ضوابط کو لفظ بہ لفظ ادا کیا ہے اور سادگی کے  
 ساتھ جو شعر کہا ہے وہ بے مثل ہے۔

ناسخ نے صائب کی نازک خیالی کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی بلند پروازی  
 کے ساتھ برتا ہے جو ان کے لئے باعثِ فخر ہے۔

ذوقی نے سودا کے بعد تصانیف میں جو مرتبہ حاصل کیا ہے وہ اربابِ فن سے  
 کافی خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ غزلیات میں نازکی مضامین، اصفائی کلام جیسی ترکیب  
 خوبی و محاورات کا ہر پہلو قابلِ داد ہے،

غالب علی کل غالب کے مصداق تھے، فلسفیانہ مضامین معانی کے بادشاہ تھے  
 اور تمام کلام ان کی بلند پروازی و نازک خیالی کا مخزن ہے، فنِ سخن میں غالب نے وہ رنگ  
 اختیار کیا ہے کہ ہمارے ماسذہبن کی ساسی بھی وہاں تک نہیں پہنچی بعض شعر فلسفیانہ  
 رنگ میں اس قدر صاف کہے ہیں جو اپنا جواب نہیں دیتے۔

مرزا دبیر نے بلاغت اور میر تقی نے فصاحت کے ساتھ منظر قدرتِ اہل  
 کی تعریف، گھوٹے کی تعریف، فوجوں کی آمد گرمی کی شدت وغیرہ وغیرہ اس رنگ میں  
 دکھائی ہے جو حق قبول اور فیضِ تاثیر سے لبریز ہے،

محرر نے خیالات کی نیزگی اور تحلیل کی گونا گونی اس پیمانہ پر دکھائی ہے جو اہل قلم کے

دلوں پر نقش ہے،  
امیر مینائی نے مضمون آفرینی، قلبی واردات اور زبان کے وہ نمونے پیش کئے  
ہیں جو ضرب النمل ہیں۔

دلغ اپنے رنگ کے موجود تھے، کلام کی شوخی، طرز بیان کی جدت، خیالات کی  
برجستگی ان کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔  
آزاد و وحالی کا کلام اخلاق و نصائح، دنیا کی بے ثباتی، نیرنگی، زمانہ، انقلابات  
زندگی کا ایک عبرت آموز نمونہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کا کلام سوز و گداز کا مرقع ہے۔  
اکبر الہ آبادی کا کلام قوم و ملک کے لئے ایک دستور العمل ہے، آپ کا  
طرز تغزل ہمہ تن محبت و اخلاق پر مبنی ہے۔

چکبست نے سادہ و سادہ کلام کو بہت صفا کے ساتھ دکھایا ہے آپ کے کلام  
میں حضرت آتش کی جھلک نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر قبال کا کلام علم، ادب، فلسفہ و معانی، اخلاق و تمدن اور تجربے و مشاہدات  
کا اعلیٰ نمونہ ہے،

جلیل باکیوری کا کلام حضرت امیر مینائی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔  
مولانا حسرت موہانی کی نازک خیالی و وسیع النظری، قلبی تاثرات کے ساتھ ساتھ  
رنگ جلاتی ہے جو زبردستی خراج تحسین جمل کرتی ہے۔

مولانا مظہر طباطبائی کی شان تغزل و درتسانت ایک عجیب کیفیت رکھتی ہے۔  
ہمارا جہ سرکش پریشان و حفاشاد نے تصوف و سوز و گداز میں ڈوب کر



جو کچھ کہاہے بہتر کہاہے اور جو ادبی خدمت کی ہے وہ اہل قلم پر روشنی ہے۔  
 کائناتِ ادب میں نیرنگی زمانہ، انقلابات زندگی، دنیا کی بے ثباتی، سچی اور  
 پاک درد انگیز ندامت سچی اور اس کے ساتھ اخلاقی و تمدنی و معاشرتی تعلیم طلباء کے لئے  
 سوئے پر ہماگے کا کام دے گی۔ بڑی جست و تلاش اور سچی ملیں گے ساتھ ساتھ ادب  
 کے لئے بہتر سے بہتر مضامین فراہم کئے گئے ہیں جن سے عموماً طلباء کے اخلاق پر بہت  
 اچھا اثر پڑے گا اور علمِ ادب ان کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے گا۔ خصوصاً وہ طلباء جو  
 پرائیویٹ طور پر امتحان میں شریک ہوتے ہیں کائناتِ ادب ان کے لئے معلمِ ہدایت ہے۔  
 کائناتِ ادب کے دامن پر اگر آپ کو کوئی دھبہ نظر آئے تو یہ محض میری نگاہ ہی  
 ہے، میں انسان ہوں، سہو و لسیاں میری طبیعت کا خمیر ہے۔ اس لئے مودبانہ انتہاس یہ کہ  
 مجھے اپنے مفید مشوروں سے ممنون کیا جائے اور میری لغزش کی پردہ پوشی کی جائے۔

انتم :- حمید

کائنات ادب کا میسر ایشین  
جو ضروری تربیات کے ساتھ شائع کیا گیا ہے  
**فہرست مضامین**  
حصہ نمبر

صفحہ نمبر	مقدمہ	از مولف	صفحہ نمبر	نام مکتوب نگار	صفحہ نمبر	نام مکتوب نگار	صفحہ نمبر
				(۲) مکتوبات (استاذ سابق و حال)			
۱۱ تا ۱۲							
۲۳	۲	امیر بینائی	۱۲	۶	۱۲	۶	۲۳
۲۵	۳	آزاد دہلوی	۱۳	۱۰	۱۳	۱۰	۲۵
۲۶	۴	مولانا ذکار اللہ	۱۴	۱۲	۱۴	۱۲	۲۶
۲۷	۵	نذیر احمد خاں دہلوی	۱۵	۱۳	۱۵	۱۳	۲۷
۲۸	۶	اکبر الہ آبادی	۱۶	۱۴	۱۶	۱۴	۲۸
۲۹	۷	شبلی نعمانی	۱۷	۱۵	۱۷	۱۵	۲۹
۳۰	۸	ارشاد تھانوی	۱۸	۱۶	۱۸	۱۶	۳۰
۳۱	۹	ابوالکلام آزاد	۱۹	۱۷	۱۹	۱۷	۳۱
۳۲	۱۰	جلیل بیک پوری	۲۰	۱۸	۲۰	۱۸	۳۲
۳۳	۱۱	حالی	۲۱	۱۹	۲۱	۱۹	۳۳
۳۴			۲۲	۲۰	۲۲	۲۰	۳۴
۳۵			۲۳	۲۱	۲۳	۲۱	۳۵
۳۶			۲۴	۲۲	۲۴	۲۲	۳۶
۳۷			۲۵	۲۳	۲۵	۲۳	۳۷
۳۸			۲۶	۲۴	۲۶	۲۴	۳۸
۳۹			۲۷	۲۵	۲۷	۲۵	۳۹
۴۰			۲۸	۲۶	۲۸	۲۶	۴۰
۴۱			۲۹	۲۷	۲۹	۲۷	۴۱
۴۲			۳۰	۲۸	۳۰	۲۸	۴۲
۴۳			۳۱	۲۹	۳۱	۲۹	۴۳
۴۴			۳۲	۳۰	۳۲	۳۰	۴۴
۴۵			۳۳	۳۱	۳۳	۳۱	۴۵
۴۶			۳۴	۳۲	۳۴	۳۲	۴۶
۴۷			۳۵	۳۳	۳۵	۳۳	۴۷
۴۸			۳۶	۳۴	۳۶	۳۴	۴۸
۴۹			۳۷	۳۵	۳۷	۳۵	۴۹
۵۰			۳۸	۳۶	۳۸	۳۶	۵۰
۵۱			۳۹	۳۷	۳۹	۳۷	۵۱
۵۲			۴۰	۳۸	۴۰	۳۸	۵۲
۵۳			۴۱	۳۹	۴۱	۳۹	۵۳
۵۴			۴۲	۴۰	۴۲	۴۰	۵۴
۵۵			۴۳	۴۱	۴۳	۴۱	۵۵
۵۶			۴۴	۴۲	۴۴	۴۲	۵۶
۵۷			۴۵	۴۳	۴۵	۴۳	۵۷
۵۸			۴۶	۴۴	۴۶	۴۴	۵۸
۵۹			۴۷	۴۵	۴۷	۴۵	۵۹
۶۰			۴۸	۴۶	۴۸	۴۶	۶۰
۶۱			۴۹	۴۷	۴۹	۴۷	۶۱
۶۲			۵۰	۴۸	۵۰	۴۸	۶۲
۶۳			۵۱	۴۹	۵۱	۴۹	۶۳
۶۴			۵۲	۵۰	۵۲	۵۰	۶۴
۶۵			۵۳	۵۱	۵۳	۵۱	۶۵
۶۶			۵۴	۵۲	۵۴	۵۲	۶۶
۶۷			۵۵	۵۳	۵۵	۵۳	۶۷
۶۸			۵۶	۵۴	۵۶	۵۴	۶۸
۶۹			۵۷	۵۵	۵۷	۵۵	۶۹
۷۰			۵۸	۵۶	۵۸	۵۶	۷۰
۷۱			۵۹	۵۷	۵۹	۵۷	۷۱
۷۲			۶۰	۵۸	۶۰	۵۸	۷۲
۷۳			۶۱	۵۹	۶۱	۵۹	۷۳
۷۴			۶۲	۶۰	۶۲	۶۰	۷۴
۷۵			۶۳	۶۱	۶۳	۶۱	۷۵
۷۶			۶۴	۶۲	۶۴	۶۲	۷۶
۷۷			۶۵	۶۳	۶۵	۶۳	۷۷
۷۸			۶۶	۶۴	۶۶	۶۴	۷۸
۷۹			۶۷	۶۵	۶۷	۶۵	۷۹
۸۰			۶۸	۶۶	۶۸	۶۶	۸۰
۸۱			۶۹	۶۷	۶۹	۶۷	۸۱
۸۲			۷۰	۶۸	۷۰	۶۸	۸۲
۸۳			۷۱	۶۹	۷۱	۶۹	۸۳
۸۴			۷۲	۷۰	۷۲	۷۰	۸۴
۸۵			۷۳	۷۱	۷۳	۷۱	۸۵
۸۶			۷۴	۷۲	۷۴	۷۲	۸۶
۸۷			۷۵	۷۳	۷۵	۷۳	۸۷
۸۸			۷۶	۷۴	۷۶	۷۴	۸۸
۸۹			۷۷	۷۵	۷۷	۷۵	۸۹
۹۰			۷۸	۷۶	۷۸	۷۶	۹۰
۹۱			۷۹	۷۷	۷۹	۷۷	۹۱
۹۲			۸۰	۷۸	۸۰	۷۸	۹۲
۹۳			۸۱	۷۹	۸۱	۷۹	۹۳
۹۴			۸۲	۸۰	۸۲	۸۰	۹۴
۹۵			۸۳	۸۱	۸۳	۸۱	۹۵
۹۶			۸۴	۸۲	۸۴	۸۲	۹۶
۹۷			۸۵	۸۳	۸۵	۸۳	۹۷
۹۸			۸۶	۸۴	۸۶	۸۴	۹۸
۹۹			۸۷	۸۵	۸۷	۸۵	۹۹
۱۰۰			۸۸	۸۶	۸۸	۸۶	۱۰۰
۱۰۱			۸۹	۸۷	۸۹	۸۷	۱۰۱
۱۰۲			۹۰	۸۸	۹۰	۸۸	۱۰۲
۱۰۳			۹۱	۸۹	۹۱	۸۹	۱۰۳
۱۰۴			۹۲	۹۰	۹۲	۹۰	۱۰۴
۱۰۵			۹۳	۹۱	۹۳	۹۱	۱۰۵
۱۰۶			۹۴	۹۲	۹۴	۹۲	۱۰۶
۱۰۷			۹۵	۹۳	۹۵	۹۳	۱۰۷
۱۰۸			۹۶	۹۴	۹۶	۹۴	۱۰۸
۱۰۹			۹۷	۹۵	۹۷	۹۵	۱۰۹
۱۱۰			۹۸	۹۶	۹۸	۹۶	۱۱۰
۱۱۱			۹۹	۹۷	۹۹	۹۷	۱۱۱
۱۱۲			۱۰۰	۹۸	۱۰۰	۹۸	۱۱۲
۱۱۳			۱۰۱	۹۹	۱۰۱	۹۹	۱۱۳
۱۱۴			۱۰۲	۱۰۰	۱۰۲	۱۰۰	۱۱۴
۱۱۵			۱۰۳	۱۰۱	۱۰۳	۱۰۱	۱۱۵
۱۱۶			۱۰۴	۱۰۲	۱۰۴	۱۰۲	۱۱۶
۱۱۷			۱۰۵	۱۰۳	۱۰۵	۱۰۳	۱۱۷
۱۱۸			۱۰۶	۱۰۴	۱۰۶	۱۰۴	۱۱۸
۱۱۹			۱۰۷	۱۰۵	۱۰۷	۱۰۵	۱۱۹
۱۲۰			۱۰۸	۱۰۶	۱۰۸	۱۰۶	۱۲۰
۱۲۱			۱۰۹	۱۰۷	۱۰۹	۱۰۷	۱۲۱
۱۲۲			۱۱۰	۱۰۸	۱۱۰	۱۰۸	۱۲۲
۱۲۳			۱۱۱	۱۰۹	۱۱۱	۱۰۹	۱۲۳
۱۲۴			۱۱۲	۱۱۰	۱۱۲	۱۱۰	۱۲۴
۱۲۵			۱۱۳	۱۱۱	۱۱۳	۱۱۱	۱۲۵
۱۲۶			۱۱۴	۱۱۲	۱۱۴	۱۱۲	۱۲۶
۱۲۷			۱۱۵	۱۱۳	۱۱۵	۱۱۳	۱۲۷
۱۲۸			۱۱۶	۱۱۴	۱۱۶	۱۱۴	۱۲۸
۱۲۹			۱۱۷	۱۱۵	۱۱۷	۱۱۵	۱۲۹
۱۳۰			۱۱۸	۱۱۶	۱۱۸	۱۱۶	۱۳۰
۱۳۱			۱۱۹	۱۱۷	۱۱۹	۱۱۷	۱۳۱
۱۳۲			۱۲۰	۱۱۸	۱۲۰	۱۱۸	۱۳۲
۱۳۳			۱۲۱	۱۱۹	۱۲۱	۱۱۹	۱۳۳
۱۳۴			۱۲۲	۱۲۰	۱۲۲	۱۲۰	۱۳۴
۱۳۵			۱۲۳	۱۲۱	۱۲۳	۱۲۱	۱۳۵
۱۳۶			۱۲۴	۱۲۲	۱۲۴	۱۲۲	۱۳۶
۱۳۷			۱۲۵	۱۲۳	۱۲۵	۱۲۳	۱۳۷
۱۳۸			۱۲۶	۱۲۴	۱۲۶	۱۲۴	۱۳۸
۱۳۹			۱۲۷	۱۲۵	۱۲۷	۱۲۵	۱۳۹
۱۴۰			۱۲۸	۱۲۶	۱۲۸	۱۲۶	۱۴۰
۱۴۱			۱۲۹	۱۲۷	۱۲۹	۱۲۷	۱۴۱
۱۴۲			۱۳۰	۱۲۸	۱۳۰	۱۲۸	۱۴۲
۱۴۳			۱۳۱	۱۲۹	۱۳۱	۱۲۹	۱۴۳
۱۴۴			۱۳۲	۱۳۰	۱۳۲	۱۳۰	۱۴۴
۱۴۵			۱۳۳	۱۳۱	۱۳۳	۱۳۱	۱۴۵
۱۴۶			۱۳۴	۱۳۲	۱۳۴	۱۳۲	۱۴۶
۱۴۷			۱۳۵	۱۳۳	۱۳۵	۱۳۳	۱۴۷
۱۴۸			۱۳۶	۱۳۴	۱۳۶	۱۳۴	۱۴۸
۱۴۹			۱۳۷	۱۳۵	۱۳۷	۱۳۵	۱۴۹
۱۵۰			۱۳۸	۱۳۶	۱۳۸	۱۳۶	۱۵۰
۱۵۱			۱۳۹	۱۳۷	۱۳۹	۱۳۷	۱۵۱
۱۵۲			۱۴۰	۱۳۸	۱۴۰	۱۳۸	۱۵۲
۱۵۳			۱۴۱	۱۳۹	۱۴۱	۱۳۹	۱۵۳
۱۵۴			۱۴۲	۱۴۰	۱۴۲	۱۴۰	۱۵۴
۱۵۵			۱۴۳	۱۴۱	۱۴۳	۱۴۱	۱۵۵
۱۵۶			۱۴۴	۱۴۲	۱۴۴	۱۴۲	۱۵۶
۱۵۷			۱۴۵	۱۴۳	۱۴۵	۱۴۳	۱۵۷
۱۵۸			۱۴۶	۱۴۴	۱۴۶	۱۴۴	۱۵۸
۱۵۹			۱۴۷	۱۴۵	۱۴۷	۱۴۵	۱۵۹
۱۶۰			۱۴۸	۱۴۶	۱۴۸	۱۴۶	۱۶۰
۱۶۱			۱۴۹	۱۴۷	۱۴۹	۱۴۷	۱۶۱
۱۶۲			۱۵۰	۱۴۸	۱۵۰	۱۴۸	۱۶۲
۱۶۳			۱۵۱	۱۴۹	۱۵۱	۱۴۹	۱۶۳
۱۶۴			۱۵۲	۱۵۰	۱۵۲	۱۵۰	۱۶۴
۱۶۵			۱۵۳	۱۵۱	۱۵۳	۱۵۱	۱۶۵
۱۶۶			۱۵۴	۱۵۲	۱۵۴	۱۵۲	۱۶۶
۱۶۷			۱۵۵	۱۵۳	۱۵۵	۱۵۳	۱۶۷
۱۶۸			۱۵۶	۱۵۴	۱۵۶	۱۵۴	۱۶۸
۱۶۹			۱۵۷	۱۵۵	۱۵۷	۱۵۵	۱۶۹
۱۷۰			۱۵۸	۱۵۶	۱۵۸	۱۵۶	۱۷۰
۱۷۱			۱۵۹	۱۵۷	۱۵۹	۱۵۷	۱۷۱
۱۷۲			۱۶۰	۱۵۸	۱۶۰	۱۵۸	۱۷۲
۱۷۳			۱۶۱	۱۵۹	۱۶۱	۱۵۹	۱۷۳
۱۷۴			۱۶۲	۱۶۰	۱۶۲	۱۶۰	۱۷۴
۱۷۵			۱۶۳	۱۶۱	۱۶۳	۱۶۱	۱۷۵
۱۷۶			۱۶۴	۱۶۲	۱۶۴	۱۶۲	۱۷۶
۱۷۷			۱۶۵	۱۶۳	۱۶۵	۱۶۳	۱۷۷
۱۷۸			۱۶۶	۱۶۴	۱۶۶	۱۶۴	۱۷۸
۱۷۹			۱۶۷	۱۶۵	۱۶۷	۱۶۵	۱۷۹
۱۸۰			۱۶۸	۱۶۶	۱۶۸	۱۶۶	۱۸۰
۱۸۱			۱۶۹	۱۶۷	۱۶۹	۱۶۷	۱۸۱
۱۸۲			۱۷۰	۱۶۸	۱۷۰	۱۶۸	۱۸۲
۱۸۳			۱۷۱	۱۶۹	۱۷۱	۱۶۹	۱۸۳
۱۸۴			۱۷۲	۱۷۰	۱۷۲	۱۷۰	۱۸۴
۱۸۵			۱۷۳	۱۷۱	۱۷۳	۱۷۱	۱۸۵
۱۸۶</							

نمبر	عنوان مضامین	نام مصنف	نمبر
۲۳	سوانح شین یا تہذیب	آپریس ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر	۶۵
۲۴	زبان گوہا	شمس العلما مولانا خواجہ لطافت حسین حالی	۷۰
۲۵	کارخانہ قدرت	شمس العلما مولانا حافظ نذیر احمد	۷۳
۲۶	میرنہ کی شاعری کے خصوصیات (امروزانہ)	شمس العلما مولانا شبلی نعمانی	۷۸
۲۷	فرہنگ انگریزی لفاظ	شمس العلما خان بہادر مولوی دکانہ	۸۷
۲۸	اردو کا ہندوؤں سے تعلق	مولانا عبدالحکیم شہر عباسی	۹۷
۲۹	وسعت خیال	مولانا سید احمد حسن شوکت	۱۱۰
۳۰	سفر نامہ از کراچی تا بغداد	سید سجاد حمید ریلویم	۱۱۴
۳۱	فروع ادب	خان بہادر سر شیخ عبدالقادر کے سی۔ آئی۔ ای۔ ایم۔ اے۔	۱۲۵
۳۲	حضرت داغ و حضرت امیر مینائی	مولانا شعیب احمد ندرت	۱۳۹

### (۴) حصہ مطبوعہ

نمبر	عنوان مضامین	نمبر	عنوان مضامین	نمبر
۳۳	مرزا محمد رفیع سودا	۳۶	سید انشا اللہ خاں انشا	۱۶۳
	تثیب قصیدہ (۱)	۱۵۰	غزلیات	
	تثیب قصیدہ (۲)	۱۵۱	شیخ غلام ہمدانی مصحفی	
	تثیب قصیدہ بہاریہ (۳)	۱۵۲	غزلیات	۱۶۸
	غزلیات	۱۵۳	شیخ امام بخش ناسخ	
۳۴	میر محمد علی میر		غزلیات	۱۷۱
	غزلیات	۱۵۵	خاقانی ہند شیخ ابراہیم دوق	
۳۵	خواجہ میر درد	۱۵۹	تصیدہ	۱۷۵
	غزلیات		غزلیات	۱۷۸

ردیف	عنوان مضامین	ردیف	عنوان مضامین	ردیف
۲۰۱	میر مہدی حسین مجروح	۱۸۱	نشیب قصیدہ	۲۰۱
۲۰۲	نشیب قصیدہ (۱)	۱۸۲	معذرت	۲۰۲
"	نشیب قصیدہ (۲)	"	تغلی	"
"	غزلیات	۱۸۳	غزلیات	۲۰۳
۲۰۳	مشتی امیر احمد امیر منیائی	۱۸۴	مرزا سلامت علی دبیر	۲۰۴
۲۰۴	غزلیات	۱۸۵	رباعیات	۲۰۵
۲۰۵	قصیدہ الملک ابی اتحاد	۱۸۶	صبح کا سماں	۲۰۶
۲۱۰	غزلیات	۱۸۷	دات کا سماں	۲۱۰
۲۱۱	شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد	۱۸۸	گرمی کا سماں	۲۱۱
۲۱۵	معرفت الہی	۱۸۹	گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت	۲۱۵
۲۱۶	آلو العزیز کے لئے کہی گئی شہ سدرہ نہیں	۱۹۰	فوجوں کی اتہری اور ہل چل	۲۱۶
۲۱۷	شمس العلماء مولانا جعفر علی خاں	۱۹۱	تلوار کی تعریف	۲۱۷
۲۱۹	رباعیات	۱۹۲	تلوار کی کھاٹ	۲۱۹
۲۲۰	دولت اور وقت کا مناظرہ	۱۹۳	برزمیہ	۲۲۰
۲۲۳	غزلیات	"	گھڑے کی تعریف	"
۲۲۴	شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی	۱۹۴	میر بربہ علی انیس	۲۲۳
۲۲۵	غزل	۱۹۵	رباعیات	۲۲۴
۲۲۶	لسان العصر خان در سید	۱۹۶	سراپا	۲۲۵
۲۲۷	اکبر حسین اکبر رضوی	۱۹۷	تلوار کی تعریف	۲۲۶
۲۲۸	رباعیات	۱۹۸		۲۲۷
۲۳۰	غزلیات			۲۳۰

ردیف	عنوان مضامین	ردیف	عنوان مضامین	ردیف
۲۵۰	پیغام آقبال خلیل القدر حافظ جلیل خلیل حسن جلیل	۲۳۵	پندت برنج نرین جلالت	۵۰
۲۵۱	حد	۲۳۶	جلوه صبح	
"	غزلیات	۲۴۰	بهارستان کشمیر	
"	غزلیات	۲۴۲	سیر زبیرہ دون	
۲۵۳	مونا سید فضل حسن حسرت ہانی	۲۴۳	مذہب	
"	حد	۲۴۴	قوم کے سوراؤں کو الوداع	
"	غزلیات	۲۴۶	خاک ہند	
۲۵۸	مونا سید علی حید نظم طباطبائی	۲۴۸	قومی ترانہ	
"	غزلیات	۲۴۸	غزلیات	
۲۶۰	سین السلطنت مبارکہ	۲۴۹	ڈاکٹر سر محمد قبال ایم اے	۵۱
	سرسین پر شاد شاد	۲۵۰	پنی ایچ ڈی بار ایٹ لا	
	غزلیات		ستارہ	
(۵) سوانح حیات				
ابن قلم کی سوانح عمریاں اور ان کی خصوصیات کمالات پر ایک نظر				
ردیف	نام	ردیف	نام	ردیف
۲۶۴	شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد	۲۶۴	شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد	۵۶
۲۶۵	شمس العلما خان دور مولوی ذکا اللہ	۲۶۵	آزہ بیل ڈاکٹر سر سید احمد خاں	۵۷
۲۶۶	مولانا عبدالحلیم شہر عباسی	۲۶۶	شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی	۵۸
۲۶۷	مولانا سید احمد حسن شوکت	۲۶۷	شمس العلما مولانا حافظ نذیر احمد	۵۹

ردیف	نام	تاریخ	تاریخ
۶۴	سید سجاد حسینی پلدم	۲۸۵	۸۱
۶۵	خان درویش شیخ عبدالقادر کے سی آئی ای	۲۸۸	۸۲
۶۶	مولانا شعیب احمد ندرت	۲۹۱	۸۳
۶۷	مرزا محمد رفیع سودا	۲۹۳	۸۴
۶۸	میر محمد تقی تیسر	۲۹۶	۸۵
۶۹	خواجہ میر درد	۲۹۹	
۷۰	سید انصار اللہ خاں انصار	۳۰۰	
۷۱	شیخ غلام جہادی مصطفیٰ	۳۰۲	
۷۲	شیخ امام بخش ناسخ	۳۰۴	۸۶
۷۳	خاٹائی ہند شیخ ابراہیم ذوق	۳۰۶	۸۷
۷۴	نجم الدولہ دبیر الملک زاد اسد اللہ خاں	۳۰۹	۸۸
۷۵	مرزا سلامت علی دبیر	۳۱۲	۸۹
۷۶	میر برب علی انیس	۳۱۳	۹۰
۷۷	میر محمد حسین مجروح	۳۱۷	۹۱
۷۸	منشی امیر احمد امیر مینائی	۳۱۹	۹۲
۷۹	فصیح الملک امیر ذاقاں دلغ	۳۲۲	۹۳
۸۰	سان الصرافان در کبر حنین اکبر رضوی	۳۲۶	۹۴
۳۲۸	پندت برج نراکن جلیبت		
۳۳۰	ڈاکٹر محمد اقبال		
۳۳۳	جلیل القدر حافظ جلیل حسن جلیل		
۳۳۴	مولانا سید فضل حسن حسرت مولائی		
۳۳۵	سلطنت ہمارا جہ سرکش پرشاد شاہ		
تعارف			
۳۳۶	مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی		
"	منشی رشید احمد شہید تھانوی		
"	مولوی سخی علی صاحب کاکوروی		
"	شاہ نظام الدین صاحب دلگیر		
"	سید ریاض احمد صابریا ضحیر آبادی		
۳۳۷	منشی سلطان احمد		
"	مولانا سید علی حیدر نظم بطاطائی لکھنوی		
"	مولوی شیخ احمد علی شوق		
"	منظر علی اسیر		







ہندوستان کے مشہور شاہ پڑازوں  
اور محققین اساتذہ سخن کے دلچسپ اور  
نُرا معلومات مکتوبات  
حضرت امیر احمد صاحب امیر مینائی کا خط  
مولوی منظر الاسلام صاحب کے نام

۲ فروری سنہ ۱۹۷۰ء

گرامی شان اقبال نشان محبی مولوی منظر الاسلام صاحب سلم اللہ الوداع۔  
سلام سنوں اخلاص و غار مشوں، رشد و سعادت خیر تحریریں آپ کی کئی آئیں اور  
سیری طرے جو اب میں ناخیر ہوئی وجہ تفسیر زیادہ تہ یہ کہ رسالہ عروض و قافیہ کی اصلاح  
بسیب کفر صستی ناطاتی و رجوری و معذرتی کے نہ ہو سکی آپ کی محنت پر نظر کے یہ جی  
نہیں چاہتا کہ بے اصلاح بھیجوں اس لئے کہ ایسا جامع مسائل رسالہ غیر تہذیب مصلح کے  
پیشکش دربار آصفیہ ہونا مناسب نہیں۔ اسی وجہ سے اب بھی یہی ارادہ ہے کہ ایک نظر دیکھ جاؤ۔

تو بھجوں اور دو قصیدے جو آپ نے بھیجے تھے اُن پر سرسری نظر میں نے کی تھی وہ بہت اصلاح کے محتاج ہیں میرے پیشی کے منشی حافظ جلیل سکریٹری دفتر امیر اللغات رخصت لے کر وطن کے ہیں وہ قصیدے اُن کے پاس تھے اُن کی غیبت میں مل نہیں سکتے وہ آئیں تو بھلا کر دیکھوں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ اگر اُس بابر میں کرنا تو بہت جی لگا کر شگفتہ قافیوں میں کوئی قصیدہ کیا اور بہت سے شعر کمر چھانٹ لیجئے۔ یہ قصیدے جو آپ نے بھیجے ہیں بہت ہی دیکھے ہیں عذویت ان میں بالکل نہیں۔ اعلیٰ حضرت نظام عالی مقام خلد اللہ ملکہ ہو سخن شام و سخن فہم و سخن گو اور سخن آفریں ہیں۔ اُن کے دربار کے لئے مختصر ہی کلام سہی مگر بہت اچھا ہونا چاہئے۔ فصیح المملک فی غم شاعر شیریں زباں وہاں موجود ہے ایسے دیسے کلام پر وہاں اُمید قبولیت نہیں یہ بات میں نے فرط محبت سے دوستانہ لکھی ہے برا نہ مانئے گا۔ دیوان ناظم کی تاریخ بے شک میں نے جلال کی فرمائش سے کہی اور کتے وقت مجھے بالکل یاد نہ آیا کہ اسی دیوان کے واسطے آپ نے فرمائش کی ورنہ آپ ہی کو بھیجتا۔ تقریباً جو آپ نے اُن کے دیوان کی لکھی ہے وہ میری اصلاح سے مستغنی ہے۔ مجھے نثر میں مزاوت نہیں اور تاریخ جو آپ نے کہی ہے اُس میں لفظ بلند مکان محض بضرورت تاریخ ہے۔ دیوان کی تاریخ میں شاعر کی صفت ابن خیال چاہئے نہ بلند مکان۔ اور بایں ہمتہ تکلف بھی بہ اعتبار اعداد تاریخ پوری نہیں کہ ستر سال سے ایک عدد کا تمیہ کیا گیا۔ تقریباً ہوتا تاریخ غرض تو اس سے بھی ہی ہوتی ہے کہ اہل سخن پسند کریں اور اگر بھرتی ہوئی تو اس ہونے سے نہ ہونا اچھا۔ میرے تلامذہ سب اپنے اپنے حال میں پریشان ہیں مجھے اُمید نہیں کہ تلامذہ کچھ حقیقت حال سے میں نے آپ کو اطلاع دے دی میں آپ کا خالص دوست اور ہی خواہ ہوں ہمیشہ

مجھ کو اپنا داعی خیر تصور کیجئے۔ آپ کی زیر باری اور ناداری سے بہت دل دکھتا ہے مگر سوا  
 دھلکے چارہ کیا ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کے حال پر بھی رحم فرمائے میں بھی کثرتِ آلام و وحالت  
 اور استقامِ جسمانی سے نہایت سسرلہ سمہ ہو رہا ہوں۔ جن کی تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ وہ ان میں  
 آپ کے نام بھی روا نہ ہوا تھا۔ معلوم نہیں کہاں لطف ہو گیا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ کے پاس نہ بھیجا  
 جاتا۔ آخر تسلیم گزار ہیں اس زمانے میں ایسے قومی موقع پیش آئے کہ دامن میں بسند ہو گیا۔  
 اس کے متمم کمال منفعیل و غدر خواہ میں اور سب اطفال احباب واجب گزار ہیں۔ فقط

فقیر امیر احمد امیر سب سنائی

## فصیح الملک لکھنؤ کے ناخالص دہلوی کے نام

بندہ نواز سلام نیاز

ایک تحریر آپ کی تحریر کے جواب میں بھیج چکا ہوں امید ہے کہ اس کا جواب آتا ہو گا۔ آج  
 حمید آپ کا ملازم قدیم میرے پاس آیا مجھے اس کے دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آ گیا جب آپ  
 یہاں تھے اور اس یاد کی لذت میں میں نے اسے گلے لگایا۔ اور اس کی آنکھوں کو اجھڑ سے وہ دس  
 بارہ دن پشیر آپ کے جواں جواں آکر دیکھا کرتا تھا میں یہ تک حسرت کی نگاہ سے دیکھا کیا اور بار بار  
 آپ کے حالات و ضبط و اوقات کی کیفیات پوچھا اور سنا کیا اثنائے سخن میں معلوم ہوا کہ آپ کے  
 داماد جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں ہے انھوں نے قضا کی۔ ان کی جواں مرگی اور اس نوع و حشر  
 نیک اختر کی بیوی کے مدد سے میرے دل کو چور کر دیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ  
 کے سوا اس داغ کا کوئی مرہم نہیں اس لئے آج وہ نہیں گل ہم نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو  
 اور اس بیوہ اور سب اہل عاقب کو صبر و جزائے صبر عنایت فرمائے اور اس وقت کیا لکھوں۔

بارگاہِ ارحم الراحمین میں رحم کی التجا کرتا ہوں اپنے اور آپ کے اور سب غیروں دوستوں  
 کے واسطے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ اُس کی رحمت سے امید ہے کہ بگڑے کام دین دنیا کے  
 سب بن جائیں۔ پیائے داغ! انہیں کہ میں نے حمید سے کوئی ساعت آپ کی خدائی  
 طرف شوق کی نہ سنی ہیں نے حدیث میں دیکھا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کے سر کی سائے  
 فی ساعت ایک خنسلے کے برابر ہو سکتا ہے۔ پس کی جائیں گی ان کی ساعتیں کہ نہ تو وہ دیکھتے  
 والا گناہوں انوار سے برتر نہ دیکھ گا۔ ایسا خوش ہو گا کہ اگر اس نے کوئی چیزوں پر تقسیم  
 کرے تو دوزخی عذاب ناسے بے خبر ہو جائیں۔ پھر دوسرے خزانے کا دروازہ  
 کھلے گا اس میں ایسی عظمت اور غنوت ہوگی کہ اُس کو اُس سے سخت نفرت ہوگی اور  
 ایسا غم ہو گا کہ اگر اس غم کو اہل جنت پر تقسیم کرے تو جنتی لوگ دوزخیوں کی طرح پر  
 ہانپنے لگیں۔ پھر ایک تیسرا دروازہ تیسری ساعت عمر کا کھلے گا وہ بالکل خالی ہو گا نہ اس  
 میں نور ہو گا نہ ظلمت نہ خوشبو ہوگی نہ غنوت اس کو دیکھ کر اسے نہایت حسرت ہوگی۔ الغرض  
 اس حدیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کی دولت عمر ہے اور عمر کی ہر ساعت اک آنہ ساعت  
 طاعت و عبادت و خزانہ ہے جس میں انوار نظر آئے اور ساعت مصیبت و خزانہ ہے جس میں  
 ظلمت اور غنوت کا ذکر ہوا۔ اور جو ساعت عمر طاعت و مصیبت دونوں سے خالی تھی اُس کا  
 خزانہ خالی دیکھا گیا۔ جس کے اگلا ہونے کی حسرت ہمیشہ رہے گی۔ اسے میرے اللہ مجھے واضح  
 بے سنی کہ جو خود نصیحت ہو اور دل کو نصیحت کر رہا ہے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے  
 مرضیات میں کوشش کی توفیق ہے اور میرے سب غیروں دوستوں کی عمروں کا  
 خزانہ کبھی اپنے انوار رحمت سے بھرے آئین۔ پیائے داغ میرے لکھے کا برا نہ مانا خوشامد  
 کرنے والے تمھارے سیکڑوں میں ملامت کرنے والوں میں ایک مجھی کو پہنچے دو۔ میرا

خطاب تہا ہی طرف ہی مگر حقیقت اپنے نفس کو ملاست کرتا ہوں بڑھاپے میں کچھ منع حقیقی کی تعین  
کا شکر ضرور کرنا چاہئے خلق کے حق میں بھلائی کرنا بڑا عمدہ شکر ہی۔ اس سے بھی علم ازبان  
دل کبھی نہ اڑے۔ فرزند ان فقیر اور جلد عزیزان و احباب تسلیم کر لیا ہیں۔ فقط  
امیر فقیر، یکم اگست ۱۳۱۵ء

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آداب دہلوی صاحب

شمس العلماء خان دہلوی فرما کا اللہ صاحب کے نام

منشی میاں اکل صبح کو میں بموجب معمول کے ہوا کھانے نکلا۔ شہر کے باہر چپا تو دیکھتا  
ہوں کہ ایک مرد مقدس متقی و منع۔ پرہیزگار صورت جتہ پہنے ہیں۔ جا جیاں عربت عامہ  
سر پہ ہزار دانہ کی لسیج ہاتھ میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے کو  
سفید و ارچی کے نور سے روشن کیا تھا۔ جتہ کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر  
ہیں مگر عصا کتنا تھا کہ حضرت موسیٰ بھی ہیں۔ چونکہ بزرگوں کا ادب سیری طبیعت میں  
خدا داد ہے میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے میرا  
سلام لیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی باوقار آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں ان سے  
محبت و شفقت پکیتی ہے۔ بے اختیار آگے بڑھا اور مصافحہ کر کے ہاتھوں کو بوسہ دیا  
چونکہ صبح کے وقت انوارِ الہی کا جلوہ پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے ان کی صورت اور لباس نے  
دل پر اثر کیا اپنی براہِ عالمی اور دنیا کی سیہ کاری کا خیال کر کے ان سے عرض کی کہ مجھ و میرا کو

کچھ نصیحت فرادیں جو میرے کام آئے۔

سکر لئے اور اس طرح میری طرف دیکھا کہ میرے دل اور جان کو اپنا مقصد بنا لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم تمہارے حسن عقیدت سے بہت خوش ہوئے وہ آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے اور میں نصف قدم اُن سے پیچھے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا چند لمحہ میں نے تال کیا کیونکہ اُن کی متانت اور وقار مجھے زیادہ بولنے کی اجازت نہ دیتے تھے آخر پھر ہاتھ باندھ کر سوال کی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھا آنکھوں نے فرمایا کہ قلم و دوات تمہارے پاس ہے؟ عرض کی کہ نہیں۔ مگر جو کچھ آپ فرمائیں گے بندہ صفحہ دل پر نقش کرتا جائے گا۔ پھر سکر لئے اور فرمایا کہ اہل دنیا بے وقوف ناپ ہیں ہم نہ کسی کو اپنا دیدار دیتے ہیں اور نہ کسی سے بات کرتے ہیں مگر اس وقت یہ حسن عقیدت تمہارا ہیں پسند آیا اس لئے چند فقرے جن سے بہت سی کتابوں کا بلکہ ہزاروں کتب خانوں کا عطر کھنچا ہوا ہے تمہارے سپرد کرتے ہیں انہیں نااہلوں سے بچانا اور اپنا دستور العمل بنانا کہ یہ ہمارے اسرار ہیں میں نے پھر جھک کر سلام کیا اور آنکھیں بند کر کے اشارہ کیا یعنی بسر و چشم منظور۔ انہوں نے کہا کہ :-

(۱) یاد رکھو کہ دنیا میں دوست تو کوئی ہے ہی نہیں جو زیادہ دوستی برتے ایسی کو دشمن سمجھنا۔

(۲) دشمن سے ایسی دل فریب محبت برتو کہ دوستوں کی دوستی نابود ہو جائے آدمی ہو تو اُن تو بن جائے۔ پھر اگر پورا سلیقہ ہو تو پتھر سے بند کر کے پر قینچ کوڑ نہیں تو مطلب نکالو اور چھوڑ دو۔

(۳) محبت کو نیکیوں کی نیکی پر منحصر نہ رکھو نہ اسے اُن کی نیکی کی مقدار پر

خرچ کرو تم اپنا مطلب دیکھتے رہو جس سے بھگتا ہو اس کو گدھا بناؤ اور  
جھنٹ سوار ہو جاؤ۔

(۴) اس میں پہلے یہ اعتقاد رکھو کہ دنیا میں اچھا تو کوئی نہیں یہ ہم صورت جو آدمیوں  
کے جامہ میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔۔۔

آزاد

## شمس العلماء خان ہانڈشی کا رستہ ضامروم کا خط

جناب سید حسن نظامی صفا نے اپنے جد امجد سلطان نظام الدین علیہ الرحمۃ کے کشف نکراتا  
و خرق عادات و محاسن اخلاق میں کسی بات کو فرو گزاشت نہ کیا ہو گا کہ جس کی تحسین پر  
کا فخر میں جامل کروں مگر ہاں میں حضرت کی سب سے بڑھی کرامت یہ بیاں کرتا ہوں کہ  
ان کو اپنے ساتھ ان لوگوں کے گردیدہ کر لینے کا ایسا ملکہ خدا داد تھا کہ اپنی حیات  
میں بے حساب آدمیوں کو اپنا مرید و ملحق بنایا اور بعد وفات جس پر چھ سو سال کا  
عرصہ گزر چکا ہے وہی کرامت ان کے مزار میں موجود ہے کہ وہ مسلمانوں ہی کے دلوں کو  
گردیدہ نہیں بناتا بلکہ غیر مسلمانوں کے دلوں کو اپنا شیفتہ و دار کرتا ہے۔

چنانچہ مسٹر لارک صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی جب مزار شریف پر شریف لاسے تو ان  
کے دل پر مزار شریف کا یہ اثر ہوا کہ اس کی چھت کو شکستہ و فرسودہ دیکھ کر  
انہوں نے اپنی گروہ سے تین ہزار روپیہ خرچ کر کے ایسا ہی بنوادیجیسا کہ پہلے

بنا ہوا تھا اور خادموں کو منگ کر دیا کہ وہ ہمارا نام نہ لیں کہ ہم نے اس کو بنوایا ہے۔  
جب سے انگریزی عہداری ہندوستان میں آئی کوئی مثال ایسی نہیں کہ  
کسی حاکم انگریزی نے کسی ولی اللہ کے مزار کی مرمت اپنے پاس سے خرچ کر کے  
کرائی ہوئے یہ حضرت سلطان حج اہی کی کرامت یادگار، وزگار رہے گی کہ انھوں  
نے عیسائی عالم رست سے اپنے مزار مقدس کی مرمت کرائی۔

و کا اللہ

۲۲ مئی ۱۹۰۶ء

## شمس العلماء مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی کا خط

مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے نام

میاں بشیر !

جس وقت سے میں آیا تھا تھا اسباب جمع کرنے کی فکر میں تھا چنانچہ اس وقت  
اسباب صندوق میں بند کر کے اوپر سے ٹاٹ مرطہ کر بکتر روانہ کرتا ہوں وہاں سے  
ریل پر روانہ ہو جائے گا۔ اس ایک صندوق میں اتنی کتابیں ہیں اگر آدمی نظر تحقیق سے  
اُن پر عبور حاصل کر لے تو عالم ہو جائے مگر دکھ چھوڑنے کی کتاب اور پتھر برباد ہے

بشیر الدین احمد دہلوی صاحب کے بیٹے کا نام ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب کی بھی کئی ایک تصانیف ہیں ۱۲

۱۲ ایک شہر اور دیوبند اسٹیشن صوبہ ہمارا ڈیرہ سرین ہے ۱۲



مقدم جماعت کی پڑھائی ہے اس کے یاد کرنے سے جو وقت بچے اس میں دوسرا کام کرنا چاہئے اس قدر بوجھ اپنے اوپر مت بڑھاؤ کہ جماعت میں بُرے رہو کیوں کہ ہم سبقوں میں نتیجہ رہنا پڑی بے غزنی کی بات ہے۔ پورا انتظام اس کا ہے کہ انگریزی میں چال اور عادت انگریزی کے لکھنے میں یعنی انگریزی کی پوزیشن میں ترقی ہو۔ سو اُمید ہے کہ اس سلسلے میں تم نے تدبیر مناسب کر لی ہو گی اگر وقت کو انتظام سے صرف کرو اور محمل بانو نہ کر ہر کام وقت پر کرتے رہو تو با فراغت جماعت کی پڑھائی بھی یاد کر لو گے اور پھر بھی اتنا وقت بچے گا کہ اس میں انگریزی کو بڑھاؤ۔ عربی پڑھو اور ادبھی کلاس میں جانے کا حوصلہ کرو۔

نذیر احمد خاں

## لسانِ معصن بہادر حضرت اکبر الہ آبادی کا رقعہ دعوت

شمس المارمولانا شبلی نعمانی کے نام

آآ نہیں مجھ کو قبلہ قبلی  
بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی  
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات  
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات  
اکبر حسین

# جواب رفع

## من جانب شبلی نعمانی

آج دعوت میں آنے کا مجھے بھی ہر ملال  
 آپ کی لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں  
 لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا  
 اب تو اللہ کے انفضال سے یتیموں میں  
 دل کے بہانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ  
 جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں ہنظر ہوں میں

شبلی نعمانی

## سان اعصر خان بہادر حضرت کبیر کا خط

### جناب حمید میرٹھی ایڈیٹر نظارہ کے نام

الہ آباد، مارچ نمبر ۱۱۹۱ھ

عزیزی و کرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ آج آپ کا ایک خط آیا جس میں آپ نے یتیموں کی نسبت میر انجیل دریافت فرمایا تھا۔ اُن خطوں میں نظر آیا جس کا جواب  
 لے مولانا کا پیر زخمی ہو گیا تھا جس کے باعث قسطی چل پھرتے تھے۔ اس لئے اپنے آپ کو تہمت لگا کر

لکھتا ہے۔ یاد آتا ہے کہ اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں یہ خطار کھا رہ گیا شاید اس وقت ذہن میں یہ تھا کہ اس کے متعلق کچھ اور لکھوں گا۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ اور کیا لکھوں۔ اس کے ملاقات ہو تو ایک دلچسپ مکالمات اس کے متعلق ہو سکتی تھیں۔ سید صاحبی کا ارادہ تھا کہ علی گڑھ کالج یونیورسٹی ہو جائے۔ وہ ارادہ اب پورا ہو گا۔ میرے ذہن میں یہ چار مصرعے آئے تھے۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

لیکن میری شاعری کا ضعف ہوتا کہ اس نظم سے کام پورا ہونے کے معنی نہ پیدا ہوئے بلکہ ایک اور پہلو نکل آیا۔ نئی روشنی کی سیلک سے داد ملنے کی امید نہ رہی

آپ کا خیال صحیح ہے کہ پُرانے بزرگ لکیر کے فقیر اور ضرورت نہ مانہ سے بے خبر ہیں بے شک نئی روشنی کا ساتھ نہی دنیا کو دینا چاہئے ورنہ کس کے ہو کر رہیں گے اور کہہ جائیں گے۔ اسی بات پر صبر کرنا چاہئے کہ نئی روشنی میں گو ہر شخص باخبر ہے

لیکن اپنی ضرورت سے الفاظ کچھ ہوں مطلب اپنا ہے ۵  
دلالت ہے ہم کو بھی صاحب لائٹنگ کا پروانہ قیامت تک رہے سید تم سے آنر کا افسانہ

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ۵

بہت مشکل ہے جنھما مشرق و مغرب کا یادانہ ادھر حالت فقیرانہ ادھر سامان شاہانہ  
لیکن جن کو یادانہ کا شوق ہے وہ یہی کہتے ہیں ۵

مبارک شیخ کو نان جو جس کے ساتھ قرآن ہمیں تو دیر میں پرشاد کھانا اور کھجنگا  
بعض لوگ یہ معذرت کرتے ہیں اودان کی معذرت کسی قدر بجا ہے ۵

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہ سید سے نفس میں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں  
آپ نے اکثر خطوط میں میرے ناچیز اشعار کی تحسین مبالغے کے ساتھ فرمائی لیکن اس  
وقت ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ نے ان سے بھی اس خرافات کی طرح کی اس  
سبب سے مجھ کو سرست ہوئی کہ آپ ایسے ذی علم شائستہ خیال نقاد سخن تصدیق فرماتے  
ہیں کہ میں نے وقت نہیں ضائع کیا۔ مجھ کو افسوس ناک واقعات نے قیدی بنا دیا۔ ورنہ  
باوجود نادستی مزاج کے اکثر سیر و سفر میں بسر کرتا۔ امید کرتا ہوں کہ دسمبر کے دوسرے  
ہفتے میں دو چار دن لکھنؤ میں بسر کروں۔ خدا کرے اس ارادے کو پورا کر سکوں۔

نیاز مند۔ اکبر حسین

## حضرت ارشد تھانوی کا خط حضرت محمدی لکھنوی کے نام

بھوپال - ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء

خلیل کعبہ محبت، عزیز مصرفت (نہیں نہیں یہ سب متروک انشا پر از ہی کا دھنگ ہے)  
اس لئے محض اڈیر محمدی (نمائشی نہیں بلکہ حقیقی معنی کے لحاظ سے) اگرچہ ص  
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سلام شوق (یعنی سلام ارشد بعد شوق نہ کہ حضرت شوق کا سلام) مگر اس ترکیب  
سے تو خط لکھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لہذا میں معترضہ جملے حذف کرتا ہوں۔  
سُنئے! آپ کا طوابع محبت، ارفع نقاب، بھائی ظفر کا افسردگی نامہ یکے با دیگرے  
موصول ہوئے۔ بھائی ظفر کو جواب لکھ دیا۔ نقاب کی رسید یہ عریضہ ہے اور نامہ گرامی کو جواب

کے لئے وقت درکار ہے۔ آپ کی محبت کا سچا نقش میرے دل پر ہے۔ سچ ہے ص

دل را بدل ہے ست وریں گنبد سپهر

بھدا آپ کے نہ ہونے سے مجھے بھی بھوپال میں لطف نہیں آتا۔ اس پر طرہ یہ کہ میں بھوپالی  
اشخاص کو زمرہ احباب سے باہی کاٹ کر دیا جس کا بڑا سبب جناب قیصر کی ذات  
ستودہ صفات ہے وہ فی الحقیقت آپ کے بھوپالی ہیں یعنی موسمی دوست ہیں۔

میں نے موسمی ابو الحسن کو فی الحال آپ کا قائم مقام تجویز کیا ہے۔ وہ آپ کے ساتھی تھے  
انہیں کے پاس اکثر چلا جاتا ہوں گو وہ کبھی مکان پر نہیں ملتے۔ پندہ چکروں میں ضرر ایک مرتبہ  
ملاقات ہوئی مگر آپ کی محبت ان کو درک لے جاتی ہے۔ لیکن وہ ایک مقدس آدمی ہیں۔ اللہ  
سب لیلیٰ کی پھلتی نہ کہدینا۔ اگر خط پڑھتے ہوئے اس فقرے پر ہنسنے تو میں ضرور آپ کی  
طرف سے یہ پھبتی منسوب کر کے خود انہیں سے داد لوں گا۔ یہ خیال فرمائیے گا کہ آپ کے تبسم ناز  
کی مجھے خبر نہ ہوگی۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ بھوپال سے چلتے وقت ایک چنز میں نے ہنر کو  
پیش کی تھی۔ جسے عرف عام میں دل کہتے ہیں۔ جسے شعرا کائنات سے استعارہ کرتے ہیں۔

اُسی کے ذریعے سے مجھے آپ کی تمام خبریں مل جاتی ہیں اور جو بات ہوتی ہے صاف اس  
میں نظر آ جاتی ہے۔ کیوں نہ کہو گے کہ پولیس واسے عشق میں بھی اپنے فرائض منصبی  
غافل نہیں رہتے۔ ایک خبر یہاں بھی لگا دیا۔

گل رنگیں تھے ہلکا آپ نہیں سمجھے۔ وہ تو میں سمجھتا ہوں۔ آپ نے ابتدائی کارڈ  
کی نسبت لکھا تھا کہ میں نے اس میں ایسا کچھ لکھا تھا۔ اسی مفہوم کے لحاظ سے میں نے  
عرض کیا تھا کہ پھر سنا ہے کیونکہ ص

ہیں گل رنگیں سے بہتر (تم) گلوں کی گالیاں

اس بھائی! ہماری بھانج کو ہمارا سلام ضرور پہنچا دیا کرو۔ چاہے خط میں ہوا کرے یا نہ ہو کرے۔ حضور (بروزن طور) سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔ انجلیئر صاحب کی علالت نے انہیں بھی بیمار بنا رکھا ہے۔ خانہ زادوں سے بڑھکر دوا دوش میں مصروف ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ سگ حضور ہیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست کا مارا گیا۔ اُن کو اسٹیشن لینے جاتا ہوں لہذا آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی اُدیب اللہ خاں

مولوی عبدالرزاق صاحب مولف البرکۃ کے نام

حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب تدفیر

اسلام علیکم۔ مزاج شریف والا نامہ ورد ہوا۔ شرف افتخار ہمراہ لایا۔ خادم آپ کی اس عنایت بے غایت کا حد درجہ شکور و ممنون ہوا کہ اس نالائق پر نظر مشفقانہ فرمائی اور جواب عریضہ سے افتخار اور عزت افزائی بخشی۔

یہ فقط آپ کی عنایت ہے ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

فی الواقع آپ کی ذات بابرکات مغنیات روزگار سے سی۔ اللہ جل شانہ آپ کو صدی سال سلامت رکھے مکروہات زمانہ سے محفوظ رہے تا مویشی اژدہا تو حید ثنائے تست

آپ جس اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے فی الواقع نہایت ہی مشکل ہے۔ بلا در رعایت عرض کرتا ہوں کہ یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ اس پر خطر میدان میں بہادرانہ قدم رکھا۔ انشا اللہ آپ کامیاب ہوں گے اور عنقریب آپ کی بے بہا تصنیف سے ملک مستفیض ہو گا۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لائف میں نے تھوڑے عرصہ سے شرفِ کراچی پر  
 لیکن جیسے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہر قطع میں ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت اور وقت کشی  
 دیکھا رہے لیکن السعی منی واکلا تاحر من اللہ کا مقولہ ہر وقت پیش نظر رہی اور اگر اللہ کی مرضی  
 ہوئی تو آپ نے کام میں کامیاب ہوں گا اور ضرور ہوں گا۔ ختم کر دیا میں مولانا شبلی نعمانیؒ کا عمدہ  
 کتب خانہ ہے جو گزشتہ کئی نصف میں (جو مکملہ میں حلیمہ ہوا تھا) مولانا شبلی صاحب نے نہایت محنت سے جو ان میں  
 نے عرض کیا کہ آپ کے مفید کتب خانہ سے خادم بھی مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا موصوف نے  
 فرمایا کہ میں فرصت سمجھوں گا۔ شاید فرصت نہیں ہوئی۔ اس لئے اس میں کی کل بھی میں نے  
 شبلی صاحب کے یہاں غریبہ لکھا ہے۔ چونکہ ابکل لئے میری ذات اسلام سے صلاح الدین  
 کی لائف لکھتے ہیں کہ فرصت ہے۔ پٹنہ کی بابت جو کچھ اس جناب کے تحریر کیا ہے وہ بجا ہے۔ اس سبب  
 کو میں مینہ جاؤں گا کیونکہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہی اس لئے وہاں کے کتب خانہ کی بھی سیر  
 ہو جائے گی اگر تصنیفات غزالی مل گئیں تو دیکھ لی جائیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ ابھی صراحۃ العلوم  
 وغیرہ کی تفصیلی بیوی لکھا گیا ہے اور جو کتابیں دستیاب ہوئیں ان سے امام صاحب کے حالات  
 قلم بند کئے ہیں۔ مصروفِ غیرہ سے کتابوں کے لئے خط طے ہیں طبقات اثنافیرہ تو موجود ہے  
 آپ دیکھ لیں۔

آمین عرب: الفاروق، دربار اکبری ترجمہ قرآن نظم و غیرہ میں قسب شک چکا ہوں  
 سبحان اللہ یہی کتابیں تو سب سے لئے سرمایہ ناز ہیں؟ لکھتے تھے نہ فرما  
 دیر یہ تحریر فرمائیے کہ آج کل سائنس کی جو کتابیں انگریزی میں بھی جانی ہیں ان کے  
 ترجمے اردو میں بھی ہوتے ہیں اگر یہ سچ ہے تو کہاں ہوتے ہیں۔ تحریر کیجئے گا۔  
 خادم العلماء و برہ غلام محی الدین آزاد۔ کون اللہ

# جلیل القدر حضرت جلیل بشتین مہینہ سبائی اُستاد اعلیٰ حضرت سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کا خط صفدر علی صفدر کے نام

حیدر آباد دکن۔ عید رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ

وفا پرورد محبتی صفدر سلمہ اللہ لا کبر سلام سنوں میں بھماری وزارت پناہ دیتا کہ شہر  
سے باہر رہا۔ اس وقت دو محبت نامے آپ کے پیش نظر ہیں اور ایک کارڈ بھی، کارڈ سے  
معلوم ہوتا ہے کہ نصیب دشمن آپ علیل ہیں۔ کیا مرض ہے؟ اب کیا کیفیت ہے؟ لکھنے طبیعت کو تعلق ہے۔  
اس مصرعہ پر ہے فخر ہندوستان ہو گیا۔ اعتراف صحیح ہے ہندوستان میں نون کا اعلان چاہئے  
اس لئے کہ اُس کے ساتھ اضافت فارسی کی آگئی ہے یعنی فخر ہندوستان اسی طرح راؤ  
عطف کے آجانے سے بھی اعلان نون ناجائز ہو جاتا ہے۔

اشاعت گلدستہ کے متعلق آپ کی دل سوزی اور رائے قابل شکر گزری ہے۔ اس باب  
میں انشاء اللہ متعقب کھوں گا۔

سرپرست جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے انہیں کو سمجھنا چاہئے۔ استعمال کا سکہ ایسا  
رواں ہے کہ اُس کو کوئی اُنت نہیں روک سکتا۔ سرپرست مُرنی ہی کے معنی ہیں استعمال کرنا  
چاہئے۔ جناب اختر سلام کہتے ہیں۔

جلیل حسن جلیل سلطان اللہ



## حضرت خگراجے گڑھی کے نام

جناب کرم و مظلّم سنا سنوں، لڑائش نہ آیا۔ منت پر پر فرمایا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے در سارہ تنکیر و تائید، کو قدّر کی نگاہ سے دیکھا اور اس پر یہ پورے کھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اس کا جدا گانہ مشک کریم ادا کرتا ہوں۔

لفظ احمد کے مستحق جد آپ نے لکھا ہے کہ یہ لفظ تائے فوقانی کے ساتھ نعمت ہر اور ثمنوی بہت عشق کے شعر تحریر فرماتے ہیں۔ میری ماں کے جو کہ اہل اس کی تہذیب ہے۔ کثرت استعمل زبانوں پر تہذیب و تمدن کی اصلیت کوئی خیال میں نہیں آتی۔ مثالیں کافی نہیں، تاہنیکہ قافیہ سے ثبوت نہ ہو۔ کتابت دالے، اپنی دالے سے کچھ کا کچھ لکھ دیا کرتے ہیں۔ تہذیب کی مثال اس وقت میری نظر میں نہیں ہے۔ میں آج کل دورانِ عمر میں مبتلا ہوں۔ انشاء اللہ مزید تحقیقات سے آپ کو مطلع کروں گا۔ آپ کی ناچاتی مزاج سے تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اچھا لکھے خیریت مزاج سے مطمئن فرمائیے۔ والسلام

جلیل حسن جلیل سان اللہ  
شمس العلماء مولانا حالی کا خط

مولوی عبدالرزاق مؤلف البرکۃ کے نام

پانی پت کرنا۔ ۱۵۔ فروری ۱۹۱۲ء

جناب نشی صاحب مخدوم و کرم تسلیم، عنایت نامہ مورخہ ۳۳ فروری ۱۹۱۲ء پہنچا۔

شکریہ قبول فرمائیے۔ اس بات کے دریافت ہونے سے کمال مسترت ہوئی کہ نواب لیچند در  
ریاست بھوپال نے آپ کی گراں بہا تصنیفات کی دیکھنا قد رشتہ ناسی فرمائی اور تصنیف و  
تالیف کی خدمت پر آپ کو اپنی ریاست میں جگہ دی ہے۔ چشمہ بدردہ آج کل ریاست  
بھوپال اہل کمال کا مرجع اور اسلام اور قوم کی تکیہ گاہ اور رشتہ پناہ ہے۔ الحمد للہ شاہ  
علیہا حضرت یکم صاحبہ باقہا بہا اور جناب ولی محمد بہادر اور دیگر صاحبزادگان ملکہ اقبال  
کو دیگر گاہ سلامت رکھے۔ نظام الملک جیسی عالی درجہ تصنیف پر یو پی لکھنے کے قابل  
اب میں نہیں رہا۔ قطع نظر اس کے کہ قولے جسمانی روز بروز مضاعف ہوتے چلے جاتے ہیں  
دماغ بھی معطل بلکہ مختل ہو گیا ہے۔ خطوں کا جواب مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ دوسروں  
سے لکھواتا ہوں۔ جو کچھ لکھا پڑھا تھا سب فراموش ہو گیا۔ میری موجودہ حالت  
پر مرزا غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے ۵

دیگر از خویشم خبر نبود تکلف بر طرف  
بجائے غالب کے حالی پڑھنا چاہئے۔

اُمید ہے کہ آپ عنقریب کسی نامور آدمی کی لائف لکھنی شروع کریں گے۔ شروع  
کرنے سے پہلے مجھ میر و کے نام سے مطلع فرمائیے گا۔ زیادہ نیاز

خاکسار  
الطاف حسین حالی

# فصح الملک حضرت داغ مرحوم کے خطوط

## حضرت انجم نیشاپوری کے نام

سید صاحب کرم سلامت۔

داغ کو جلا کر خاک میں ملا کر آپ لکھنؤ چلے گئے۔ خیر صبر و شکر۔ چونکہ یہ بے وقافی اور کج ادائیگی آپ نے اڑائی ہے۔ ہم بھی سمجھے۔ اسے شخص اللہ سے تیرا داغ چلتے وقت ملنا اور اس تکلف اس استغناء کے ساتھ۔ رحم نہ آیا، ترس نہ کھایا کہ ایک کشتہ فراق تروپ۔ ہا ہے اس کی دلجوئی کیجئے یا اس کی تلافی یہ ہوئی کہ لوہم جاتے ہیں اچھا جاؤ غارت ہوؤ ہر صبر کر لیں گے۔

وہ فائدہ لکھنؤ سے غطیم آباد پہنچا وہاں سے ایک قیامت نامہ میرے نام آیا جس کا مضمون قابل تحریر نہیں۔

جس ساتھ کی میری تصویر سیدناظر حسن کو دی ہو اس کے ساتھ کی چند تصویریں اور مجھ کو عنایت ہوئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو حال آپ نے دیکھا ہے وہ میری کیفیت کسی اور سے نہ کہنا۔ خدا کے واسطے خاک میں نہ ملا دینا۔ راقم نواب مرزا داغ عفی عنہ ۲۰ اپریل ۱۳۵۷ء

دیکھ

بند پرورد! یہ کس کم نبت کی تمنا ہے کہ ایک شفیق مسافر معان کو بلالوں تو جاؤں اس خاکسار سے یہ گمان بھی غلط۔ اگر پیامی نے بیان کیا تو خدا اسے سمجھے جو اس وقت ہفتیش میں ان کی زبان پر یہ کلمے بلاشبہ آتے ہیں کہ وہیں روکنا یا کہ ہم تمہاری جاؤں

اور اتحاد سے واقف ہیں۔ ہر خاک پا کے اجاب بے ریا ہیں۔ البتہ پہلی جو خبر ملی چلے گئے۔ یہ شاید سکنت کی کمی ہوگی۔

کئی روز سے آنا چاہتا ہوں۔ وقت ملنے کا پوچھتا ہوں۔ صاف جواب نہیں ملتا۔ آپ ملاقات سے کیوں کنیا تے ہیں میں قیہ نہیں ہوں۔ آپ نے نہ مل کر میرا مزہ خاک میں ملا دیا بلکہ ذہ بھی آپ کے شاکی گئے۔ یہ بھی اُن سے معلوم ہوا کہ ایک تصویر اس دسیاہ کی اُس نے آپ سے چھین لی۔ آپ کا لکھا بہت بجا تھا۔ مجھ کو کہ میں آنکھوں سے حاضر ہوں۔ آپ ہرگز نہ تکلیف فرمائیں کہ میرے پاس ہجوم رہتا ہے۔ ایک تازہ شعر لکھتا ہوں ے

شب ہجران کے جاگنے والے ایسے سوئے کہ کچھ خبر نہ ہوئی

داع دہلوی

حضرت ولی کبر آبادی اطریشیہ کا خط

جناب میرزا محمد میری اطریشیہ کا خط

محبوبی! یہ شعر آپ کا فائدہ نشی کار ڈاؤر نظائے کے دو نمبر لے۔ ممنون تو جات فرمایا۔ بیار ہوں۔ اس لئے باوصف حشر دید نظارہ کو اب تک نہ دیکھ سکا۔ نقاد کی اشاعت میری غلات کی وجہ سے ملتوی ہے۔ جس وقت شائع ہوگا برابر حاضر خدمت ہوگا۔ نظارہ دیکھنے کے بعد اپنی محقر اسے دے سکوں گا۔ ابھی اس قابل نہیں۔ دئے صحت کا طالب ہوں۔ میری حالت حسب ذیل نظم سے ظاہر ہوگی جو مرمر کے لکھی ہے ے

ہو خاک شگفتگی کی تذبذب ،  
 صدیف کماں وہ رنگِ نقیر  
 پنج پنج کے مری دعا سے اکشر  
 روتا ہوں جو بے کسی پر  
 تکلیفِ مرض جو دب رہا ہے  
 صدمت سے مری عیاں ہی صدمت  
 بن جائے نہ طوق کیوں گریباں  
 دشوار ہے دو قدم بھی چلنا  
 مضیوں اگر نہ کچھ سکوں میں  
 ہے صفت بہت - بقول سعدی  
 رسم است کہ ماکان تحریر  
 غنچہ کی طرح سے ہوں میں دل گیر  
 پریاں ہوتی تھیں جس سے خیر  
 چھپ چھپ کے کچل گئی ہی تاثیر  
 خود ہنستی ہے مجھ پر میری بقیر  
 مر سانس ہوئی ہے مجھ کو شیر  
 اک حسرت دیا ہے کہ چوں تاثیر  
 ہے کہ دُش بخت تابِ تنویر  
 وہ صفت کی یاد نہ دیتا ہی زخیر  
 تم کہ دو معائنہ میری تقصیر  
 واجب نہیں مجھ کو دینی قصہ  
 آزاد کنندہ بندہ پسند دلیک

**سائن الملک حضرت یاض کا خط**  
**حضرت دلگیر کب آباد میاں پیر تھانہ سے نام**

پیٹے دلگیر کی میں لکھو آیا تو آپ کے دو کارڈے میں جب آگے گیا تھا خوش تھا  
 کہ آپ سے ملوں گا۔ میں اس وقت بھی مردہ تھا جب آپ مجھ سے ملے تھے اب تو  
 بے سیدہ ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہا البتہ اس اعتبار سے بہت اچھل مہل -  
 صحت شکنیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ہم رہے باغ و بوستان نہ رہا اب کہاں جائیں آشیاں نہ رہا  
 اب بجائے فلک جہان نہ رہی آسماں اب وہ آسماں نہ رہا  
 عمر تیری سوا ہو حسرت مرگ شکوہ عمر جسا و داں نہ رہا

آپ مجھ کو اپنی دلی محبت سے آفتاب سخن بنا کر نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ میں وہ داغ  
 دل ہوں جو کبھی نمایاں ہو نہیں سکتا۔ دماغ کیجئے تو قبر سے اپنا یہ مصرع پڑھتا انھوں  
 صدمہ ہم گنہگار بھی اللہ کے پیار سے نکلتے۔

تبعیل ارشاد ایک غزل بھیجتا ہوں جو داغ کی مشہور زمین ہے۔ اب تک اُسے میں  
 نے چھپائے رکھا تھا۔ اب وہ "نقاد" کے لئے ہے۔ خدا کرے آپ کو اوداظرین  
 نقاد کو پسند آئے۔

## آئریل ڈکٹر میر سید احمد خاں کے خطوط

### مولوی سید ممتاز علی خاں کے نام

مجھے یقینی ہے آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میرا خط آپ تک  
 نہیں پہنچا۔ میں نے ایک مفصل خط آپ کو لکھا ہے۔ جو خیالات آپ کے دل میں گزرتے  
 ہیں وہ سب غلط ہیں۔ میں اپنے دوستوں کا جاں نثار و خاک پاہیوں۔ قصور کیسا۔ معافی  
 کیسی۔ آرزو دلی کیسی۔ ایسے خیالات کبھی میری طرف نہ ہوا بھی نہ فرمایا یہ مولوی سمیع اللہ  
 خاں نے اپنے صاحبزادے کے اپریل میں ولایت جائیں گے۔ نہایت خوشی ہو۔  
 کہ آپ بھی ساتھ جاویں۔ مگر قبل ازروائی اپنے سبب انڈین سول سروس میں منتخب کرنا  
 یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے۔ جس طرح پر ہو۔ تم مجھ سے ملو۔ میں شروع دسمبر میں کلکتہ

چلا جاؤں گا۔ اخیر سمبر کی تعطیل میں تم بھی کلکتہ چلے آؤ۔ میرے پاس بہنو سب طرح آسائش اور میرے دل کو راحت ہوگی۔ طمانیت سے سب باتیں حاصل ہوں گی۔ مسودہ درخواست مرتب ہو جائیگا اور سب تدبیریں تبادول کا یکملتہ آنا کچھ مشکل نہیں ہے سیر بھی کر دے گے، ملاقات بھی ہوگی۔ دل خوش ہوگا۔ کیا امر تم کو کلکتہ آنے سے مانع ہے۔ میں تم کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔ جو بات ہو۔ مجھ کو لکھو۔ اگر کلکتہ آنے میں کسی امر کی ضرورت ہو مجھے لکھو میں اس کا انجام کروں گا۔ تمھاری عمر سوقت ایسی ہے کہ ناٹین سول سروس کی ابھی تدبیر ہو سکتی ہے۔ چند روز بعد تدبیر باتھ سے جاتی رہے گی۔ والسلام۔  
خاکسار۔ سید احمد علی گڑھ ۱۶ نومبر ۱۹۰۶ء

عزیز بی بی۔ تمہارے تین خط پانچ پہلا خط جو شکریہ کا تھا۔ اس کی کچھ ضرورت نہ تھی مجھ کو تم سے دلی محبت ہے۔ اور ہر طرح ترقی کا خواہاں ہوں۔  
تپچھلے دو خطوں کو پڑھ کر افسوس ہوا۔ ولایت جا کر تعلیم حاصل کر کے ہندوستان میں وجہ معاش حاصل کرنے کے بعد بغیر ولایت جائے حاصل نہیں ہو سکتی صرف تین کام ہیں۔  
بیسٹری۔ انجینیری۔ ڈاکٹری۔ اول کام تم بھی ناپسند کرتے ہو۔ اور میں بھی چند اہل کسب نہیں کر سکتا۔ صرف بیسٹری کے بعد ڈاکٹر کی ضرورت اُمید ہے۔ ایک یہ کہ بندہ بیسٹری کو وہ کیسی ہی کم ہوتے ہیں چار سو روپیہ مہینہ ضرور ملے گا۔ اور اس سے زیادہ ترقی جاتی ہے۔  
تقدیری بات ہے۔ دوسری یہ کہ بعد واپسی ہندوستان کوئی اہل کسب نہ ہو۔  
کا ضرور مل سکے گا۔ اور اسی سلسلہ میں جلد ترقی کے کام واقع ملے گا۔ اور ہندوستان کے امتحانوں سے نجات ملے گی۔ باہر بیسٹری میں اس سے زیادہ توقع نہیں ہے۔

انجیری میں داخل ہونے کو ان وجوہات سے جو آپ نے لکھی ہیں۔ بلاشبہ نہایت مشکل اور نہایت دقت ہے۔ ڈاکٹری میں بھی وہ دقت پیش آوے گی۔ مہذا ڈاکٹری اس لئے زیادہ نامناسب ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو سول سرجن کا عہدہ ملنا انگریزوں اور لیڈیاں پسند نہیں کرتیں۔ اور اس لئے ہندوستانی فوجی ڈاکٹری پڑھیں گے جاتے ہیں۔ پس درحقیقت تمھارے لئے کوئی ایسا موقع نہیں ہے کہ بعد واپسی ولایت سے ایسا عہدہ پاسکو۔ جو یہاں کی تعلیم سے حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ پس آپ کا ولایت جانا دو امر کی توقع پر ہو سکتا ہے۔ اول بار سٹری کے لئے جس سے ان فوائد کے سوا جو اوپر مذکور ہوئے۔ اور کسی بات کی توقع نہیں۔ شاید یہ ہو۔ کہ عدالت ابتدائی کھدے ملنے میں ولایت کی تعلیم کے سبب کچھ آسانی ہو۔ دوسرے بغرض عہدہ تعلیم حاصل کرنے کے اس میں کچھ شک نہیں کہ انگریزی میں عہدہ تعلیم ہندوستان میں حاصل ہونی ناممکن ہے۔ اور ولایت میں جو عہدہ انگریزی تعلیم حاصل ہو جائے گی۔ وہ لازوال ولایت ہے۔ اور ولایت سے واپس آنے کے بعد اسی تعلیم کے ذریعہ سے چار پانچ سو روپیہ ماہوار ہی ہر صورت سے کما سکتے ہو۔

تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے۔ کہ اگر تم چار برس کے لئے بھی ولایت جا سکتے ہو۔ تو جاؤ فی الفور جاتے ہی کسی یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤ اور لٹریچر کی شاخ اختیار کرو۔ برس روز تک کسی چیز کا بجز محنت کے ترقی تعلیم پر خیال مت کرو۔ برس روز کے بعد ”لنکن ان“ میں بار سٹری کے لئے داخل ہو جاؤ تعلیم پرستور یونیورسٹی میں جاری رکھو۔ اور صرف لکچر کے زمانے میں لیکن ان“ میں آکر لکچر سن جایا کرو۔ دو برس بعد امتحان دینا ہوگا۔ چند روز پہلے امتحان کے لیے



اپنے نہیں تیار کر لو۔ اور اگر "لنکن ان" میں یہ قاعدہ اب بھی ہو کہ جو شخص تین برس تک لکچر نہ کرے۔ اسکو امتحان کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اسحاق کا خیال بھی مت کرو۔ تین برس تک برا بکھڑے جاؤ۔ اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اس قدر محنت کرو کہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لاؤ۔ یہ دولت ایسی ہوگی جس سے مسلمانوں کو تمہاری ذات پر فخر ہوگا۔ اور ہمیشہ کو تمہاری ذاتی اور دینی خوشی کا باعث ہوگا اور اگر یہ امور تمہاری دانست ہیں اور تمہارے والد ماجد کی دانست میں کافی معارف و لائت جاننے کا اور چارہ برس تک صعوبات سفر اختیار کرنے کا اور سب سے ذائد و پیہ خیرج ہونے کا نہ ہوں۔ تو ارادہ و یقوت کرو۔ تن بہ تقدیر یہاں تعلیم میں کوشش کرو۔ تم کو انگریزی لکچر میں ترقی کی بہت حاجت ہے۔ اور اس پر بہت زیادہ کوشش درکار ہوگی۔ والسلام  
خاکسار تمہارا خیر طلب سید احمد گلشنہ ۱۸ فروری ۱۸۸۷ء

مولانا سید سجاد حیدر صابانی۔ اے یلہم کا خط

حضرت لکھنؤ کے نام

..... میرے پاس نومبر کا "نقاد" نہیں پہنچا نہ معلوم آپ نے اس میں کیا تحریر فرمایا ہے؟ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مرا ہوا تو ہوں ہی مگر اس موت کے تشہیر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ خواہ مخواہ عزیزوں اور احباب میں کھلبلی مچ گئی۔ میرے پاس اور خط بھی ایسے آرہے ہیں۔ اندازہ کرو "نقاد" کا وہ نمبر جس میں بارگاہ الہیہ ہوں۔ میرے دیکھنے کیلئے بھیج دیجئے میں بھی تو دیکھوں کہ پس مردن میری محل کے ساغر بنائے گئے ہیں خاک بن گئے  
سجاد حیدر

# حضرت سلطان احمد صاحب کھنوی کا خط صفدر علی صاحب صفدر کے نام

بنارس۔ عدالت ججی۔ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۹۳ء

حضرت سخندر صفدر۔ آپ کا لازمی کارڈ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ بارش کا حال آپ  
کیا پوچھتے ہیں۔ ایشیائی مشرقوں کی کمر باندگی۔

بھائی قحط نے تو وہ نادر شاہی چمادی کہ تو یہ ہی بھلی۔ پرانے میاں بی بی آسمان  
زمین تک لڑ گئے۔ زمین کی صورت تو دیکھی نہیں جاتی۔ اس کا حال تو معلوم ہو چکی بھیگی  
پھرتی ہے نہ سر پر آب رواں کی چادر ہے۔ نہ جڑ اوپتے۔ نہ سبز۔ نہ بالیاں۔ خدا ہی برو  
رکھے "آسمان" خدا وہاں نہ لے جائے کچا چھٹا ہاں سے معلوم نہیں ہو سکتا۔

اب اتوار کا حال کیا پوچھتے ہو

اب نہ وہ دن ہیں اور نہ وہ آتیں  
وہ گئیں یادگار وہ باتیں

ابھی بہت جی گھبراتا ہے۔ مکان اب تک نہیں ملا۔ بہت خراب مکان ملا ہے جس  
میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جو نیو رکھاں جائے گے نہیں چلے آؤ۔ آدمی کچا کھانا پکانیوالا  
مل گیا ہے۔ یہی شکر ہے۔ بڑی تعطیل قریب ہو۔ مگر یہ شک ہو کہ مجھے جانے کی اجازت  
لے شکر کرتا ہوں اور یہ شعر پڑھتا ہوں

دام سے چوٹے تو مجلس میں رہے جب رہے صیاد کے بس میں ہے  
شطرنجی یا باسطی یہاں بہت ہیں مگر وہ بات کہاں۔ بھائی خدا کے واسطے لکھو۔ ہمارے  
خوابے کہاں ہیں۔ کوئی خط نہیں آیا۔ میرے خط کا جواب نہیں آیا۔ مینی آرڈر کی رسید

اسی اگر میں تو بہت ہی شکایت سے سلام باقی کا ایک کارڈ لاجواب آیا تھا۔ جواب کیا ہو سکتا تھا۔ ظہر کے پیر میں برساتی ہو گئی ہے۔ لکھا نہیں جاتا کہ کفایت حسین۔ محبت حسین اصغر صاحب کو سنام۔ باقی کو سلام باقی رہنے دیجئے۔ ممنون احسان۔ سلطان

## سحر البیان حضرت شوق قدوائی مصنف گمراہ شوق و غیر کا صفدر علی صاحب صفدر کے نام

رام پور اسٹیٹ۔ ۱۹ جنوری ۱۹۱۳ء

کرم فرمائے زندہ حضرت صفدر صاحب سلام شوق۔ آپ نے خط میں دہلی اور لکھنؤ کے اختلاف زبان کی نسبت ایک فقرہ لکھا ہے۔ میرا مسلک اس بارے میں صلیح کل کا ہے۔ دونوں شہروں میں کچھ الفاظ ایسے ضرور ہیں جن کے نزدیک وراثت میں اختلاف ہے اور کچھ محاذ سے ایسے بھی ہیں جو ایک جگہ بولے جاتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں بولے جاتے۔ بعض ناواقفوں نے جانبین سے معاندانہ بحثوں کو چھیڑ کے باہمی کشمکش پیدا کر دی۔ ایسا بھی ہو رہا ہے کہ ایک مقام کے مقلد نے دوسرے مقام کی غلط زبان لکھ کے اس پر حرج کر دی یہ سب باتیں فضیل جھگڑے کی ہیں۔ وہ خاص الفاظ جو مقامی ہیں۔ انھیں ہر شہر کے مقلد کو اسی طرح کہنا چاہیے جس طرح وہاں بولتے ہوں۔ اس کے خلاف کہنے سے بڑا غلط ہے۔ مثلاً ایک شخص دہلی کی تقلید میں غور کو نمونٹ اور فکر کو مذکر کہے اور پھر وہی شخص لکھنؤ کی تقلید میں غور کو مذکر اور فکر کو نمونٹ کہہ جائے۔ تو ایک ہی شخص کے کلام میں دو صورتیں پیدا ہونگی اور اس کا کلام اس کے شہر کی بول چال کے واسطے قابل سند نہ رہیگا۔ کہ ایسے



بدست پسندی، نعمت بخشی، خیال آرائی کی داد دیتا ہوں  
 شعر لے سنسکرت میں، ہمارا کوئی کا تیرا اس کو میں اس لئے اور شعرا پر ترجیح دیتا ہوں کہ  
 جہاں کہیں اس کو موقع ملا ہے اس سے قدرتی مناظر کی دلفریبیوں کی ایسی جنتی جاگتی  
 دانش تصویریں چنچ دی ہیں کہ بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتیں۔ اس نے اپنے  
 شاندار جذبات کے ایک ایسے شفیق قوت شجیہ کا ایسا وسیع میدان کھول دیا ہے  
 جو نہایت پُر لطف نظاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ کالیڈاس  
 نے ہر پسند کی تعریف کیسی خوبی سے کی گوا اپنے طور پر ہر ایک بے نظیر ہے اگر  
 ایک کا مقابلہ دوسری سے کیا جائے تو ایک قسم کا خوشگوار اختلاف محسوس ہوتا ہے  
 اور دوسری ہی اس کا کمال ہے۔ کیونکہ یہ کس قدر شکل امر ہے کہ باوجود کے کم ہر ایک  
 کو بطور خود مہتمائے حسن پہنچا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے معیار حسن کو ترقی دے  
 دی ہے۔ دوسرا کمال اس کا یہ ہے کہ خواہ اس نے اجمال سے کام لیا ہے  
 خواہ تفصیل سے، خواہ تشریح سے، خواہ تشبیہ سے، لیکن ہر صورت میں جو کچھ بھی خواہ  
 قلم کیا ہے، بعینہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا حسن مجسم کی تصویر عالم مثال سے لا کر  
 شہود میں رکھ دی ہے۔

آئیے ایسے قادر الکلام شاعر کی منطری تصویر میں اپنی زبان کی لطافت کا  
 ایسا خوش نما رنگ بھرا ہے کہ لائق تالش ہے سنسکرت کے پیچیدہ اور عمیق  
 جذبات کو نظم کرنے اور سلاست زبان کو طوطا رکھتے ہیں کامیاب ہوتا آسان  
 نہیں ہے۔

شاد

# جناب ظفر الملک حسنا ایدہ طبر الناطر کا خط

## حضرت غزنوی لکھنؤی کے نام

دفتر "الناظر" فلادریز لکھنؤ ۲ دسمبر ۱۹۲۲ء  
 مکرمی تسلیم۔ دسمبر نمبر میں شہید مقدس کا حیرت انگیز نظارہ درج کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ علی  
 سے گزرے گا۔ میں نے آپ سے کئی ملاقاتوں میں یہ ظاہر کیا تھا کہ "الناظر"  
 کے سے علی رسالہ کی اشاعت آپ ہی لوگوں کا کام تھا جو خاص لکھنؤ کے باشندے  
 اور زبان کے ماہر ہیں۔ ہم دیہاتی لوگ کھیتی باڑی کے کام کے اچھے ہوتے ہیں اور  
 ایسے کام میں اہل شہر کی مداخلت گوارا نہیں کرتے۔ پھر آپ لوگوں کے جو کام ہیں  
 ان کی طرف آپ کی بے توجہی کیا معنی رکھتی ہے۔ جو لوگ اپنے فرائض زندگی اور ان  
 کاموں کی اہمیت سے ناواقف ہیں جیسے ہمارے شہر کے بھولے بھالے نواب زادے  
 اور شہزادے۔ اگر وہ اس قسم کی غفلت کریں تو کچھ سکایت نہ ہو۔ لیکن آپ حضرات جو  
 ملک کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنے کی قوت رکھتے ہیں اور ضروریات زمانہ  
 سے بوجہ واقف ہیں۔ کسی طرح اس الزام سے بری نہیں کئے جاسکتے کہ آپ کی  
 بے اتفاقی اور پہلو تہی سے اردو علم ادب کو جو منافع حاصل کرنے چاہئیں تھوڑے نہیں پہنچتے  
 میں "الناظر" کے اجراء کی ضرورت کو پہلے نمبر میں ظاہر کرتے ہو محسوس فی سطور لکھی ہیں  
 مصوبہ اودھ کی تمام تحریکوں کے مرکز لکھنؤ کی زبان اردو سے جو نسبت قدیم سے ہی  
 اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور جس قدر کہ کشمیر ساکنان شہر لکھنؤ نے اردو زبان

وسیع کرنے ترقی دینے۔ پاکیزہ بنانے اور شمشیر بولنے میں کی ہیں وہ ارباب سخن سے پوشیدہ نہیں۔ صاحبِ اختر شاہنشاہی کی تحقیق کے مطابق الحاقِ اودھ کے بعد سی ۱۸۵۷ء تک تقریباً تین بیس اخبار اور نین پچیس رسالے اور گلدستے خاص لکھنؤ سے اردو زبان کی خدمت گزاری کے لئے جاری ہوئے اور اس میں سال میں اگرچہ ہماری رفتار ترقی دینی تیز نہیں رہی پھر بھی متعدد اخبار رسالے اور گلدستے مختلف مقاصد کے لئے جاری ہوئے اور گوان تمام اخبارات۔ رسائل اور گلدستوں کو۔ زمانہ کی ناقدری اور ہلک کی بے توجہی کی شکایت کم و بیش رہی اور بہتر سے بہتر قدری اور بلعنائی کی باوجود مخالف کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر قبل از وقت موت کا شکار ہو گئے لیکن انہیں سے بعضے جواب تک اپنے چہرہ فیض سے ملکی لٹریچر کی کیریوں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اردو زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

اگرچہ تمام کوششوں میں جو اردو کی بھی خواہی میں کی گئیں ہم اور ہمارے صوبے لوگ معقول حصہ لیتے رہے لیکن تعلیم کی کمی اور اس صوبہ کے باشندوں کی آرام طلبی کی بدولت ہمارے سروں پر ایک بڑا فرض باقی رہ گیا ہے یعنی اردو لٹریچر کو علمی اور سائنٹفک خیالات کے اظہار کا آلہ بناتے۔ قدرت کی گوناگوں نیرنگیوں کی تصویروں اور نقشوں سے اُسے مالا مال کرتے تہذیب و اخلاق۔ تمدن و معاشرت کے اعلیٰ مسائل کو اس کے ذریعہ سے رواج دیتے غیر ملکوں کے لٹریچر۔ آداب معاشرت۔ تاریخ و جغرافیہ اور وہاں کے باشندوں کے عادات و خصائل کے مرقعوں کی اس میں شاعت کرتے اور اس کیلئے دنیا کی قدیم و جدید زبانوں کے بیش بہا معدنیات سے علوم و فنون کے جواہر تحقیق و تلاش کے پُر مدد سمندروں سے دور ہمارے مضامین لانے میں ہماری کوشش

اتنی وسیع نہایاں اور مفید نہیں ہوتیں جتنی اس مناسبت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھیں جو ساکنانِ لکھنؤ اور صوبہ اودھ کے باشندوں کو اردو سے ہے۔

اس فرض کے ادا نہ کر سکنے کا الزام اگرچہ ایک حد تک صوبہ کے اہل قلم حضرت اور ایڈیٹران اخبار و رسائل پر عائد ہوتا ہے۔ لیکن اس میں زرا شک نہیں کہ اہل صوبہ کی بد مذاقی اور علوم و فنون کی سرپرستی نہ کرنے کی قابلِ ملامت و اصلاح عادت اس اہم فرض کے پورا نہ ہونے کی زیادہ تر ذمہ دار ہے۔

غضبِ خدا کا خطہ زردیں اودھ کے دار الخلافہ میں جہاں آتش و تاسخ و دوسروں تیر و حسن و نیم ایسے بالکمال شعرائے اردو نے اپنے زمانہ میں دادِ سخن دی ہو۔ جسے فخر الشعرائے دہلی میرزا غالب نے ”مردمِ چشمِ جہاں“ کے پر معنی لقب سے یاد کیا ہو۔ اور اس کی گزری حالت میں بھی رئیسوں۔ امیروں۔ نوابوں اور تعلقہ داروں کا مسکن و قیام گاہ ہو۔ وہاں اہل صوبہ کی بد مذاقی اور ناقدر دانی کی بدولت ایک بھی رسالہ ایسا نہ ہو جو بنگال۔ پنجاب۔ مغربی شمالی ممالک متوسط اور دکن کے معمولی سے معمولی رسالوں کے مقابلہ میں بھی اردو و علم ادب کے دستِ خزان پر علوم و فنون تہذیب و اخلاق اور تمدن و معاشرت کے لذیذ اور مفید کھانے چن سکے۔

باوجود اس کے کہ ملک بھر میں تنازعہ کی برقی قوت نے وہ اہلِ چل ڈال دی ہے کہ ہر صوبہ کے لوگ شاہراہ ترقی پر صبر و استقلال کے ہتھیار لئے ہوئے علم و عمل کے مضبوط اور تیز و گھوڑوں پر سوار چلے جا رہے ہیں لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ رع چلتے ہیں اس طرح کہ قدم کا نشان نہیں

”الناظر کی اشاعت سے میرا یہ مقصد تھا کہ لکھنؤ میں اس کی عزت اور وقعت اور



گذشتہ عظمت کے مناسب ایک علمی رسالہ قائم ہو جائے جو ایک طرف تو اردو زبان کو وسعت اور ترقی دے سکے اور دوسری طرف لکھنؤ اور اُس کے صوبہ کے سر سے جمالتِ عامہ مراجمِ فقیہہ اور اخلاقِ دیمہ کی مصیبتیں دور کر کے اہل لکھنؤ اور اودھ کو ترقی یافتہ اور سرسبز و شاداب شہروں اور صوبوں کے لوگوں میں ممتاز بنائے۔ یہ کام اکیلا »الناظر« یاس نہیں کر سکتا لیکن اگر لکھنؤ کے روشن خیال حضرات پوری توجہ کریں تو بہت کچھ کامیابی ہو سکتی ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ہمارے تمام مقاصد حاصل ہو جائیں۔

اس خاصہ فرمائی سے میری اصلی غرض یہ ہے کہ آپ حضرات »الناظر« کی طرف اپنی خاص توجہ فرما کے اس صوبہ کا وقار قائم رکھیں۔  
خادم اسحاق علی علوی ایڈیٹر »الناظر«

## حضرت نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر علی کا خط میر مہدی کے نام

سید صاحب کل بہرون رہے تمہارا خط پہنچا یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے اُن کی زبانی سن لو گے میں کیا لکھوں۔ میں نے بھی جو کچھ سنا ہے اُنھیں سنے سنا ہے ان کا اس طرح ناکام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے لیکن میرے عقیدہ اور میرے تصور کے مطابق یہ ہیں جانتا تھا کہ وہاں کچھ نہ ہوگا سوڑنے کی نا حق زیر باری ہوئی چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسہ پر ہوئی تو مجھے شرمساری ہوئی میں نے اس

چھپا سٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں جہاں ہزار  
 داغیں ایک ہزار ایک سہی میر سر فراز حسین کی زیر باری سے دل کھٹتا ہے۔ وہاں کو  
 کیا پوچھتے ہو قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام۔ لوٹا ایسی  
 سخت۔ کال ایسا پڑا۔ وہاں کیوں نہ ہو لسان انیبے دس برس پہلے فرمایا۔ شعر  
 ہو چکیں غالب بلاتیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

سیاں شکارِ بھری کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وہاں عام میں مرنا ہی لائق نہ  
 سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر نشان تھی بعد رفع فنا ہو سمجھ لیا جائیگا کلیات اردو کا چھاپہ کام ہوا  
 اغلب کہ اسی ہفتہ میں غایت اس مینے میں ایک نسخہ بسیل ڈاک تم کو پہنچ جائے۔

کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھپا پا  
 جائے گا۔ قاطع برہاں کے خاتمہ میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں اگر مقدور مساعدت کرے گا  
 تو میں بے شرکت غیر اسکو چھپواؤں گا مگر یہ خیال محال ہے میرے مقدور کی تیاری کا  
 حال مجتہد العصر کو معلوم ہے داند علی کل نئی قدیر۔ خدا کا بندہ ہوں علی کا غلام میرا  
 خدا کریم میرا خاوند سخی۔ علی دارم چہ غم دارم۔ وہاں کی آنچ مدھم ہو گئی ہے۔ پانچ سات دن  
 بڑا زور و شور ہا پر سوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلی میں  
 میں آیا کل رات کو اس کا نو برس کا بیٹا ہیضہ کر کے مر گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔  
 الوری میں بھی دبا ہے الکزنڈر پڈرے شہرہ الکھ صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ  
 میرا عزیز اور ترقی خواہ اور مزاج میں اور مجھ میں متوسط تھا اسی جرم میں ناخود ہوا کہ  
 مراخیر یہ عالم اسباب ہے اس کے حالات سے ہم کو کیا۔

غالب

## مرزا حاتم علی قمر کے نام

مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔  
 ہزار ہا کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ جسبدر میں وصال کے مزے لیا کرو کیا  
 تم نے منجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے  
 جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی۔ نہ  
 کتابوں کا پورا بھجوا یا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاتھ رس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق  
 پانچ کتابوں کے آغاز سے دے آیا ہوں۔ اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی  
 تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے۔ تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح  
 مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟  
 اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط  
 برسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات  
 جلدوں کے اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی؛ اب حضرت ارشاد کریں  
 کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر جلد کارِ یگیروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو  
 مگر ایسا لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان تینتیس جلدوں  
 کے ساتھ یاد و متن روز کے آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔  
 تا خاص و عام میں جا بجا بھیجی جائیں۔

میر اکرام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا ضیا الدین خاں اور حسین مرزا  
 جمع کر لیتے تھے۔ جریم نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے

ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو  
ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے۔ کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے۔ اور ترنم  
پر داز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو محکوم کھایا  
یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں اس کے اس خط کا  
جواب چاہتا ہوں۔ غزل

در دست کش دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا ہرانا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	اک تماشا ہو اگلا نہ ہوا
ہم کہاں قیمت آزمانے جائیں	تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہی خنجر گرم ان کے آنے کی	آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ غمزدگی حسد الی تھی	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گردب گیا ہو نہ تھا	کلام گزرک گیا روانہ ہوا
رہنری ہے کہ دل ستانی ہے	لے کے دل، دلتاں روانہ ہوا

کچھ توڑ مٹے کہ لوگ کہتے ہیں  
آج غالب غزل سزا نہ ہوا

جواب کا طاب  
غالب

# انتخاب از آب حیات



## زبان اردو کی تاریخ

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔ تم خیال کرو گے کہ شاید اس میراث قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ یہیں پھوٹا ہوگا۔ اور یہیں پھلا پھولا ہوگا لیکن نہیں ابھی سرانجام آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا مگر باوجود اس کے مہذب قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کھنسا رہا ہے چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدال ہوانے بلائے جان ہو کر ہمیشہ اسے غیر قوموں کی گھردور کامیدان بنائے رکھا ہے۔ پس ورنہ یان فرنگ کہ ہر بات کا پتا بتاں تک نکالنے والے ہیں انہوں نے زبانوں اور قدیمی نشانوں کو ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے یہاں آکر آہستہ آہستہ کل ملک پر قبضہ کر لیا یہ فتحیاب غالباً یچوں۔ یچوں کے میدانوں سے اٹھ کر اور ہمارے شمالی پہاڑ

الٹ کر اس ملک میں آتے ہوں گے۔ اس زمانے کے گیت اور پُرانی پُرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر۔ ہمت کے پورے۔ صورت کے وجہ۔ رنگہ کے گورے ہوں گے۔ اور اس زمانے کی حیثیت کے بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں زمین گیر ہوئے۔ اس قوم کا نام ایرین تھا اور عجب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنی اصل سے کچھ کچھ بدل کر سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان میں اگر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا۔ ایران میں تاج کیانی پرورش کا دیانی لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لیکر چین کو نگارخانہ بنایا یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا روم کی عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈالی آندلس پہنچ کر چاندی نکالی یورپ سے خبر آئی کہ کہیں دریا سے چھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے۔ کیس پہاڑوں سے وصات کھودتے کھودتے نل بے بہا نکال لائے۔ تب اصلی رہنے والے کون تھے؟ اور ان کی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی زبانیں کہیں کچھ کچھ اور کہیں بالکل اختلاف رکھتی ہے۔ اور یہی حال دراضلاع ہند میں ہے۔ اسی طرح اس عہد میں بھی اختلاف ہوگا۔ اور اس عہد کی نامی زبانیں وہ ہوں گی جن کی نشانی تامل اور تیلنگو وغیرہ اضلاع دکن اور شرق میں اب تک یادگار موجود ہیں۔ بلکہ اس حالت میں بھی ان کی شاعری اور انشا پر داری کہتی ہے۔ کہ یہ گنہلی کسی لذیذ میوے کی ہے اور سنسکرت سے انیس لگاؤ تک نہیں۔

فنیابوں نے ہندو کش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے۔ اصلی باشندے کچھ تو رٹے مڑتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے امن میں گھستے گئی ہوں گے کچھ بھاگے ہوئے وہ دکن اور شرق کو ہٹتے گئے ہوں گے

کچھ فحشیا بوں کی غلامی اور خدشہ کاری میں کام آئے ہوں گے۔ اور وہی شور و کھلا سے ہو گئی  
چنانچہ اب تک بھی ان کی صورتیں کبے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔

مدت دراز تک ایرانی بھائیوں کے کاروبار بہت دوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے  
جڑے رہے ہوں گے یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد اور اس کے زمانے کی  
تقسیم برہما کے زمانے سے اور اس کے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہے اور چاروں بھائیوں  
کا برابر ہوتے لگتا ہے یہاں بدھ نے آئین توڑا۔ وہاں زروشت کے مذہب نے اسے جلا کر خاک  
کیا مگر ہندوؤں نے بدھ کے بعد پھر اپنے حال کو سنبھال لیا۔ ایرانی اپنی بد حالی کو نہ سنبھال سکے  
چاروں بھائیوں کی تقسیم اور ان کا الگ تھلک رہنا دور کے دیکھنے والوں کو غور کے  
لباس میں نظر آیا مگر حق پوچھو۔ تو یہ کچھ بری بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے  
صاف الگ الگ چلے آتے ہیں۔ جو ہندو ہو گا۔ اس باپ دونوں کھڑن سے خالص ہو گا۔ اور  
برابر اپنی قوم کا پتا بتا سکیگا جو دو غلام ہو گا اس کا سلسلہ الگ ہو جائیگا۔ اگر یہ قیدیوں کی سختی  
کے ساتھ نہ ہوتی۔ تو تمام نسلیں غلط ملط ہو جاتیں بنجیب العرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈ سے نہ  
ملتا۔ فحشیا بوں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے  
چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر چکے تو خیال ہوا کہ شور و روں کے ساتھ آٹھ پیر  
بات چیت رہتے سہنے اولین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دو غلی ہو جائے گی۔ اس واسطے  
کہا کہ ہماری زبان زبان الہی ہے۔ اور الہی عہد سے اسی طرح چلی آئی ہے۔ چنانچہ اس کے قواعد اور  
اصول باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے جن میں نقطے کا فرق نہیں سکتا۔ اسکی پاکیزگی نے غیر  
لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبہ سمجھا۔ اور سوا برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک نہ کرنا  
بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یاد

کا خالص نمونہ نمایاں کرتی ہوگی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے ان کے پاس بانی مذہب بھی نہ رہی۔  
 اسی میناد پر فحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا جس کے معنی آراستہ  
 پر آراستہ یعنی منہرہ مصفاہ مقدس۔ جو چاہو سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس تھے  
 کہ بزرگان دین ہی اسے چھائیں تو بڑھائیں بلکہ اس طرح پکار کر بڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر  
 کے کان میں آواز پڑے اس زبان کا نام دیو بانی ہوا۔ یعنی زبان الہی۔ زبان شاہی۔ وید  
 کے سنہ ترتیب جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے۔ ۴۴ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے  
 ہیں۔ اس وقت ان فحیابوں کی باتیں اس ملک اور ملک الوں کے ساتھ ایسی سمجھ بوجھ سے نہ ہوتی  
 میں پیدہ پیدہ مسلمانوں کی حالتیں۔ ان کی سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں  
 میں اگر کچھ اور ہو گئے ہوں گے اسلئے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ ہی کرتے  
 نہ باتیں خود بخود پیدا ہوئی ہوں گی جیسے اسلام کے بعد اردو چنانچہ مالگھی رہا ہی اسو۔ یعنی  
 ہمارا شہری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سینکڑوں  
 لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مگر گڑبڑ ہوئے ہیں۔ دیکھا پراکرت کے معنی ہیں طبیعت  
 اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی ہی کستاہی۔ اسکے علاوہ  
 سنسکرت مذہب اور قدس اور پراکرت غیر مذہب کو نکلو کہتے ہیں پس ایسی ہی باتوں کا معلوم  
 ہوتا ہو کہ وہ نہیں لوگ تھے۔ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انہوں نے کیا۔ سمجھ کر کیا ہی۔  
 راجہ بھوج کے عہد کی نامک پشکیں کہتی ہیں۔ کہاں عہدوں میں علمی۔ کتابی اور درباری  
 زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا تھا۔ اس لئے گفتگو میں ہندوؤں کو  
 بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی۔ پراکرت صاف سنسکرت کی سی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں  
 ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔



سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی پھر بھی منوسمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد تکھی گئی تھی۔ اس میں اور وید کی زبان میں صاف فرق ہے۔ اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چکر پار بیٹھا تھا۔ اس لئے نقصان کا بہت خطر نہ تھا کہ دفعہ ۵۲۲ برس قبل عیسوی میں بد مذہب کے بانی شاکی منی پیدا ہوئے۔ وہ ملکہ دیو سے اٹھے تھے۔ اسلئے دیو کے پراکرت میں دعوت شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا عورت مرد سے لیکر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیو کی زبان تھی۔ ان کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم حکومت۔ رسم و رواج۔ دین آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور ملکہ دیو کے پراکرت کل دربار اور کل دفعتوں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یادری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر انہی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب کی زبان مالگدی ہی مالگدی ہو گئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوت بڑھے اور باؤنڈلند کس یا لکھ بڈلے عالم سے تمام زبانوں کی اس مالگدی ہو۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے۔ اصل میں انکی بھی اور قادر مطلق بودھ کی زبان بھی یہی ہے۔ اسکی صفت و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں خدا کی قدرت دیکھو۔ جو لوڈی تھی وہ رانی بن بیٹی اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تختناہ اسو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی خست کیا اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی خست ہوئی۔ شکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارا ٹوٹا ہوا پھرا پھر چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے

عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی۔ آج تک لوگوں کی آنکھوں کا آجا لاسے۔  
اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت  
بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا۔ اور پرکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اس عہد میں جو کالمیلاس  
ملک الشعرا نے شکنتا کا نام لکھا ہے۔ سبھاس دیکھ لو۔ بادشاہ احرار اور پنڈت سنسکرت  
بول رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی کچھ کتا ہے تو پرکرت میں کتا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعے کی وہ زبان  
تھی جسے ہم آج برج بھاشا کی زبان کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر قطعے میں اپنی اپنی  
عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لئے۔  
باعث برکت تھی۔ کہ وقتاً زمانے کے شعبہ ہاں نے ایک اور رنگ بدلا یعنی اسلام کا قدم  
ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا۔ اور اسی وقت کی زبان  
کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی زند و استا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک  
دادا کی اولاد ہیں۔ مگر زمانے کا اتفاق دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کئی ہزار برس  
کی بھڑی ہوئی بنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسرے کی شکل نہیں پہچان سکتی۔  
ہندوستانی ہن کی کمانی تو سن چکے اب ایرانی ہن کی داستان بھی سن لو کہ اس پر  
دہاں کیا گزری۔ اول تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا شاید وہ لفظ  
ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی ہن  
پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گزرے۔ اسی طرح اسپر بھی دہاں انقلاب پڑتے رہے اور  
باوجود اسکے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی ہن جب اس ملک میں جا کر بسی ہوگی۔ اول تو مدت تک اُن کے مذہب -  
 رسم و رواج اور زبان جیسے تھے۔ ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر اُس زمانے کی کوئی تصنیف  
 ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا جتا ملتا ہے۔ تو زروشت کے وقت سے ملتا ہے۔ جسے آج تھینا  
 ۴۴ سو برس ہوئے اس نورانی موجد نے شعلہ آتش کے پر وے میں توحید کے مسئلے کو رواج  
 دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازووں میں زور پکڑا اور ایران سے ٹھکڑو سو برس کے قریب  
 اعراف و جہان کو دبا مارا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے  
 اس واماں کو تہ و بالا کر دیا جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے وید شاستر پر پڑی تھی۔ وہاں وہی  
 مصیبت زندہ و استا پر آئی۔ چنانچہ جس آگ نے زروشت اور جاماسپ کے تبرک ہاتھوں  
 سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتا شنے تاج اُتار کر کہا جس کی درگاہ میں  
 اسفندیار نے گزرا اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آتش مشیر سے بھائی گئی۔ اور آتش خانے  
 راگم ہو کر اڑ گئے۔ افسوس یہ کہ زند و پارہ کے ورق و ورق برباد کئے گئے۔ اور ہزاروں  
 کتابیں فلسفہ الہی اور علوم و فنون کی تحیں کہ نابود ہو گئیں۔ جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا  
 تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھا دیا ہوگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں پار تھیا والوں کا غل  
 دخل ہو گیا۔ وہ ایران جیسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشانِ اسلامی آتا تے تھے اور  
 تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے۔ وہ برس تک ظفر یا بوں کے قبضے  
 میں دبا رہا اور زند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

سندیس میں پھر تین بیجان میں سانس آئی اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے  
 چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک مملکت کی قدامت کے ساتھ بچھے ہوئے مذہب  
 کو بھی ریش کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں پڑے پڑے اور اق

پریشاں ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ انہی کی کوششوں کی کمافی تھی جو پھر سارے چار سو برس  
بعد علم اسلام کے آگے قربانی ہوئی۔ اس معاملے میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ  
نہ بھولنا چاہیے۔ کیونکہ باوجود تباہی اور فغانہ بربادی کے جو پرانا کاغذ کسی با اعتقاد کے  
ہاتھ آیا۔ وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا۔ کہ بندر۔ سورت۔ گجرات وغیرہ ملکوں میں  
آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے۔ وہ ان تصنیفات کا  
بقیہ ہے۔ جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتب مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی  
نہیں ثابت کرتی۔ بلکہ ان کے اتحاد اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں جو چار برن منڈوں  
میں پیش ہی زبان میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی حیوانات بے آزار کار نامگانہ  
عظیم تھے۔ تاج کا سلسلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش۔ آب۔ خاک۔ باد۔ ابریز بجلی۔ گرج ہوا  
وغیرہ وغیرہ انہی کے لیے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا جس کے اظہار عظمت کے لیے خاص خاص  
 طریقے تھے۔ یاد الہی کے زمرے تھے جسکو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ  
ہے جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں بھی یاد الہی کے گیت ہیں۔  
فارسی مروجہ کے چند الفاظ مثیلاً لکھتا ہوں کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پتر	بوم	بھوم	با	باؤ
پتور	پتر	اسپ	اشو	بہم	بجھے
ماور	ماتر	برادر	بھراتر	خاشاک	کشیا
زانو	جانو	دختر	دوہتر	خر	کھر
بار	بھار	انگشت	انگشت	+	+

ایرانی بن پران میں ہے اسلام کے آتھ سے دو صدیہ گزرا تھا جو کہ یہاں دو سو برس بعد گزرا اور اس سے اس کی حیثیت بائبل کی جیسی تھی۔ ہر حال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے۔ وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے۔ اور ہندوؤں سے ہندی کے الفاظ ملا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے۔

۱۔ اور سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی اس میں ملکشوں کو دس کماں؛ انہما برج بھاشا نے اس بن بلائے مہان کو جگہ دی۔ دھرم والہ ہندو سالہا سالہا ملکیش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متغیر رہے۔ مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے۔ کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں غرض اٹھ بھرا ایک جگہ کارہنہا سنہا۔ لین دین کرنا تھا لفظوں کے بولے بغیر گزارا نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے۔ اور اسکے کسی سبب ہیں۔ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتیں ہیں۔

۲۔ اکثر معانی لیے ہوتے ہیں۔ کہ انہیں ان ہی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے۔ پھر بھی نہ وہ مبرا آتا ہی۔ نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہی۔ اس صورت میں گویا قانون زبان اور بین بیان مجبور کرتا ہے۔ کہ یہاں ہی لفظ بولنا چاہیے۔ دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔

۳۔ جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ اس لطف کو جانتے ہیں کہ جب غیر زبان والے ایک جگہ رہتے ہیں۔ تو کبھی کام کاج کی شدت مصروفیت میں کبھی اسی عام میں ضروری بات جلدی کہہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دو

کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اس کے گزارہ نہیں ہوتا۔

۴۔ پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ تو اکثر پیار اور محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کو جگہ جیتے ہیں۔ اسی طرح انکی زبان مہمان کو جگہ لگاتے ہیں۔  
۵۔ بڑی بات یہ ہو کہ فحیابوں کے اقبال کی چمک ان کی بات بات کو لباس و ستار رفتار گفتار کو بھی ایسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہو کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اور لوگ اسے فقط اختیاری نہیں کرتے۔ بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پھر اس میں بہت سے فوائد بھی عقلی و دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

اس زمانے کی عہد بعد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہو۔ البتہ جب اللہ علیہ السلام شہاب الدین غوری نے رائے تھورا پر فتح پائی۔ تو چند کوی (ایک نامی شاعر) نے یرتھی راج راسا لکھا اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنا جلد عربی و فارسی کے اثر کو قبول کر لیا ہر صفحے میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں یہاں کی بجا شاہی کچھ اور بجا شاہتی میں نمونہ تصنیف مذکور کا دکھاتا ہوں۔

पत्र प्रथी महल प्रिथी राज मंगियारी हनिवाजीव  
हनी दाजी मंगियारी २२ रत्नी राज محل अत्ती पत्र

६ पत्र परवर दिगार पैगाम दयलाह करीम कबार सुल्लान  
سرعان کریم کو اور پیگام دیلاوہ پروردگار پتر

جلال الدین شاہی سورتان سہاب الدین اہل ہندو پادشاہ مسلمانان  
مسلمان الہ اپا سہاب دین سرتان چایا جلال دین

مہدین دین بھی سہ دتہ اتنا کدھ کھن لاگو بادشاہ سورتان  
سرتان بادشاہ کھن لاگو تہر اتنا بھیم دتہ مدد ان

پر بھرے دیوار دیوانہ لڈیا بادشاہی پر مہدیا خوراک اہل م  
عالم فلک منڈیا ویر بادشاہی چندی دیوان دیواروں پر

اہل لڈی جیوت پادشاہی ہجرتی رتھ دیوار سائنہ رتھ مہل  
میں مردان اس کھیل خدا سے حجرت پائی بھو دان جیوت ملوی

سینہ بانی ہاں بادشاہی دیوار اہل اہل  
او چالی چادر دے باب دانی رتھو اہل

اتنے سورتھ کا کھن پست کھن ویلکس کے لڈی رتھ  
رہ کیلاس دلاس کھل پیں پھراں کا ملک اتنے

رہدہا گھر  
گھر کھن

۹۲ پست پادشاہی پری پادشاہی ہاں ہنن سورتان کھن سلا م  
سلام کرم سلطان دینی بار پر بھی راج گھالی پائے پتر ۵۲

تہہ ہاں پری پادشاہی سورتان

سلا نے اہل پری تہہ دار

یہ اگرچہ مختلف جگہ کے ٹکڑے ہیں مطلب ان کا اصل کتاب کے دیکھنے سے

مگر حرف شناس آدمی بھی جان سکتا ہو کہ یہ یہ لفظ عربی فارسی کے اس میں موجود ہیں محل  
 پر نگار یکجا مذبہ پیام اکرم سلطان (یعنی سلطان) بات شاہ (بادشاہ) دیوان فلک (خلق عالم)  
 حجرت (حضرت) ملک۔ پیران (رفزان) سلام۔ ترجمے اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان  
 کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بتا جاتا ہے۔ سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ  
 کریں۔ تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجبوراً خیالات کا ادراک کے امتداد و لوازمات  
 کا اس ایک لفظ سے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہماری سطر بھر سے پورا  
 نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوی اپنی نظم میں سلطان کی جگہ اگر راہبہ بلکہ ہمارا راہبہ لکھ دیتا تو بھی جو  
 صفات اور اس کے لوازمات نیک یا بد۔ رحم یا عدل۔ زور یا ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھاتا ہے  
 وہ بات راہبہ سے ممکن نہیں۔ اسی طرح لفظ سلام کہ اس کے مطلب کا حق خواہ  
 ڈنڈ و تخواہ یا رام کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے سینکڑوں  
 لفظ ہیں۔ اگر ترجمہ کریں تو سطروں میں بھی مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی  
 شخص اپنے دوست سے کہتا ہو "لاٹ صاحب چھ نیچے اسٹیشن پہنچیں گے۔ پروگرام کے بموجب  
 شہر کی میر کریں گے۔ پانچ بجے آنا۔ وہیں چل کر تماشا دیکھیں گے۔" اب خواہ مخواہ بگڑے  
 مگر یہ اصل لفظ آپ اپنے معنی سننے والے کو سمجھا رہے ہیں۔ کئی کئی سطروں میں ترتیب کے  
 جائیں تو بھی حق مطلب بجا نہ لاسکیں گے۔ آخر پتہ دے صدی عیسوی میں کہ سکندر لاد  
 کا زمانہ تھا۔ اتنا ہوا کہ اہل کالیستہ فارسی پڑھ کر نہا ہی دفتر میں داخل ہوئے۔ اور اب ان  
 لفظوں کو ان کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اگر کے عہد سے کہ مسلمان  
 شیردشکر ہو گئے۔ یہ نوبت ہوئی۔ کہ ادھر بادشاہ اور اس کے اعلیٰ درجے کے اہل دربار  
 جہ و دستا کے ساتھ طیارہ میں کوئلہ حافظ لیا اور طیارے میں کرکڑ کی ڈال دی گئی اور وہ ہندوستان



بلکہ راجہ ہمارا جہ ایرانی لباس پہنتے۔ اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے بلکہ مرزا کے خطاب کو  
بڑے شوق سے لینے لگے۔

اب جس قدر ممکن ہر عہد بعد کے زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں۔ امیر خسروؒ کے  
میں قوت ہوئے۔ اُن کی ایک غزل نظم۔ اُردو کی تاریخ میں دیکھو۔ جس کا پہلا مصرع  
زماں سکین مکن تغافل درائے میناں بنائے بنیاں الخ اس سے تمہیں کچھ  
حال اس وقت کی زبان کا بھی معلوم ہو گا خالق باری بھی انہیں کے مخلوقات کو  
جو باریک میں اشخاص اُس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ سمجھ سکتے ہیں

بیا برا در اُدرے بھائی بنشیں مادر بیٹھ رسی مالی  
ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دو ہر دں کی بھر میں کہتے ہیں ۵

لودھ پھٹکری مردہ رنگ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک  
ایون چنا بھر مرچیں حیار اُرد برابر تھو تھو سا ڈار  
بوست کے پانی میں پوٹلی کر د نرت پٹرنیوں کی ہر سے

نظم اُردو کی تاریخ میں اُن کی عمدہ پہلیاں کہہ مگر نیاں۔ دو نسخے۔ اصل میں  
لکھ دئے ہیں انہیں دیکھو ادنیال کو کہ بحرین دو ہر دں کی ہیں مگر فارسیت کشف ایازہ دکھا رہی ہے  
ہندو شاہوں کے دو ہرے برج بھاشا میں ہیں۔ مگر عہد بعد کی زبان کا پتا بتاتے  
ہیں چنانچہ سکندریہ لودی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہتے تھے علم میں اُن پر  
تھے گردِ امانت کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر نقیوں کا مت نکالا تصنیفات اُرجع  
ہوں تو کئی جلدیں ہوں۔ اُس کے دیدہ ہر دں میں فارسی۔ عربی کے لفظوں کو دیکھو  
دین گواہ دینی سے دینی نہ آئیو ہا پیر گھاڑی مار لو گا بھیل اپنے ہاتھ

کبیر سر پر سے ہر کوئی کی گھنٹین کوچ بگارا سانس کا بابت ہر دن میں  
گرو نامک صاحب کی تصنیفات میں بہت کچھ بلخی فارسی ہی اگرچہ خاص قطعہ پنجاب کی زبان ہی گزرتا  
ہے۔ تنہا سے ان کے کلام میں عربی۔ فارسی کے لفظ ہیں اتنے کسی کے کلام میں نہیں اور جو کہ سنہ ۱۵۸۵ء  
کے بعد فوت ہوئے اس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ مولانا  
ماس ماس سب جو تیار نہ تو کھلایا۔ نامک شاعر ایلوکت ہے۔ سچے پروردگار  
بلکہ اکثر چیزیں طہیۃ عبادت کے طور پر ہیں۔ ان میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر  
آتے ہیں۔ چپ جی کے دو فقرے دیکھو: **دیاں جاؤں آن ایک بار بد تو سہ سلامت جی تر نکار**  
مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے چنانچہ سولھویں صدی  
عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جالئی ایک شاعر ہوا۔ اس نے پند و نعت کی زبان نظم کی  
اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس  
ملک میں ہر گز بلیائی زبان کو پسند نہ کرتے تھے اس کی گجری بھی ہندی رکھی ہے۔ اور درق  
کے ورق اُٹتے جاؤ۔ فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک  
ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے۔ اور ہر جگہ مل سکتی ہے۔ اس کے نمونہ نہیں لکھتا  
**ہمایوں** نے جب گجرات دکن پر فتح کئی۔ تو سلطان بہادر دہاں کا بادشاہ تھا  
اور جاپانیر کا قلعہ بڑا تنگ تھا کہ سلطان خود بھی اکثر وہاں رہتا تھا۔ اور تمام خزانوں و دولتوں  
وہیں رکھتا تھا محاصرے کی وقت رومی خاں میئر نش (بادجو دیکر کمال معتبر اور صاحب منظر و نظر  
سلطان کا تھا) ہمایوں سے مل گیا۔ اور قلعہ تمام نقائص اموال اور خزانہ بیجا بسمیت ہمت  
کے قبضے میں آیا سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا۔ اور سچکھڑا  
کا جواب دیتا تھا۔ سلطان اسے لایا چاہتا تھا کہ سونے کے پتھر میں رکھتا تھا۔ اور ایک دم جلدانہ

کرنا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا جب دربار میں لائے۔ تو رومی خال بھی موجود تھا۔ طوطے نے  
 دیکھ کر پہچانا اور کہا ”پھٹ پانی رومی خال نمک حرام“ سب کو تعجب ہوا اور یہاں پر نے  
 کہا ”رومی خالی چھ کنہ کہ جانور است۔ درندہ زبانش ہے بریدم“ اُس نے شہزادہ انگلیس بھی کر لیں غرض  
 اس نقل سے یہ ہو کہ اُس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ ضرور چڑھے ہوئے تھے  
 جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا۔ جانور چونسا ہو گا۔ وہ ہی بولتا ہو گا۔  
 سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلمیسیؒ اس برہمن منلع باندہ کے رہنے والے پنڈت  
 بھی تھے شاعر بھی تھے فقیر بھی تھے۔ انھوں نے رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا  
 کہ وہ لاشانی کتاب مقبول خاص عام ہوئی۔ اُن کے دہڑن میں بہت اور کتاب مذکور میں  
 کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود ہیں دہرا رامائن ۵

شکارے سیوک سل چلے سوامی رکھ پائے	گھر تو تو دہن باگ و برید براد یو لگاے
گھر بواں، بچن ہٹ بولے	کتنی بھنگ کھ بھی کھیلے
رام انیک گریب نو اے	لوگ بید برید براسے
گنی گریب گرام نرناگر	پنڈت موٹے میں اوجاگر

ایا کو یا لے کر کر لے ہاتھ تلمیسیؒ اس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات  
 اپنی دنوں میں سورا اس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول  
 خاص عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہو گا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہو گا۔

ایا و حام دھن دتتا باندھیوں ہوں اس ساج	یعنی ساز
سنت بھی جانت ہوں تو نہ آیا باج	یعنی باندہ آیا
کھیت بہت کا ہے تم تالے نہیں سنی آواج	یعنی آواز

یعنی جاز

دیونہ جات پارا تر آئے چاہت چڑھیں حجاج

تہجے پارا تار سور کون مساراج برج راج

یعنی غریب نواز

تیں کرت کست پر بھوتم سوں سدا گریب نواج

خیال کرد۔ کہ جب یہ بزرگان نہ رہیں اپنے دہڑوں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے۔ تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

آخر میں جن دو خوبی بوج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوانی کی قدر دانی سے ظاہر ہوئی انھوں نے ایک ایک اشترنی دہرہ کو می اور گنڈان بند تو کو انعام کیو دی اور نواح ملی میں شوق بھیا اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہو گا؟ ظاہر ہو کہ کئی سیریس سے اسلام آیا ہوا تھا جن کے باپ دادا کئی کئی پشت یہیں کی خاک سے اٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے انہیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سرشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی بھج بھاشا بولنی ہوتی ہوگی۔ یا زہ لایت آدمی اپنی آدمی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوئے گئے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں ہے امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور کہہ مکر تیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ سنہ ۷۰۰ھ میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوئے گئے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کوشش اور محبت سے بولتے تھے شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ انگلی زبان پر زیادہ آجاتے ہوئے۔ اور جتنا یہاں ہما سہتا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا۔ اتنا ہی روز بروز فارسی ترک کی گئی صنعت اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہو گا۔ رفتہ رفتہ شاہجاں کے زمانے میں کہ اقبال تنویر کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف۔ اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجارت وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر

کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازار شکر کو کہتے ہیں۔ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا اُس کو فقط شاہجہاں کا اتہال کہنا چاہیے۔ کہ یہ زبان خاص عام میں اس کے اُردو کی طرح منسوب مشہور ہو گئی ورنہ جو نظم و شعر کی مثالیں بیان ہوئیں۔ ان سے خیال کو وسعت دیکر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہو گا۔ اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہو گا۔ چند کوئی کا کلام مل گیا۔ اُس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا شعر مل جائے۔ تو اس میں بھی ضرور دیکھیں گے۔

بیا نہائے مذکور سے یہ بھی ثابت ہو کہ جو کچھ ہمیں ہو کسی تحریر یا ارادے سے نہیں ہوا۔ بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی مناسرا دافع ہوئی ہے۔ کہ ہر زبان کو مل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آری۔ اس سے مل گئی۔ عربی۔ فارسی آری اُسے لیس۔ لہذا گماخیر مقدم کیا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ سے رہی ہے۔ گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے لٹریچر کو انیسٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ ریختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی۔ پریشان چیز چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اسلئے اسے ریختہ کہتے تھے۔ یہی سبب ہو کہ اس میں عربی فارسی۔ ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اور اب انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہو گا۔ کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان پر قابض ہو جائیگی۔ چنانچہ میں ایک غنائی نواب اُسے کی گفتگو لکھتا ہوں جسکی پرورش اور تعلیم گھر میں ہی۔ یعنی نہ عربی فارسی کی لفاظی نے اس پر رنگ چڑھایا ہے۔ نہ انگریزی نے۔ ورنہ پھر اہر۔ فقط دوستانہ بتے مکلفانہ باتیں ہیں بڑے آکا کی پیش لینے کل کچری کیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کرتے کے آگے کچھ

قرنی کا مال بیلام ہو رہا تھا کہ ریاں کوٹ اور داسکتیں نئی تھیں۔ کنٹر اور گلاس بھی دلاتی تھے۔  
 مگر ریاں۔ میٹر میں جیسے باریک خوش رنگ تھیں۔ میں نے کہا۔ چلو کوئی ڈھب کی چیز ہوتے ہیں  
 بچھلے اکا بولے جانے بھی دو۔ جس ٹال نے مالک سے وفانہ کی۔ ہم سے کیا وفا کر گچھا۔ آتے ہوئے  
 ریل اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں کبھے مرزا جان چلے آتے ہیں۔ شکر م ٹھیر کر رستے تباہ سے  
 ملے۔ بڑھاپے نے بچارے کا رنگ دپ سب کھو یا ڈھکل ہی نہیں۔ وہ صورت ہی نہیں۔ کیسے  
 گورے۔ چٹے سمیلے جوان تھے۔ لوگ تصویریں اُتر داتے تھے۔ میں نے کہا میاں ہم نے تو بجا  
 تھا۔ تم دکھن سے خوب چاق۔ چونہ منہ منہ بغیر ہو کر آؤ گے۔ تم تو سو کو کو قات ہو گئے غضب کیا  
 اگلا جوین بھی گنوا آئے۔ ٹھنڈا اسانس بھر کے بولے۔ ہائے جوانی۔

فارسی۔ عربی کے لفاظ تو ظاہر ہیں۔ مگر خیال کیجئے کہ قرق۔ چن۔ چاق۔ قاق۔ اکا تر کی۔  
 میٹر نامعلوم۔ بیلام ترنگالی ہے۔ کراٹالی ہے۔ ڈیٹی۔ ریل۔ اسٹیشن۔ کوٹ۔ داسکت کنٹر۔ گلاس  
 انگریزی میں چٹا۔ کھٹا۔ بچابی ہے۔ مگر آنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے کے اور اسی طرح  
 چٹکا بغیر بچلے کے نہیں بولتے۔ وہ اکیلا ہی بولتے ہیں۔ کھٹا۔ بچابی میں عام ہے خاص صفت  
 ساتھ بولتے ہیں بھاتا۔ مڑا۔ اچھو۔ رما۔ ارد میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں۔ بچابی میں  
 باسن کو بھانڈا ہی کہتے ہیں گلا کھو۔ ٹنڈا۔ ارد میں بولتے ہیں۔ بچابی میں کھینچ کر باندھنے کو یا  
 مقبوط کر دینے کو کہتے ہیں۔ مثلاً گھٹ کر باندھو یا گھٹ کر بکڑو۔ بھنا۔ بھنا نا۔ ٹوڑنا اور ٹوڑنا  
 ہر اور اسی سبب سو بچابی میں روپے کے لئے بھی بھنا نا کہتے ہیں۔ ارد میں پہلے معنی متروک ہو گئے  
 دوسرے معنی ہے وہ بھی زیر کو پیش کر کے کہ جاؤ روپے کے لئے بھنا لاؤ۔ اور اس اصلیت کا  
 سراغ یوں لگا کہ فارسی میں روپے کے لئے خوردہ کردن بولتے ہیں۔ ارد میں بھی کہتے ہیں  
 صبح کو روپیہ خوردہ کیا تھا۔ دہر کو دیکھو تو برکت! یعنی سب پیسے اٹھ گئے۔

کسوٹی گھنٹا۔ مراد فرسودہ۔ اُردو میں بالکسر ہے۔ پنجابی میں اس طرح بولتے ہیں کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ کالمفط عجیب ہے۔ کہ انہی کے لہجے کے لئے خاص ہے بہر حال اس سے کسوٹی (گھنٹے کی بٹیا) معیار کا نام ہوا۔ اُردو میں یہی لفظ کسوٹی ہو گیا۔  
 روپ۔ سیملا۔ جو بن۔ گنڈا یا برج بھاشا ہے۔ ان کے علاوہ رور مڑہ کی باتوں پر خیال کر۔ یوسف۔ ہارون۔ موسیٰ علیہ السلام وغیرہ جراتی ہیں۔ کیمیا۔ فیلسوف۔ صطرباب یونانی ہیں۔ اُردو یعنی ماش تامل ہے۔ ننھا یعنی خرد گجراتی ہے۔ تاکو امریکہ کا لفظ ہے۔ یورپ کے رستے ہو کر اکبر کے عہد میں یہاں پہنچا۔

اُردو میں اس وقت نشر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی جس سے سلسلہ ان تبدیلیوں کا معلوم ہو میر جعفر زطل کے کلام کو میں محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانے کا نمونہ کہتا۔ مگر ڈکٹ اعتبار کیا ہوا البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۲۵۰ھ ہجری میں فصلی تخلص ایک بزرگ نے وہ مجلس لکھی۔ اس کے دیباچے میں سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نشر اُردو کی پہلی تصنیف ہے پھر دلیں گوراکھ ایسے کام کو عقل چاہئے کامل اور دیگر طرح کی ہوئے شامل۔ کیونکہ بے تائید صدی اور بے مدد جناب احمدی یہ شکل صورت پذیر نہ ہوئے اور گو ہر مراد رشتہ امید میں آدھ ہند کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا اختر۔ اور اب تک ترجمہ فارسی عبارات ہندی نشر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشہ سمجھتے میں غوطہ کھایا اور بیان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن اس مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الہی دل افکار بہتر از میں آئی۔ یہ بات تینہ طرہ میں دکھائی میر کی شہزادی شعلہ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نشر میں لکھا ہی انہوں نے کہ اس وقت موجود نہیں۔ اس کا اندازہ بالکل یہی ہے۔ لیکن چند فقرے سودا کے ایک دیباچے سے نقل کرتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں۔

”شہر مرزا رفیع“ ضمیر آئینہ دارانِ مہنی کے مہر بہن ہو کہ محقق عنایت حق تعالیٰ کی ہر جو طوطے ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریحانہ در ریحانہ خاتمہ دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہو کہ تجویز سخن سامعہ سبحان رویہ نگار کروں تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ موردِ تحسین و آفرین رہوں۔

قیمت قد شنائی سے پہنچے یہ ہم در نہ دنیا میں خدفت بھی کچھ نہیں گہرے کم  
مضمون سیتے میں بیش از مرغِ امیر نہیں۔ کہ ہونچ تفض کے جوہر زبان پر آیا۔ فریادِ بلبل  
ہو واسطے گوشِ دادرس کے۔ غرض جس اہل سخن کا درِ مہنسی زینت لب ہو۔ سرِ شہرہ حسن  
معانی کا اس کلام کے اُس سے انصاف طلب ہو۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی ہند  
شام سیر کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے۔ تو ہر انسان کے فائوسِ دماغ میں چراغِ ہوش دیا  
چاہیے کہ دیکھ کر کتہ چسپی کرے۔ در نہ گزندہ ہر آلود سے بے اجل کا ہے کہ مرے۔

اس تصنیف سے نمونہ ۳۰ برس کے بعد جبکہ میر انشا، اندھا خاں اور مرزا جاجاناں  
منظہر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہو۔ اُس گفتگو کے چند فقرے بھی قابلِ غور ہیں۔ جو وہاں مثنوی  
سید انشا مرزا جاجاناں سے فرماتے ہیں۔

### سید انشا فرماتے ہیں

”ابتداءً بن صبا سے تا ادائِ ریحان۔ اور ادائِ ریحان سے الے الان شتیاق  
لا لایطاق تقبیل غنہ عالمیہ نہ بجدے تھا۔ کہ سلاکِ تحریر و تقریر میں منظم ہو سکے۔ لہذا بے سہم  
وسیلة حاضر ہوا ہوں۔“

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں  
”اپنے تئیں کون بھی بددظنی سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور جاسست



رواکی ہے۔ لیکن میر غفر غنی کے نام سے ایک گفتگو مسجد انشاء نے دریائے لطافت میں کھلی اسے پڑھ کر تعجب آتا ہے کہ اس صاحب کمال نے یہ زبان کس فصاحت کے قالب میں ڈھالی تھی۔ کہ ان عبارتوں میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہو۔ شاید مرزا جاجا ناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہر ہوگی تقریر کا اندازہ اور ہوگا۔

بہر حال اس وقت تک انشا پر اڑی اور ترقی اور وسعت زبان اُردو کی نقطہ شعرا کی زبان پر تھی۔ جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض اُنکے نقطہ اتنی تھی کہ امرا و اہل دول سے انعام لے کر گزارہ کریں یا تفریح طبع۔ یا یہ کہ ہجتموں میں تحین و آفریں کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی فقط نظم میں۔ نثر کے حال پر کسی کو ملامت توجہ نہ تھی کیونکہ کارروائی مطالبہ مزدوری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو تھوڑے عرصے میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے۔ اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی۔ کہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ واولینے کا شوق ہوا میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اُردو میں لکھ کر نو طرز مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی۔ ۱۲۹۹ھ ذی القعدہ ۱۲۹۹ھ آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

ادھر تو یہ چو پچال لڑکا شعراء کے جلسوں میں اور امرا کے درباروں میں اپنی بچپن کی شہینوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پر درہن لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ نظر باز نہ کیا کہ لڑکا ہونا ہی ہے۔ مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کی زبان سیکھنی۔ جب سے چنانچہ

۱۶۹۹ء میں میر شیر علی افوس نے باغ اُردو اور ۱۷۲۲ء میں آرائش محفل لکھی  
میر امن دہلوی نے ۱۷۲۲ء میں باغ دہارا راستہ کیا اور اپنی دلوں میں اخلاق محسنی  
کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اُردو لکھی ۱۷۲۸ء  
میں شری للوجی لال کوئی نے پریم ساگر لکھی اور بیتیان پکیسی جو محمد شاہ کے زمانے میں  
سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اُردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی لیکن  
اس تفارہ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں  
نے ۱۷۲۲ء میں قواعد اُردو لکھ کر ایجاد کی ہٹنی میں طرافت کے بھول کھلائے۔

عجب لطف یہ ہے کہ زبان اُردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا  
ہاتھ اُس کے سر پر رکھا۔ یعنی ۱۷۲۲ء میں مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن شریف  
کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ بعد اس کے مولوی اسماعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہل اسلام  
کی ہمائش کے لئے اُردو میں لکھے۔

۱۷۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل  
دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخبار دن کو آزادی حاصل ہوئی ۱۷۳۷ء میں اُردو  
کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور بعد اس زبان کا پہلا اخبار تھا۔ کہ میرے والد مرحوم کے  
قلم سے نکلا۔

عرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس محاذ سے کہ ملکی زبان یہی ہر دفتری  
زبان بھی تھی میری اُردو نے اہمیت آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے بٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا  
شروع کیا تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انہی کی زبان میں انگریزی  
علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ ۱۷۴۲ء سے دہلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمہ ہونے

گئے اور ضرورت علمی لفاظ ہم پہنچانے لگی۔ خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہودہ زبان کیا اور اُس کی وسعت میدان کیا۔ البتہ اب اُمید کر سکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلے میں کوئی درجہ پائے۔

اُردو اس قدر جلد رنگ بدلی رہی ہو کہ ایک مُصنّف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے۔ تو زبان میں فرق پائیگا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے۔ یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے۔ اس کا سبب یہ ہو کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی ممالکِ فرنگ میں ایسے نکلے ہیں۔ کہ زمانہ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی فارسی سنسکرت، بھاشا وغیرہ جو کہ اُردو کے بزرگ ہیں ان کے خزانے میں اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں، اور اس میں ہم اُردو بچاری کے افلاس پر چنداں تعجب نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ ہندو مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں۔

(محمد حسین آزاد)



## سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے۔ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے؟ جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا ایسی چیز ہے۔ کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے وہ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے ہم کو انسانی حالات پر نظر کرنی چاہیئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ تو وحشیوں میں۔ شہریوں میں۔ سب میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند یا بے کھو۔ کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی کو بُرا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے۔ کہ اُس برسی چیز کی حالت کو۔ ایسی حالت سے تبدیل کر لے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے۔ جو انسان کے ہر گردہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش مبادلہ انسان میں قدرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے اچھا اور بُرا اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا

اور برقرار دینے کے مختلف ایسا بخلق اور خلقی۔ ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ قوموں کی سولریشن میں اہتمام پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہو اور داخل تہذیب جانتی ہو دوسری قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہو۔ دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے یہ اختلاف سولریشن کا قوموں کے باہم ہونا ہے۔ اشتخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر رہتا ہو۔ تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات۔ اُنکی مسرت کی باتیں۔ اور اُن کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں پیدا ہوتے ہیں۔ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہوئی۔ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی سولریشن ہو مگر جبکہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولریشن کی اُن مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر و خیال و داغ سے۔ اُن کو تہذیب سے جذباتی تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہی جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہرتا ہے۔ اور جس کے باعث خواہش تبادلہ تحرک میں آتی ہو۔ اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہو جو سولریشن کہلاتا ہو۔ پس

سولہ لکھ کی مختلف حالتوں کا فیصلہ ۱۴ باب کر سکتے ہیں۔ جن کے سبب سے اچھے اور بُرے خیالِ دل میں بیٹھتا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات اور علمِ طبیعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو رد و رد و ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولہ لکھ بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی۔ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں۔ جیسے کہ ہم ابہوں سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو۔ کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں کی اخلاقی ہوں یا مادی۔ یکساں تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کر لے کا سب کو یکساں خیال ہے ہنر اور اُس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم نہ ہو اور نہ باقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت تر و نور بناتی ہے۔ نہ تربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان ہمہ پہنچاتی ہے۔ نہ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں نہ تربیت یافتہ قومیں جاؤردں کے خوبصورت اور رنگین پٹوں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشگھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے نہ تربیت یافتہ بھی اُس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور

عالمی شان یافتے ہیں، انہیں چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتر بیت یافتہ قوموں کے جھنڈے اور ان کے رہنے کے گھر پہنے۔ درختوں پر باندھے ہوئے۔ انہیں زمین میں کھود دی ہوئی چوبیس بجی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں تمدن کے قاعدے عیش و عشرت کی جنہیں خاطر و ملازمت کے کام اخلاق و محبت کی علامتیں۔ دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات بھی۔ تربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں ان میں زیادہ پہلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ ناتر بیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ وہاں دلی خوشوں اور اندرونی جذبول کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کہتی ہے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتر بیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی اول اور آواز کی پھرت، اُس کا گناہ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھیکر اور اُس کی بچ۔ اُس کا بھاؤ اور باتوں کی دکھاؤ۔ زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتر بیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی خوش کی مدد میں ہیں۔ وہ لے اور نال اور راکہ اُن کی کو نہیں جانتے۔ گروں کی لہرائی کی لے۔ اور دلی خوش کی بچرک اُن کا ناں ہے اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا۔ طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا۔ رول کی بے تابی سے جھکنا اور پھر خوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گونا گت اور غن خنیا گری سے خالی ہو مگر قدرتی جذبول کی ضرورت تصور ہے۔ دلی جذبول کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح ہم تہذیب کا قدرتی

لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں۔ اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا اوتی سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اسی سے تہذیب بھی متعلق ہو پس ہولنریشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو دیکھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا اخلاق، معاملات، معاشرت، تمدن اور علوم و فنون کا بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہونچانا۔ اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشنستی جسمانی خوبی۔ اصلی تمکین حقیقی وفار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہو جس سے دشمنانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

(سید احمد خاں)





# زبان گویا

اے میری بیل ہزار داتان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری  
 نقاصد! اے میری ترجمان! اے میری دکیل! اے میری زبان۔ سچ بتا۔ تو کس حجت  
 کی ٹھنی! در کس جن کا پودا ہے۔ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا تیرے ہر پھل میں ایک  
 نیا فرما ہے کبھی تو ایک ساحر فوں سا نہ ہو جس کے سحر کا رد نہ جادو کا آثار۔ کبھی تو ایک فنی  
 جان گذار ہو جس کے زہر کی دادر نہ کاٹے طمانتر۔ تو وہی زبان ہو۔ کہ بچپن میں کبھی اپنے  
 دھڑرے بولوں سے بغیر دل کا جی لکھاتی تھی۔ اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا  
 دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے۔ کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا  
 شکر کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک  
 کھیل ہے۔ جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزار دل دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگڑنے والی! اور میرے گہڑے کاموں کی سوار نے  
 والی۔ روتے کو ہنسانا اور ہنسنے کو رولانا۔ روٹھے کو منانا اور گہڑے کو بنانا نہیں معلوم  
 تو نے کہاں بیکھا؟ اور کس سے بیکھا؟ کہیں تیری باتیں پس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں  
 تیرے بول شریعت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں قتل۔ کہیں تو زہر ہے اور  
 کہیں تریاق۔

اے زبان ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں

نقھان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے تیری اہم "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں۔ اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اسے زبان انودیکھتے ہیں تو ایک پارہ گوشت کے یوا نہیں۔ مگر طاقت تیری نمونہ قدرت الہی ہے۔ دیکھ۔ اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے۔ اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر۔ اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہو۔ اور روح کی اپٹی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشے نہ چڑھا۔

اسے زبان اتیرا منصب بہت عالی ہے۔ اور تیری خدمت نہایت ممتاز کہیں تیرا خطاب کا شیف اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانہ غیبی ہے۔ اور دل اس کا خزانہ انجی۔ جو عمل اس کا قفل ہے۔ اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول۔ اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے۔ اور مرشد برحق تیرا نام خیر دام اس نام کو عیب نہ لگانا۔ اور اس فرض سے جی نہ پرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی پنجو سے چھین جائیگا۔ اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھڑا رہ جائیگا۔ کیا تجھ کو یہ اُمید ہے۔ کہ تو جھوٹ بھی بوسلے اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے۔ اور ہمت نہ لگائے۔ تو فریب بھی دے۔ اور جھگلیاں کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کھائے نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو بھی زبان ہے۔ تو زبان ہے۔ ورنہ زبان ہے۔ بلکہ مہر زبان ہے اگر تیرا قول صادق ہے۔ تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر

تو راست گفتار ہے۔ تو ہمارے مُنہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی  
ورنہ گدڑی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان جنھوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور تجھ پر حکم بجالائے۔ اُنہوں نے سخت  
الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے اُنھیں فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ  
اور منہ پھٹ اُن کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا۔ اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے  
بدعہد بنایا اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان مکر اور افتراء طعن اور تشنیع گالی زد و ستا  
پختہ اور ضلعِ حکمت اور بھینٹی۔ غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے۔ اور وہ سب کے  
منزوار بھیرے۔

اے زبان یاد رکھ۔ ہم تیرا کہا نہ مانیں گے۔ اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔  
تیری ڈور ڈھینٹی نہ چھوڑینگے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھلیں گے  
پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش  
میں آتا ہے تو بے اختیار ہنپناتا ہے۔ اور کتا جب پیار کے مارے بتیاب ہو جاتا ہے  
تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ سجان اللہ! وہ نام کے جالور۔ اور ان کا ظاہر  
باطن یکساں ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے۔ تو زبانِ راست گفتار دے۔ اور اگر دلِ  
تجھ کو اختیار ہے۔ تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلاؤ  
اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔

(حالی)

## کارخانہ قدرت

کسی کتاب میں نظر سے گزرا کہ زمانہ حال کا کوئی مخلصی خرد بین میں بانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا ستوا سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بیشکل شہا کر سکا آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو تو تمام کرہ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہو۔ کتنی مخلوقات ہو گی؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرد اگر ۵۴ میل کے ذل کا ہوائی کرہ ہو۔ اور اس میں بھی جانداروں کی رانگی ہی یا اس سے زیادہ) کثرت ہے۔

ہر چند کارخانہ قدرت الہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہو مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی منواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا رہے تو ضرور اس کے دل میں اپنی بے حقیقی اور در ماندگی اور بے وقعتی کا یقین پیدا ہوگا جس کو میں دین داری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ با این عظمت کسی عہدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہو۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بیشمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکر میں ہیں۔ خدا جانے کب سے؟ اور کیوں اور کب تک؟ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہو۔ تو سینکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہو۔ کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا۔ اور دہائی

ہے حساب میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ اور سکند گہبا! سکند کے ہزار دیں حصے کی قدر بھی آگاہیچھا نہیں ہو سکتا۔

یہاں دو زمین پر ایک بٹنے ایک دانے، ایک پھل، ایک پنکھڑی، گھاس کے ایک ڈنٹھل، چھوٹی سے چھوٹی اور ادنی سے ادنی چیز کو بھی نظر غور سے دیکھو۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و فائیت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اُس چیز میں موجود ہے۔ مثلاً، گیٹائی عذوق میں ادب پیدا کیا گیا ہے۔ تو اس کے پائوں کے نیچے پورے اور سچے کبطح پوش ہیں کہ ریت میں نہ دھسے اس کی گروں بست لمبی ہے تاکہ اس کے درختوں کے پتے چر سکے۔ اُس کو ایک خاص صرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے، جس میں کئی کئی ہفتیوں کے لئے کھانا پانی بھرا لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے لمبے دن میں وہ پیدا کیا گیا ہے، وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملتا کچھ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس کوہات کا گودام ہے۔ کہ اگر اُس کو ایک عرصہ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان کی چربی بدل، مایہ تھل کا کام دے۔ ہر دن وغیرہ جنگی جانوروں کی ٹانگیں تیلی تیلی ہوتی ہیں تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لئے پھرتی سے بھاگ سکیں۔ ہاتھی کے ایک نوٹڈ لٹکے ہی ہیں جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے۔ بندوں کے جتنے سبک ہیں تاکہ ہوا میں اڑ سکیں دریائی جانوروں کے پیچھے کھال سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چوپ ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے پیچھے اور دانت انکی غذا کے مناسب ہیں۔ نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کیواسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں، خول ہیں۔ ہر ملک کے جانور کی اُونٹن بڑی بڑی اور گھٹی ہے۔ کہ جاڑا نہ کھائیں۔ جتنے جان دار معروض تلف میں ہیں

اُن میں تو الد و تناسل کی کثرت ہے تاکہ نسل معلوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی  
 لاکھ سے زیادہ اندسے دیتی ہے۔ آدمی چونکہ ایقائے حیات کا سامان عقل کی مدد  
 سے بہم پہنچا سکتا ہے۔ سینک اور پیچے اور اذن۔ اس قسم کے سامان قلعہ کی اسکو  
 نہیں دئے گئے۔ جس ملک میں نباتات کی کثرت ہے وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔  
 کیونکہ وہ ملک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے تو اس کا ایک  
 ایک رود و صانع قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔  
 اس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سایہ ہوتا ہے۔ کہ دنیا میں جس قدر انسان کے  
 تصرفات ہیں اور انسان کی بساط پر خیال کر دے۔ تو اُن تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے  
 سب اسی چیز سے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ مجلس  
 بنائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شدید کے  
 ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار لوگوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک کچھڑا  
 ہے۔ کہ بگلیوں زمین پر پھیلا ہے۔ نیگڑوں پر زے ہزار پانچ، بلن، بیسے، چرخیاں،  
 کمانیاں، خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کئے ہیں۔ تب کہیں بنا کردہ ایک  
 مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لئے کل بنائی گئی ہے۔ یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی لوگوں  
 کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی گل خدا کی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ کہ ہزار ہا قسم کے کام  
 اس سے نکلتے ہیں۔ اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کف دست ہے۔ اور  
 تین تین جڈ کی پانچ انگلیاں۔ اللہ اللہ خیر صلاح !  
 انسان کے بدن میں ایک اور ذرے بھر کی چیز آگے ہے۔ اس کی ساخت میں  
 جو اندرونی حکمتیں ہیں۔ اُن سے بالاحتیاج ایک کتاب بن سکتی ہے۔ مگر خارج کی

احتیاطوں کو تو دیکھو کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کا داگ ہو جس میں نگیں کی طرح آنکھ  
تعبیہ کی ہوئی ہو۔ اور پھر بھول کا پیچھے دار سا ثبات، سامنے پوٹوں کا پروہ پر دے  
میں پکیوں کی جھانر۔ پھر پیٹے کے اندر منافذ ہیں جن میں سے اُنکینہ چشم کے  
صاف نہ گھٹنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رستی رہتی ہے۔ یہ وہی رطوبت ہے  
جو تیار ہو کر انہوں جاتی ہو۔ جتنی دفعہ انسان پاک چھپکا تا ہے گویا اتنی ہی دفعہ  
اُنکینے پر بچی بچتا ہو۔ گرد اور دھوئیں اور کینک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے  
ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ بچا راکانی نہیں بلکہ اُنکینہ کو دھولے کی ضرورت ہو۔  
نیرا نو کیا مرنے ہے کہ موجودات عالم میں جو اسرارِ حکمت مضمحل ہیں اُن کا ایک کرشمہ  
جس بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اسی قدر ہے کہ دنیا کے کارخانے کو اس نظر  
سے دیکھنا چاہیے کل میں کئے آیت اللہ کا سبق سنا۔ وہ عجائب قدرت پڑھنا جو  
کسی شخص نے نہجراںِ فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین جہانت کر اُردیں ترجمہ  
کر دیئے ہیں۔ اسی میں لکھا تھا کہ مجھ کے مُنہ کے آگے جو ایک بتلی سوئڈسی ہوتی ہو وہ  
حقیقت میں ایک نلوا ہے۔ اُس نلوے میں تین اور اُنکینہ تو سوئی جس کو مجھ سام میں  
داخل کرتا ہے۔ ایک آری کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو تو اُس سے کام لے  
اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوستا ہو۔ اُس میں اتنی بات اور بھی تھی کہ اس  
شکل غامی میں مجھ کی مدتِ حیات صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ تیری  
کے ایک پیر میں کچھروں کی طرح تیس ہزار دیولیاں ہوتی ہیں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر  
انسان سرسری طور پر نہ سمجھیں کہ اُس کی عادت ہو تو ہر روز وہ اس بات کی گواہی  
دیگا۔ کہ اُس کو کسی بڑے قدرت والے دانشمند ہمدان حاضر، ناظر، سمیع و بصیر نے

کسی مصیبت سے جان بوجھ کر بنایا ہو۔ ممکن نہیں کہ انسان صمیم قلب سے  
 موجوداتِ عالم میں غیرِ مذکورہ جو کچھ کرے اور اس کا دل نذر سے نہ بولنے لگے کہ یہ اتنا  
 بڑا کارخانہ بایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقاً ہیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ ذاتِ  
 اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہو۔ اُن میں قاعدہ نکالنا پنا۔ اور انضباط  
 کا کیا تذکرہ اور قاعدہ انضباط بھی کیسا ہے کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی  
 تک تو اُس میں رتی برابر فرق نہیں پڑا۔

(نذیر احمد)





# میراثیں کی شاعری کی خصوصیات

## ”فصاحت“

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تباہی نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو۔ اس جمال کی نقیض یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے۔ اور چونکہ آواز میں بعض شیریں دل آواز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطی اور بلبل کی آواز۔ اور بعض مکروہ اور ناگوار مثلاً کوسے اور گدھے کی آواز اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شستہ صباکے شیریں اور بعض ثقیل اور بھدے ناگوار پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسری کو غیر فصیح، بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کی نفسہ ثقیل و مکروہ نہیں ہوتی لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جیسا ابتداء استعمال کئے جاتے ہیں تو کالوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو فنِ بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں۔ اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کئے جاتے ہیں۔

میراثیں کی کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انہوں نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور سینکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے۔ تاہم

اُن کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر علم عربی فارسی کے الفاظ جو اردو زبان میں کم مستعمل ہیں ضرورت سے لائے پڑتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں۔ فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں۔ جس سے ان کی غرابت کم ہو گئی ہے۔ درنہ اگر اردو کی خاص ترکیب میں اُن الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے بالکل خلافت فصاحت ہوتا۔ مثلاً اکثر ستری، خاتم، رخ، بادہ، تنہا، حسن، اور اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں۔ جو بجائے خود فصیح ہیں، لیکن بھٹ اردو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا میر تقی میر ایک موقع پر کہتے ہیں۔ ع ”ذریعہ رسول کی خاطر عیالی تارہ ناری کا لفظ اس موقع پر نہایت نامناسب اور بیگانہ ہے لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا ہے مثلاً تارہ دوزخ، تارہ جہنم تو وہ غرابت نہیں رہتی، فصاحت کے مدایج میں محتاج ہے بعض الفاظ فصیح ہیں بعض فصیح تر بعض اُس سے بھی فصیح تر میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع فصیح کتبھی الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضامین اشعار۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے اگر مرزا صاحب کے تو اُن کے مقابلہ میں میر صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے یہاں فصیح تر ہوں گے۔

مرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گوئیوں کے مقابلہ میں میر انیس صاحب کے کلام کا یہی حال ہے

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مرآت کا اندازہ ہو سکے گا۔

مرزا دبیر ”کس نے نہ دی انگوٹھی رگو ع و سجدہ میں“

میرانیس۔ ”سائل کو کس نے دی ہے انکو گھی نماز میں۔“  
 مرزا دبیر۔ ”آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو۔“  
 میرانیس۔ ”آنکھوں میں یوں پھرے کہ سڑک کو خبر نہ ہو۔“  
 مرزا دبیر۔ ”دیا میں جی حسین کو دیا ہی کرتے ہیں۔“  
 میرانیس۔ ”محسرت یہ ہے کہ خواب میں بھی دیا کیجئے۔“  
 مرزا دبیر۔ ”جیسے مکان سے زلزلہ میں صاحب مکان۔“  
 میرانیس۔ ”جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے۔“

## ”ابتذل“

لفظ فصاحت متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ  
 سادہ آسان کثیر الاستعمال ہو۔ اس لئے لوگ مبتذل اور سوتلی الفاظ کو بھی فصیح  
 سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں سفید دسیاہ کا فرق ہو مرزا دبیر جہاں  
 واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میرانیس کی تقلید کرتے ہیں۔ اکثر اُن کے کلام  
 میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں مثلاً جہاں حضرت شہر بانو نے حضرت عباسؓ کی  
 لاش پر نوحہ کیا ہو۔ حضرت شہر بانوؓ کی زبان سے فرماتے ہیں۔ ع  
 ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور۔“

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ع

ناڑہ تو اُن کی سال گرہ کا نکال لا۔“

ابتذل کی صفت اور بین مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ مبتذل نہ ہوتا

تو سادگی اور صفائی میں نظیر کلام میر انیس یا میر تقی سے ملکر کھانا۔  
ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال  
کرتے ہیں۔ وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ  
ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاقِ صحیح کے سوا کوئی چیز  
نہیں۔ مذاقِ صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل اور سبت اور سرفیانہ ہے۔

## ”کلام کی فصاحت“

یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا  
فصح ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے  
انکی ساخت ہیئت۔ نشست۔ بگنی اور گرانی کے ساتھ اسکو خاص تناسب اور  
توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ میر انیس کا مصرع ہے۔ ع  
”فرایا آدمی ہے کہ صحر اکا جا لور“

صحر اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ میر انیس نے جا بجا ان دونوں  
لفظوں کو استعمال کیا ہے۔ اور ہم معنی ہونیکی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرعہ  
میں صحر کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائیگا میر صاحب  
کا ایک شعر ہے۔ ۵۔

طاؤر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں  
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھاریں  
یہاں جنگل کے بجائے صحر الاؤ تو مصرعہ بھیس بھسا ہو جاتا ہے۔

جنم ادوئیں ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں لیکن میر صاحب کے اس شعر میں ۵

کھا کھا کے اُس اور بھی سبز رہا ہوا، تنہا مونیوں سے دامن صحران بھرا ہوا  
اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائیگی لیکن یہی  
ادس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہر اس مصرعہ میں ع  
”شبنم نے بھروسے تھے کھڑے گلاب تھے“  
شبنم کے بجائے اوس لفظ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُرخو اس لئے یہ مفرد ہر دو کہ جن  
الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے ان آوازوں سے اُس کو خاص تناسب  
بھی ہو در نہ گویا دو مخالف سُرخوں کو ترکیب دینا ہو گا۔ نغمہ اور لاگ مفرد آوازوں یا مرکب  
کا نام ہی ہر سُرخ بجائے خود دلکش اور دل آویز ہی لیکن اگر وہ مخالف سُرخوں کو یا ہم ترکیب  
دیا جائے تو دونوں کو وہ ہو جائیں گے۔

راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا گرہ بھی ہو کہ جن سُرخوں سے اُس کی ترکیب  
ہو اُن میں نہایت تناسب و توازن ہو الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صورت اور  
سُرخ ہیں۔ اُس لئے انکی لطافت شیرینی اور روانی اُسی وقت تک قائم رہتی ہے  
جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی لئے میں ان کے مناسب ہوں۔

مرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہر ع

زیرِ قیام والدہ فردوسِ یریں ہے

اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیر، قدم، والدہ، فردوس، یریں سب بجا خود  
فصیح ہیں لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوتا ہے وہ انتہائی  
جھڈا اور گراں ہو کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر سکتی شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعہ کی قریب

چونکہ فارسی ہو گئی جو اسلئے نقل پیدا ہو گیا ہو لیکن یہ صحیح نہیں کیڑوں شعروں  
 میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نقل نہیں پایا جاتا مثلاً میر انیس تھا کہتے ہیں کہ  
 میں ہوں سردار شباب جن فصد بریں میں ہوں خالق کی قسم دو حق محمد کا کہیں  
 پہلے مصرع میں فارسی ترکیب کے علاوہ الیٰ صفات بھی موجود ہیں لیکن یہ یہاں نقل نہیں  
 جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تنا سبب توازن، توازن  
 پایا جاتا ہو اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ  
 یا شعر فصیح کہا جاتا ہو اور یہی چیز جو بدش کی صفائی، نشست کی خوبی ترکیب  
 کی دلادیزی، بستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں الفاظ کے توازن اور  
 تناسب کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہو وہ ایک خاص مثال میں امرانی کو سمجھیں  
 آسکتا ہو میر انیس حضرت علی اکبرؑ کے اذان دینے کی تعریف میں ایک موقع پر اس  
 طرح ادا کرتے ہیں۔ عی "تھا بلبل حق کو کہ چھلکتا تھا جن میں"  
 اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں۔ عی  
 بلبل چمک رہا تھا ریاض رسول میں۔

وہی مضمون ہے وہی الفاظ ہیں لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں کے قدر فرق پیدا کر دیا  
 میر انیس کا نام کلام اس خوبی سے معمور ہو اور ان کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے  
 نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

تعریف میں چشم کو سمندر سے ملا دوں	قطرہ کو جو در آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرہ کی چمک ہر منور سے ملا دوں	کانیوں کی نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستہ معنی کوئے ڈھنگ سے بانو دوں	اک بچوں کا مضمون ہو تو سورنگ سے بانو دوں

تھیں موج کی طرح سوا دھڑ کی صفیں اُدھر  
پانی میں تھے ننگے بھرتے نہ تھے مگر  
دریا بھی مہٹ گیا تھا کنارے کو چپوڑ کے  
تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشان  
تریش کھلی تھے ہنس سہ کھولے ہوئے باں  
منہ کندہ ہو گیا تھا ہر ایک تیغ تیز کا

تھا فوج قاہرہ میں تھلاطم کہ اکھڑ  
چکر میں تھی سیاہ کہ گردش میں تھا بھنور  
نوجین فقط نہ بھاگی تھیں مرنے توڑ موڑ کے  
چھایا تھا سب یہ تعب علمدار نوجوان  
گوشتہ اماں کا ڈھونڈ رہی تھی ہر اک کمار  
تیروں کالے گماں تھا ارادہ گرینہ کا

## ”کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا“

ترتیب الفاظ کے لحاظ کو شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزاء کی جو اصلی  
ترتیب ہو وہ بحال خود قائم رہے۔ مثلاً فاعل، مفعول، مبنیٰ، خبر متعلقات فعل جس  
ترتیب کے ساتھ ہر دقت بول چال میں آتے ہیں یہی شعر میں بھی قائم رہے اگرچہ اس  
میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہ قائم رہنا ترتیب قریباً ممکن ہو صرف ایک آدھ  
شعر یا بیت سے بہت شعروں میں اتفاق یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ نظم کا حقیقت  
سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نشر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے  
شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو شعر میں معمولاً ہوا کرتی ہے اس بنا پر شاعر کو  
کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصل ترتیب پوری پوری قائم نہیں ہو سکتی تو بہر حال اس کے  
قریب قریب پہنچ جائے جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائیگا۔ اسی قدر شعر زیادہ صاف و سلیس  
رہے گا اور اُدھلا ہوا ہوگا اور اردو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میر تقی میر کے  
زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

## ”روزمرہ اور محاورہ“

جو الفاظ اور خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتی ہیں۔ ان کو روزمرہ کہتے ہیں۔ روزمرہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت وہ قصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے۔ یہ ظاہر ہو کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے جو سادہ صفت اور سہل الادا ہوں اور ان میں کچھ تخیل اور گرائی ہو تو رات دن کے بول چال اور کثرت استعمال سے وہ سمجھ کر صفت ہو جاتے ہیں۔ روزمرہ کے لئے فصیح ہونا لازم ہے۔

میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ اور اس پر ان کو ناز بھی تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۷۷

مرغان خوش الحان چین بولیں کیا فرماتے ہیں سن کے روزمرہ میرا

## ”حسن کلام“

حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف قسم ہیں مہیب پر رعب سخت، نرم، شیریں، لطیف اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں، بعض نرم، شیریں اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ہوتی ہے بعض سے درداور غلغلی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر غزل میں سادہ شیریں سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں قصید میں زوردار اور شان دار الفاظ کا استعمال



پس یہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح رزم، بزم، منح، ذم، فخر و ادعا، وعظ و پند ہر ایک کے لئے جدا جدا الفاظ ہیں شعر انہیں سے جو اس نکتہ سے آشنا ہیں۔ وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور یہ ان کے کلام کی تاثیر کا بڑا جوہر ہو لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں، یا ہیں۔ لیکن ایک خاص رنگ ان پر چڑھ گیا ہو کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ان کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ جو کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں بچھ سکی۔

میر انیس صاحب نے رزم، بزم، منح، ہجو، توحہ سب کچھ لکھا ہے۔ لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا ہے۔ اُسی قسم کے الفاظ ان کے قلم سے نکلتے ہیں۔ رزمیہ نثر یہ لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ۵

طاقت اگر دکھاؤں رسالت آب کی رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب  
جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ۵

کم تھا نہ ہمہ اسلحہ کر گار سے نکلا ڈکارتا ہوا ضیغ کچھ اس سے  
کیا جانے کس نے روک دیا ہو دلیر کو سب دشت گو بختا ہو یہ غصہ ہو شیر کو  
دیکھو! ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں جس طرح ان کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے  
اسی طرح الفاظ کی صورت و لہجہ سے بھی ہیبت و غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے

(شبلی نعمانی)

# فرہنگ انگریزی الفاظ

ہمارے اخباروں اور رسالوں کی تحریریں اور مجالس کی تقریریں میں بعض انگریزی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں جن کے اصلی معانی لوگ کمتر جانتے ہیں۔ ان کو ہم سمجھتے ہیں تاکہ وہ ان الفاظ کے معانی جاننے سے مضامین کے سمجھنے سے بہرہ یاب ہوں۔

آج کل ہمارے زبان میں بڑی دھوم دھام سے لفظ نیچر رواج پا گیا ہے۔

**نیچر اور اسکے مشتقات** ہر کس ناکس کی زبان پر ہے۔ ظریفوں کی عقل میں نقل مجلس ہو۔ بچوں کی ظرافت کا مترتج ہے اور نیچر کا ہم وزن بیہودہ دماغ اپنی طنز سے اُس کے معانی گرٹھتے ہیں اور اُن کے موافق اعتراضات جڑتے ہیں۔ ہماری زبان میں تو غیر زبان کا لفظ تھا یہ ہونا اس کا تعجب نہ تھا۔ مگر اصل زبان میں اس کا یہ حال ہے کہ جب کسی زبان میں اس کے سمجھنے میں انسان نے غلطی کی تو جھوٹا فلسفہ جھوٹا علم اخلاق جھوٹا مذاق ان میں پیدا کر دیا۔

(۱) نیچرل کے اصلی معنی پیدا ہونے کے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ فطرت یا آفرینش یا سرشت ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ بھی لئے جاتے ہیں کہ وہ خود آفرینش ہے یا آفرینہ ہے یا سبب آفرینش ہے۔

(۲) نیچر اُس قوت کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے (جو کسی سے پیدا نہیں ہوا اور سارے

موجودات عالم کا بنانے والا ہے) ایسا بنایا ہو کہ وہ تمام موجودات عالم کی محافظت کرتی ہو اور ان کو اپنے اپنے کاموں اور انجاموں کی طرف ہدایت کرتی ہو اور کُل افعال اعجاز انسانی کی ہادی ہوتی ہو۔ یہ موجودات عالم میں ایک ترتیب اور انتظام و نظام ایسا قائم کرتی ہو جس سے تمام عالم کے کام باقاعدہ چلتے رہتے ہوں۔

(۳) کبھی تو نیچر کے معنی ایسے وسیع لئے جاتے ہیں کہ وہ عالم ارواح اور عالم اجسام دونوں میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ نیچر اپنا کام ان دونوں عالم میں کرتا ہے اور کبھی نیچر کے معنی ایسے تنگ کر جاتے ہیں کہ وہ فقط عالم اجسام ہی سے متعلق ہوتے ہیں اور اس صورت میں وہ عالم ارواح کے مقابل اور قدر میں کھڑے ہوتے ہیں۔

(۴) تمام مادی اشیاء خواہ وہ ذرات الیہ (جان دار) یا غیر الیہ (بیجان) ہوں ان کے جتنے قوا و اسباب و خواص ہیں وہ نیچر کہلاتے ہیں۔ کسی خاص شے مثلاً پانی، آگ، درخت یا جانور کے نیچر سے مراد یہ ہو کہ اُن کے تمام قوا و خواص طبعیہ جنکے موافق وہ اور چیزوں کا اثر قبول کرتے ہیں یا اور چیزوں پر اپنا اثر کرتے ہیں یعنی وہ تمام قابلیتیں اور استعدادیں جس سے وہ منظر قدرت پیدا کرتا ہے۔ پس جب کسی شے کے نیچر کے یہ معنی ہوں تو وہ تمام عالم کے خواص اور قوا کا مجموعہ ہوا۔

نیچر کا لفظ آخری کے مقابل میں آتا ہے۔ اس معنی کی تفصیل آرٹ کے معنی میں جو نیچے لکھے ہیں سمجھیں آئینگے اب نیچر کے لفظ کے مشتقات اور مرکب تو صیغی کے معنی لکھے جاتے ہیں۔

(۱) نیچرل، فطری، قدرتی، فطرتی، جبلی۔

(ب) سپر-نیچرل، فوق العادت، خرق عادت، فوق الفطرت۔

نیچرل چیزوں جو نیچر سے متعلق ہو۔ پس موجوداتِ عالم میں جو ترتیب نظام عادت کے موافق بقاعدہ مستمرہ ہو اُس کو نیچرل کہتے ہیں۔ اور اُس کے مقابل میں سوپر نیچرل ہے جس کے معنی فوق العادت یا خرق عادت یا معجزہ کہے ہیں۔ جب کسی چیز کو نیچرل کہتے ہیں تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جہاں آفریں نے اسی شے کو ہائے یہ امر ازل سے ایڈنک کے لئے مقرر و معین کر دیا ہو کہ وہ ایک ہی طرح سے واقع ہوا کرے اور اس میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہو اور جب کسی چیز کو سوپر نیچرل کہتے ہیں یعنی فوق العادت تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز بحسنہ نہیں واقع ہوتی جب خدا کی مرضی ہوتی ہے تو وہ کبھی کبھی واقع ہوتی ہے یا ایک ہی دفعہ۔

(ج) کورس یا پاور (Power) آت نیچر۔ طریقہ یا قوت نیچر۔ اس کے معانی ہیں ارادہ الہی یا مشیتِ ایزدی کے موافق بحسنہ بقاعدہ مستمرہ ایک ہی طور سے واقعات کا پیش آنا۔ قادرِ مطلق کی قدرت میں ہو کہ وہ اس کو اس کو بدلے گو کبھی اس کو بدلا نہیں اور اُس کے کمال کا اتقنا ہو کہ وہ اس کو کبھی نہ بدلا۔ (د) نیچرل لا۔ قانون قدرت۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض واقعات بحسنہ ایک حالت کے بعد واقع ہوتے ہیں اور یہ حالت متقدمہ جس کو سبب یا علت یا اثر کہتے ہیں، خاص سبب یا خاص معلول یا خاص اثر پیدا کرتے ہیں اور بحسنہ اسبابِ متشابہ یا متماثل کو سببِ متشابہ یا متماثل مشاہدہ میں آتے ہیں مثلاً جب ہم کسی چیز کو پورے بے سہارے چھوڑتے ہیں تو وہ نیچے زمین پر گر پڑتی ہے اُس کو نیچرل لا یعنی قانونِ فطری یا قدرتی یا فطرتی کہتے ہیں کہ پتھر اور پتھر چھوڑا گیا زمین پر گرتا ہے۔

(۸) نیچرل ری لی جین (Religion) جس کے معنی نیچر یہ مذہب قدرتی یہ مذہب نیچرل کے موافق ہوتا ہو وہ کسی مذہب کو رد نہیں کرتا بلکہ سپر نیچرل (فوق العادت) کو رد کرتا ہو یعنی معجزات و خرق عادت و کرامات کو وہ باطل ثابت کرتا ہو اور خالص مذہب کو جو خدا تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں ودیعت کیا ہو اسی کو نیچر جانتے ہو جو توہمات و تحکیمات سے پاک و صاف ہے۔

(۹) آرٹ جو نیچر کے ساتھ بولا جاتا ہو اس کے معنی قوت و ہنر کے ہیں مگر خیالی چیز کی جسمانی صورت بنانے کو آرٹ کہتے ہیں قدرتی اشیاء کو انسان اپنے خیالات اور تجربوں سے ایسا درست بنائے اور تیار کرے کہ جس سے کوئی ہمارا ارادہ پورا ہو اور مقصد حاصل ہو اُسے آرٹ کہتے ہیں آرٹ فیکٹل (Artificial) مصنوعی چیز کو کہتے ہیں الفاظ آرٹ اور نیچر کو اپنی بول چال و تحریر و تقریر میں بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیئے۔ نہ کہ اُلگرتائیں اناپ نہاں۔

آرٹ ہماری زبان میں یہ لفظ بہت مستعمل ہو۔ اس لفظ کے اصل معنی قوت و ہنر کے ہیں، مگر مطلقاً ہی معنی اس کے خیالی چیز کی صورت جسمانی بنانے کے ہیں کہ قدرتی اشیاء کو انسان اپنے خیالات اور تجربوں سے ایسا درست بنائے اور تیار کرے کہ جس سے کوئی ہمارا ارادہ پورا ہو اور مقصد حاصل ہو۔ جیسے مصوری، بنجاری، موسیقی، فائین آرٹ (Fine Art) کہلاتے ہیں۔

سائنس کا ترجمہ اکثر ہماری زبان میں علم حکمت کیا جاتا ہو۔ اصلی معنی ایسے سائنس جاننے کے ہیں مگر مطلقاً ہی معنی اُس علم کے ہیں جو منطقیات و قدرت کا علم یا علل و اصول ہو اور اس علم میں کسی شک و شبہ کی جگہ نہ ہو اور کبھی اس میں تغیر نہ ہو اور

وہ بالکل سچا اور صحیح ہو اور سوا، بیچ کے اس میں کچھ اور نہ ہو۔ سائنس کا موضوع علم ہی اور آرٹ کا موضوع عمل ہے۔ سائنس سے اصول معلوم ہوتے ہیں۔ آرٹ سے قواعد۔ ابتداء زمانہ میں کاریگروں اور صنعتاءوں نے صنعت کو ایجاد کیا گو کوئی اصول علمیہ اُن کے ذہن میں نہ تھے اور وہ اپنے تصور اور ہاتھوں کو کام میں لائے، اس لئے صنعت کو تقدیم سائنس (علم حکمت) پر ہی مگر جب صنعت کے ساتھ سائنس (علم حکمت) کا بڑا دھوا اور صنعت فقط تجربوں ہی کا مجموعہ نہیں رہا بلکہ اصول علمیہ (سائنس) کا بھی اس پر قبضہ دخل ہوا تو اس کو سائنٹیفک آرٹ (Scientific Art) کہنے لگے، درحقیقت صنعت کو تقدیم حکمت پر ہی یعنی آرٹ کو تقدیم سائنس پر ہی مگر بعض اس لئے کو نہیں مانتے ان کے نزدیک اگر سائنس نہ ہوتا تو آرٹ نہ ہوتا۔

سائنس کی کوئی فرع جدید ایسی نہیں جس کا بیج قدیمی علوم میں نہ پایا جائے تمام علوم جدیدہ کی اصل علوم قدیمہ میں موجود ہے، علوم قدیمہ میں جتنی باتیں صحیح و سچی و مفید تھیں وہ علوم جدیدہ میں ایسی منجانب ہو گئی ہیں کہ وہ اُن سے جدا نہیں معلوم ہوتیں مگر مقتدین سائنس مدد نہ کرنا نہیں جانتے تھے یہ زمانہ حال کا ایجاد ہے بالفعل ہندوستان میں سب سے زیادہ ضرورت سائنس کی ہے۔ تمام تہذیب ملکوں میں سائنس کا دور دورہ ہے جس کی بدولت دنیا نئی دنیا بن گئی ہو۔ آگ کا سلگانا ایک طالب علم چھ مہینے میں اُتار دے سیکھتا ہے کہ آگ اس طرح روشن کرے کہ ایندھن کم از کم صرف ہو اور حرارت زیادہ سے زیادہ پیدا ہو اور ذرہ کے برابر حرارت ضائع نہ ہو۔ غرض ہر چیز پر سائنس کے موافق ہو خواہ برہمن ہو یا بادریجی یا کمار وغیرہ۔

ادھیڑ۔ ادھیڑ تو روزمرہ کی بول چال میں خوب مروج ہو رہا ہے۔ ہتم و دیر اس کا

ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لفظی معنی (میں شائع کرتا ہوں) اُس آدمی کو کہتے ہیں جو دوسرے کی تصنیف و تحریر کو شائع کرتا ہو۔ اب اس کی تمیز کے لئے دوسرے مقرر کی ہیں۔ ایک قسم وہ اڈیٹر ہیں جو دوسرے کی تصنیف کو اصل سے بہتر بنا کے شائع کرتے ہیں۔ متن کی تشریح لکھتے ہیں یا اس پر حاشیے چڑھاتے ہیں۔ ریویو لکھتے ہیں غرض اپنی طرف سے دوسرے کی تصنیف کو ایسے لباس و پیرایہ میں لاتے ہیں کہ اصل تصنیف کو حسن زیادہ ہو جاتا ہے اور عوام و خواص کو رغبت اس پر زیادہ ہو جاتی ہو۔ ایسے اڈیٹر کی لیاقت علمی چاہیئے کہ پرلے درجہ کی ہو کہ وہ دوسرے کی تصنیف کو کما حقہ سمجھے اور اس کے تمام مقامات مشکوک کو حل کرے اور اُس کے غوامض اور رموز کے عقدوں کو کھولے جس سے اصل کتاب ایسی رونق پا جائے کہ اس کی گرم بازار ہو جائے، دوسری قسم کے اڈیٹر وہ ہیں کہ مختلف آدمی ان کے پاس اپنی تصنیفات و تحریرات بھیجتے ہیں اور وہ ان سب کو یک جا جمع کر کے شائع کرتے ہیں۔ جیسے کہ اخبارات اور رسائل اور سلسلہ کتب انسائیکلو پیڈیا وغیرہ کے اڈیٹر ہوتے ہیں۔ ان کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جس کی تصنیف ان کے پاس آئے اس میں کمی بیشی کریں اور قلم اصلاح سے اس کو درست کر دیں یا وہاں بھیج دیں یا شائع نہ کریں یا ایک جز دکاٹ دیں۔ غرض غیر ذہنی تصنیفات میں وہ اپنے تصرفات کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ ایسے اڈیٹر میں ضرر ہو کہ لیاقت جامع العلوم و جمیع الفضائل ہونے کی ہو کہ وہ اکثر علوم و ایسا ماہر ہو کہ جب کوئی تصنیف اس کے رد و پیش ہو تو وہ اُس کے بُرے پہلے ہونے کا امتحان کر سکے اور بے تکلف دوسرے کی غلطی بتا دے اور اصلاح دیدی۔ یہ لفظ اکثر اخبار و نئے آخر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اُس کا ترجمہ متمم اخبار کیا جاتا ہے اور بعض اس کا ترجمہ مدیر بھی کرتے ہیں۔ یس اخبار کا ایڈیٹر اُس کو

جاننا چاہیے کہ جس میں صفات مذکورہ بالا پائی جائیں۔

**کو نفرنس** کو نفرنس انگریزی لفظ ہے جس کے معنی جمعیت یا مجلس کے ہیں جو کسی مفید مقصد مطلب کے لئے خواہ وہ مذہبی ہو یا تجارتی یا زراعتی

یا سیاسی یا ملکی یا تعلیمی اور علمی ہذا نقیاس باضابطہ منعقد ہو اس کا اصلی موضوع یہ ہو کہ اسیں جتنے آدمی جمع ہوں ان کو بحث و مباحثہ کرنے کے یہ سمجھا دے کہ جس مطلب مقصد

کے لئے یہ مجمع جمع ہوا ہو۔ اس کی حالت موجودہ قابل اطمینان نہیں ہو اس کے ساری عیوب نقص یہ توضیح بیان کر کے بتائے کہ وہ کون سے طریقے ہیں کہ جن کے ساتھ ہوا

کرنے سے وہ نقص عیوب دور ہو سکتے ہیں ایسی براہین مبین ان کے لئے بیان کی جائیں کہ جن کا اثر مجمع کے دل پر ایسا ہو کہ وہ ان طریقوں پر عمل کرنے لگیں مثلاً آل اٹلیا

**مجلس** محض ان ایجوکیشنل کو نفرنس یعنی کل ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی مجلس وہ ہر سال ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد کر کے مسلمانوں کو مدعو کرتی ہو ان کو بتلاتی ہو

کہ تمھاری تعلیم کی حالت قابل اطمینان نہیں اور نہایت تسرل پر ہو اور اس کی ساری خرابیوں اور بُرائیوں کو بیان کرتی ہو اور بہتد نصائح و تقریر و تخریر سے انکو ہدایت

کرتی ہو کہ تم تعلیم کے ایسے طریقے اختیار کر دو کہ جس سے قومی ترقی ہو اور تمھارا نام روشن ہو اگرچہ اس کو نفرنس کے بانی ہونے کی عزت مسیح کو حاصل ہو اور وہ اس کے مستحق ہو

**ایجوکیشن** (لفظی معنی پیدا کرنا) تعریف اس کی یہ ہے کہ انسان کی تمام قابلیتیں اور قوتیں خواہ جسمانی ہوں یا نفسانی ان کا ظہور مناسب اعتدال میں

کمال کے ساتھ ہو۔ کمال سے مراد اس حد سے ہو کہ جہاں تک وہ پہنچنے کے قابل ہو اور مناسب اعتدال سے مراد یہ ہو کہ ہر ایک قوت و استعداد دوسرے کے ساتھ ایک جہاں



رکھتی ہو جس میں اعتدال ہو اور افراط و تفریط اس کے درمیان نہ ہو۔  
 انسان ایسی حالت میں پیدا ہوا ہے اور اس کا متفقہ یہ ہو کہ وہ اپنے قوا جسمانی  
 اور نفسانی کو کام میں لاتا رہے، یہ تو اس کی نیچری ایجوکیشن ہو۔ لیکن اکثر ایجوکیشن سے  
 مراد یہ ہوتی ہو کہ ہم اپنے قوا و قابلیتوں کے ظہور کے وسائل یوں کام میں لائیں جو  
 اردوں کے حق میں بہتر و نافع ہوں۔ اب اس طرز قابلیت انسانی کے وسائل میں  
 سے ایک تعلیم یعنی ایجوکیشن اور دوسری تادیب یعنی ڈسپلین (Discipline) ہو  
 تعلیم کے معنی علم پہنچانا جس سے نفس میں قوت و روشنی پیدا ہو اور تادیب کے معنی عادت  
 اور اذعان و اطاعت کا بنانا۔ اب یہ تعلیم تادیب یا جسمانی ہوگی یا اخلاقی یعنی ایک جسم سے  
 متعلق ہوگی دوسری نفس سے، پس جب ان دونوں قسم کی تعلیم اور تادیب ساتھ ساتھ ہو کہ  
 وسعت پاتی ہے کہ جس سے انسان کی ترقی کے آگے قدم بڑھانے کا ظہور ہوتا ہو اسے  
 ایجوکیشن کہتے ہیں۔

**کوئنگز بس** کانگریس کے انگریزی زبان میں دو معنی ہیں۔ ایک معنی اس جماعت  
 کے ہیں جس کے ممبر الکشن یعنی انتخاب سے باقاعدہ یا ضابطہ مقرر  
 کئے جائیں اور گورنمنٹ کی طرف سے اُن کو قوانین شاہی کے وضع کرنے کے اختیارات  
 عطا کئے جائیں۔ دوسرے معنی اُس کے کثیر الاستعمال اس جماعت کے ہیں کہ گودہ  
 مستند فرمان اور شاہی نہ رکھتی ہو مگر وہ گورنمنٹ کی نکتہ چینی و خردہ گیر عیب و  
 میں دشمن و صلاح کار، پبلک اوپینین یعنی جمہور نام کی آراء کی روشنی کی منظر اور گورنمنٹ  
 پر معترض گورنمنٹ کی تدابیر و صلاح ملکی کے برخلاف رائے زن ہو جیسے کہ نیشنل کوئنگز بس  
 لیگ۔ وہ جماعت جو ایسے کاموں کے لئے جن سے کہ اُن کو نفع و فائدہ حاصل

ہوا در مقصد دلی بر آئے متحد متفق ہو۔ آل اندین مسلم لیگ کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے کل مسلمانوں کا آپس میں اس لئے متحد ہونا کہ ایسے مفاد حاصل کیجئے کہ جن سے مسلمانوں کو نفع عظیم پہونچے۔

**دلی گیٹ** دلی گیٹ کے معنی اس شخص کے ہیں جسے لوگ اپنی طرف سے منتخب کر کے اپنا قائم مقام و نائب مقرر کر کے کسی کام کے لئے بھیجیں انبیاء دلی اور سالوں میں اس کا ترجمہ غائبانہ بالکل غلط کیا جاتا رہا جو قانون دلی کی ایک شرمناک اصطلاح کو یاد دلاتا ہے۔

**سویلینیشن** سویلینیشن کا ترجمہ نہایت صحیح تہذیب کیا جاتا ہے جس کے معنی محلی بالافضائل اور خلی عن الرذائل ہر یعنی نیکیوں کی فضیلت سے

آراستہ ہونا اور برائیوں کی رذالت سے پاک صاف ہونا۔ مگر انگریزی زبان میں اسکی مختلف طرح سے تعریف کی جاتی ہے جس کو مال دہی ہے جو تہذیب کے معنی کا ہر وہ تعریف یہ ہو کہ انسان اپنی تمام لیاقتوں اور قابلیتوں کو برائے کا نظاہر کر کے اپنی سوسائٹی کے کل تعلقات کو کمال کے درجہ پر پہونچائے۔ اور کل سوسائٹی اور ہر فرد اسکی اپنی ترقی کرنے میں سعی و جہد و جہد کرے۔ نیچر کے متطورات اور قوانین اور قوا پر فتحیابی حاصل کرے جیسے کہ تم دیکھتے ہو کہ ہوا۔ پانی۔ سیٹھ (دخان) الکٹریسیٹی وغیرہ پر ہندو قوموں نے مسلط ہو کر اپنے تئیں ایسا کامل بنایا ہو کہ کشورتانی سوان کو وہ منفعت نہ حاصل ہوتی جو اس سے ہوئی مشرقی اور مغربی تہذیبوں میں فرق ہے مشرقی تہذیب روحانیت کی تکمیل پر اور مغربی مادیات کی تکمیل پر زیادہ تر منحصر ہے۔

**الیوسی ایشن** وہ جماعت جو ایسی دو تانہ ملے جھٹلے اور مل جل کر کوئی مفید

کام کرے جس سے لوگوں کو فائدہ پہونچے اپنے ملک میں بہت سی ایسوسی ایشنیں  
دیکھتے ہو۔ یونانی ٹیڈ پٹر لوٹک ایسوسی ایشن جس کے بیکریٹری سرپرست تھے مشہور  
معروف ہے۔

**آئی ڈی ٹیل** آئی ڈی ٹیل جس کی انگریزی زبان میں جمع آئی ڈیلینڈ اس کے  
معنی خیال کے غایت کمال کے ہیں جس تک رسائی کبھی نہیں  
ہوتی اور وہ کبھی واقعیت یعنی فیکٹ نہیں بنتا فقط تکمیل کے خیال کو نکلاتا ہے۔

(ذکاء اللہ دہلوی)



# ہندوؤں کا تعلق اردو سے

علم الاسنہ یعنی فیلا لوجی نے دنیا میں عجیب عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ اُس  
عہد کے واقعات نظر کے سامنے کر دیئے جب کہ سلف کو بعد والی نسلوں کی اطلاع  
کے لئے اپنے کارناموں کے زندہ رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں معلوم تھی۔ نوع انسان کے  
بچپن کے سفروں اور آغاز شعور انسانی میں آدمیوں کی نقل و حرکت اور سیاحت کے  
حالات ہمیں اُسی زندگی بخش فن سے معلوم ہوئے۔ ہمارے مجہول العہد بزرگوں  
کے نقش قدم جو قدیم الایام کی جلا وطنیتوں اور صحرائوں و دیوں سے صفحہ زمین میں طابجا  
بنائے گئے آٹھنیں ہم نے اس جدید علمی عینک کی مدد سے دیکھ لیا۔ اور اُسی کی مدد سے  
دور دراز بعید سے بعید اور گہرے سے گہرے واقعات کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔  
مگر سب سے بڑی برکت و نعمت وہ انکشافات ہیں جو اس عینک کے ذریعے سے ہمیں  
خود اپنی زبان کے اندر نظر آئے۔ ہماری زبان سچ پوچھے تو ایشیا کی اُس سرِ پایا  
عظمت قوم کے تفرق و اتصال کی زندہ تاریخ ہے جس کی شاخیں بھلیں، پھلیں  
چھوٹیں، ملیں، ہٹیں، بڑھیں، لڑیں، ٹکرائیں اور پھر ایک ہو گئیں  
اسی علم الاسنہ کے طفیل میں فی الحال یہ ایک طے شدہ تاریخی مسئلہ ہے کہ قدیم  
الایام میں تمدن انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت جو تاریخ میں آریہ  
کے نام سے مشہور ہے وسط ایشیا کے ایک مردم خیز خطے میں پھلا پھولا۔ اور جب اُسکی

ایک ابتداء الی قلم اس سے کاٹ کے ارض مغرب اور لینان و روم کی سوا میں  
 میں نصب ہو چکی تو اور زیادہ پھیکا اور اُس کی دوزیر دست شاخیں ادھڑکھڑ  
 بڑھنے اور پھیلنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک مشرق کی طرف بڑھ کے ہندوستان  
 پر سایہ افکن ہوئی اور دوسری مغرب میں پھیل کے مملکت عجم کی بہار بن گئی  
 ان دونوں شاخوں نے یہاں تک فروغ پایا کہ قدیم درخت کا اصلی تنہ فنا ہو کر صرف  
 ہستی سرعائب ہو گیا اور ان دونوں ممتاز دوسرے شاخوں نے ہندوستان اور انکی زمینوں  
 میں اپنے لئے نئے نئے پیدا کر لئے اب مقامی آبے ہوا کے اثر نے ان کو ایک دوسرے  
 سے جدا اور مختلف خصوصیات سے متصف کرنا شروع کیا۔ اور دونوں میں جدا جدا  
 خصوصیات و شخصیات پیدا ہو گئے۔

آریہ قوم کی ان دو شاخوں کے ایک ہونے اور اُس کے بعد پھرنے کی سچی تاریخ  
 ہماری اردو زبان ہے مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا دراصل ہزار ہا سال کی  
 مفارقت کے بعد ان دونوں شاخوں کا ہم آغوش ہونا تھا۔  
 کہا جاتا ہے کہ مسلمان عرب سے آئے اور وہ آریہ قوم سے نہیں بلکہ باغ  
 کے ایک دوسرے درخت کی شاخ ہیں جو بنی سام کا درخت کہلاتا ہے اور شجر آریہ  
 پہلے دنیا میں سرسبز ہو چکا تھا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے تا جرات عرب ظہور اسلام  
 سے پہلے بھی جنوبی ہند کے مشرقی و مغربی سواصل پر آئے بے تہی اور اُس کے بعد  
 بھی اُنہی آئے اور وطن اختیار کر لیا جاری ہا۔ اس کے علاوہ جب پہلی صدی  
 ہجری میں مسلمانوں نے ملک سندھ کو فتح کر لیا تو کثرت سے عربی خاندان آئے  
 کچھ کاٹھیا دار اور گجرات میں سکونت پذیر ہو گئے یہی تحقیقت ہے کہ ان کی آمد

لیکن مسلمانوں کا وہ آماجس نے ہندوستان پر گہرا اثر ڈالا جس سے ہندوستان کی موجودہ معاشرت بنی اور اسکی موجودہ زبان پیدا ہوئی اُس کا آغاز سیج پوچھنے تو محمود غزنوی کے حملوں سے ہوا۔ یہ عربوں کا آنا نہ تھا بلکہ ایرانیوں اور فارسیوں کا آنا تھا جو دراصل اُسی قدیم آریہ شاخ کے پھل پھول تھے۔ محمود غزنوی خاص عجیب نژاد اور آلِ ساسان کی نسل سے تھا۔ اور اس کی فوج میں علی العمومی ہی لوگ تھے جو ایرانی تھے یا تورانی جن کو ایرانی اپنا ہم نسب اور ہم جہنماتے تھے۔ غزنویوں کے بعد غوری سلطانین اسلام کا عہد شروع ہوا۔ وہ بھی گو نہ ہیا مسلمان تھے لیکن بجا انساب تورانی تھے پھر غلاموں کا عہد آیا اور وہ بھی تورانی تھے۔ چند روز کے لئے ہندو کا کمزور زمانہ رہا اور پھر حکومت عجیب الاصل خاندانوں کے ہاتھ میں آگئی۔ لودھی تعلق اور مغل یہ سب تورانی اور اہلِ عجم کے بنی عم تھے۔ بہر حال ہندوستان میں مسلمانوں کا جو متمدد ربار قائم ہوا اور جس نے ہندوستان کی سوسائٹی کو اپنے رنگ میں بیکارہ ساختی نہیں آریہ دوبارہ تھا۔ اور اس میں مطلق شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اگرچہ یہ لوگ دین اسلام کے پیروں ہو نیکی وجہ سے عربوں کی عزت کرتے اور عربی معاشرت کے دلدلہ تھے مگر بذاتِ خود آریہ تھے اور اُن کا آنا آریہ قوم کی دو شاخوں کا باہم ملنا تھا۔

فی الحال کوئٹہ کی جاتی ہو کہ پیرانا رشتہ زندہ کر کے یورپ والوں کو اہلِ ہند کا بھائی بند ثابت کیا جائے۔ اور مسلمان ایک غیر قوم بتائے جائیں جس کو آریہ قوم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ جن مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی اور اُس میں اپنا جدید ربار قائم کیا وہ بنی ساسم نہیں آریہ تھے۔ عربی نہیں فارسی بولتے ہوئے ہندوستان میں آئے تھے۔ اہلِ ہند سے بمقابلہ اہلِ یورپ کے زیادہ قریب

کاشتہ رکھتے تھے اس کے نتیجے میں ہمیں غرضمندیوں کے اثرات کو  
ہندوستان میں آسنے سے پہلے عربی نثر نے مغشوش کر دیا تھا لیکن ایرانیوں سے  
زیادہ یورپ کے آریوں کو شک ہے۔ ہنگامہ آوزنا تازی قوم میں مغشوش کر چکی تھیں  
بہر حال اسمیں ذرا بخوبی شک نہیں کیا جاسکتا کہ اہل یورپ کے بہ نسبت یہ عجیب و غریب  
ہندوؤں کے زیادہ قریبی رشتہ دار تھے۔

لیکن سامی و آریہ دونوں قوموں کے تازہ وار و عسکراؤں نے گو کہ پہلے ہی کی زبان  
عربی اردو و سنسکرت کی فارسی تھی اس سر میں یہ قائم رکھتے ہی یہاں کی زبان کی  
طرت غیر معمولی توجہ کی۔ اور اس ملک کی زبان کو نہایت سرگرمی اور ذوق و شوق  
سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اہل عرب مسند (مسند) میں وارد ہوئے  
تھے اور پھر انہیں عربی و فارسی لکھتا ہوا کہ اس کے اٹھائیس ہی سال بعد یعنی ولید  
بن یزید کے عہد میں اہل سندھ عربی بولنا در کیا اس زبان کی تعلیم میں ترقی کرنے لگے  
تھے چنانچہ روز میں عربی زبان کے سندھی نثر ادب شاعرانہ یہاں تک نمود حاصل کر لی  
کہ ان کے اشعار بلا د شام و عرب میں مشہور ہوئے اور ان کا نام ارض عرب کی  
علمی صحبتوں میں عزت سے لیا جاتے لگا۔ چنانچہ اس عہد کا ایک شاعر اہل عرب  
جس کا لقب ہی سندھی تھا آج تک مشہور ہے۔ اسکے ساتھ یہ بھی بیٹہ لکھا ہوا کہ متدین  
سندھ عربوں نے بھی سندھی زبان ذوق و شوق سے لکھنا شروع کر دی تھی۔

اس کے تھوڑے دنوں بعد عربوں کا انہماک ہندوستان کی زبانوں میں یہاں تک  
بڑھا کہ سندھی زبان کے عربی نثر ادب شاعرانہ یہاں تک کمال یہاں کی ہند  
صحبتوں اور محرز و باروں میں بہت مقبول تھا۔ اس زمانے کا ایک مشہور شاعر

بزرگ بن شہر یار خان ناچار جس کا سفر نامہ دار السلطنت روس میں چھپا ہوا لکھتا ہے  
 ۱۶۷۷ء (۱۰۸۷ھ) میں کسی ہندو راجہ نے مسلمان حاکم سندھ کو لکھا مجھے مسلمانوں  
 کے عقائد سے مطلع فرمائیے۔ سندھ کے فرمان روا نے یہاں کے ایک ماہر السنہ ہند  
 شاعر کو بلا کے حکم دیا کہ آپ عقائد اسلامیہ کو سندھی زبان میں لکھ دیں۔ وہ ہندو مت  
 کی کئی زبانیں جانتا تھا۔ اور سب میں شعر کہتا تھا۔ اُس راجہ کی زبان میں ایک بیت  
 ہی فصیح و بلیغ نظم لکھی جس میں شریعت اسلامیہ کے کل اصول و عقائد موزوں کر دیے  
 تھے۔ اس نظم کو سب نے پسند کیا۔ اور جب وہ راجہ کے پاس پہنچی تو شاعر کی قدر لکھا  
 کی بحد داد دی۔ اُس کا مشتاق ہوا۔ اور حاکم سندھ کو لکھا کہ اس شعر کو آپ میرے  
 پاس بھیج دیں، وہ شاعر گیا۔ جس سے راجہ نے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ  
 کرایا اور اُسے بہت کچھ انعام و اکرام دیکر رخصت کیا۔  
 اس کے بعد جب قدیم سیاحان عرب مصطفیٰ بن حوقل بشاری اور مسعودی وغیرہ  
 سندھ میں آئے ہیں اُن کے بیانوں سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سندھ میں ہندو  
 مسلمانوں کا میل جول اس قدر بڑھ گیا تھا۔ کہ ہندو عربی معاشرت سے اس قدر  
 متاثر نہیں ہوئے تھے جس قدر خود عرب ہندوستانی معاشرت سے متاثر ہو گئے  
 تھے۔ عربوں نے یہاں کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ یہاں کی عورتوں سے نکاح کر لئے  
 تھے۔ یہاں کی زبان پڑھتے تھے۔ اکثر ہمیں کے ناموں اور لقب کو اختیار کرتے تھے  
 اور ہمیں کے رسم و رواج کے پابند تھے۔

ان آریہ نسب مسلمانوں کے آنے کا آغاز بظاہر محمود غزنوی کے حملوں سے  
 نظر آتا ہے مگر دراصل ابوریحان بیرونی کی علمی کوششوں سے ہوا جس کے وطن میں



اگرچہ بڑا اختلاف ہو مگر میرے خیال میں سندھ کے فنا شدہ شہریروں یا تیروں کا رہنے والا اور اُس ہندی آمیز اسلامی تمدن کی آخری یادگار تھا جو حسب بیان متذکرہ بالاستندھ میں قائم ہو گئی تھی۔ اُس نے عربی و سنسکرت دونوں زبانوں میں کمال پیدا کیا۔ ہندوستان کے اندرونی شہروں اور ہندوؤں کی قدیم علمی درس گاہوں میں طالب علمی کی ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کئے اور برسوں اُن شہروں کے جہاں اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہاں کی مردہ زبانیں کھیں اور ایک ایسا عجیب و غریب شخص بن گیا کہ آج تک مغرب کی علمی دنیا میں حیرت و ادب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہو جس کی نسبت تذکرہ مجمع الفصحاء میں لکھا ہے: ”وہ اسے دیوان بود نازِی، ہندی، پارسی“ مولانا شبلی لکھتے ہیں: ”تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اسے (مسعود) ایک دیوان لکھا تھا“

اُس کا خاندان اگرچہ ملک عجم سے آیا تھا مگر وہ خود لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے زبان ہندی کا اتنا بڑا زبان داں ہو گیا کہ اس کثرت سے وطنی زبان میں شعر کہتا تھا کہ اُن کا ایک متفق دیوان مردن ہو گیا۔

یہ غزنویوں کے عہد الدین کا ایک نامور سلمان شاعر تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد مولوی محمد حسین آزاد مرحوم لکھتے ہیں کہ شہاب الدین غوری کے عہد میں ہندوستان کے مشہور ہندی شاعر چند کوئی نے پر تھی راج راسا لکھی تو اس کے کلام میں کثرت سے فارسی عربی الفاظ موجود تھے۔

یوں تو دو قوموں کے ملتے ہی باہم مبادلہ الفاظ شروع ہو جاتا ہے مگر اس میں دین کی حقیقی ہمنشیں دہ ہو کرتی ہیں۔ اول بازار۔ جہاں ضروری اشیاء کے خرید و فروخت کے ساتھ لفظوں کا سودا بھی ہوتا ہے۔ اور دوسری نمہ دسہرہ کی صحبتیں۔ جس میں ایک قوم کی محفل میں دوسری قوم کے معنی آئین اور اپنی زبان کے معنی بکشت نمودار ہوتے ہیں۔ عوام پر بازار پر بازار ہوتا ہے۔ اور خواص یعنی امیر و دولت مندوں اور عزیز لوگوں پر مجلس و طرب کی صحبتیں زیادہ اثر ڈالتی ہیں۔ عاقبت مسلمانوں کیلئے بازاروں میں الفاظ نے دین کی تجارت تو ایسی دن کھل گئی تھی جس میں مسلمان ہندوستان میں آئے تھے۔ مگر یہ مٹرب کی محفلیں سوت گرم ہوئیں جب مسلمان فرماں دہوں نے اپنے دربار میں ہندو معنیوں کو بگڑا دی اور علی علیہ السلام کو رکھے۔ ساتھ ہی مشائخ صوفیہ نے اوسہ توجہ کی۔ اور موسیقی کے روکے کیلئے مسلمانوں کے دروازوں پر چوڑی پہرہ تھا دہ اٹھ گیا۔ علمائے اس سے اختلاف کیا مگر قاضی حمید الدین ناگوری نے سلطان شمس الدین التمش کو اپنی ایک کرامت دکھا کے علماء کے فتوؤں کے خلاف محفل سماع کا ایسا کردیدہ کر دیا کہ مشائخ کی محفلوں میں طبل و سرود کا نمہ گونجنے لگا۔

شمس الدین التمش نے عربی و عجمی نثر و ادب کی مشائخ کا شوق پورا کر نیکی لئے غلام ایرانی معنیوں کو اپنے دربار میں جگہ دی ہوگی۔ مگر اس کا بیٹا فیروز شاہ گانے کا ایسا دلدادہ ہوا کہ بڑے بڑے گویتے دور دور سے آئے اس کی محفل نشاط میں جمع ہوتے اور ہر شہر اور ہر قصبے سے گانے ناچنے والی عورتوں نے دہلی میں آئے بستا شروع کر دیا۔ جن میں سے بعض چوٹی کے صاحب کمال مطربوں معنیوں کو اس کے

دربار میں خاص جگہ مل گئی، فیروز شاہ کے بعد یہ سلسلہ میرا پرستار بن کر شروع ہو گیا۔  
 معز الدین کی قبضہ - جلالت الدین خلجی - علاء الدین خلجی دولتِ مغلیہ سے پیشتر کے وہ  
 پیرائے تاجدارانِ ہند ہیں۔ جن کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ اور ان کے شوق نے  
 دہلی میں خصوصاً اور سارے ہندوستان میں عموماً ہزار ہا مطرب و مغنی پیدا کر دیے  
 ابن بطوطہ کو دہلی اور دکن آباد دونوں شہروں میں "طرب آباد" نام کے  
 محلے نظر آئے جن میں صرف دھوم ڈھائیوں کی آبادی تھی۔ اور یہی نہیں کہ ان میں  
 "فقط ہندو" مغنی آباد ہوں۔ ہندو مسلمان دونوں نئے مسلمان بھی معمولی مسلمان  
 نہیں بلکہ دیندار اور پابندِ شرع گوئیے۔ جن کی وجہ سے ان محلوں میں مسجدیں  
 بقیں اور خوب آباد تھیں۔ ان میں پنج وقتہ نماز ہوتی۔ اور رمضان میں جماعت سے  
 تراویح پڑھی جاتی۔ شاہی درباروں میں عموماً رباب نشاط کے دار و غم یا چودھری  
 مسلمان تھے جو اکثر ایرانی الاصل ہوتے۔ ان دو عنصروں کے ملنے سے فنِ موسیقی  
 کے مسائل میں باہمی رد و بدل اور داد و ستد کے اصول کا جاری ہونا یقینی ہی۔ مگر سب  
 سلسلے میں موسیقی سے زیادہ اس لین دین کے عمل کا الفاظ میں جاری ہو جانا لازمی  
 جذبہ ہیروز میں یہ علمی تجارت اور زیادہ ترقی کر گئی۔ کشمیر کے حکمران سلطان  
 زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں پورا دخل رکھتا  
 تھا اکثر عربی و فارسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا  
 ترجمہ فارسی میں کرایا۔ اور سب سے پہلے اسی کے حکم سے مہاجرات اور راج ترنگی  
 (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔

اسی قریب زمانے میں امیر خسروؒ کے اشعار مشہور ہوئے جنہوں نے دہلی میں نشوونما

پایا تھا۔ وہ شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ اور ہندی نژاد ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی ہر چیز کو پسند کرتے تھے۔ انھیں ہندوستان کی زبان ہندوستان کی معاشرت ہندوستان کا گانا، ہندوستان کا مذہب، غرض یہاں کی ہر چیز پسند تھی۔ اور انہوں نے ہر چیز میں یا ہی اتحاد اور ربط و ضبط کی کوشش کی یہی نہیں کیا کہ فارسی دہندی دونوں زبانوں میں کمال پیدا کر کے سخن آفرینی کی بلکہ انہوں نے دونوں جگہ کے علوم و فنون کے ساتھ دونوں زبانوں کو بھی ملایا۔ اور فارسی ہندی الفاظ کو باہم مربوط کر کے اُس میں نئے نئے جوڑ بیوند لگانا شروع کئے ایک منظوم کتاب میں عربی فارسی اور ہندی کے ہم معنی اور مترادف الفاظ جمع کر دیئے جو خالق باری کہلاتی ہو۔ اور اگلے نصاب تعلیم میں داخل تھی۔ اس کتاب میں مختلف لفظوں کو ایک سلسلے میں منظوم کرنا ہی بجائے خود ان کو باہم ملانا اور جوڑنا اس کے بعد ہندوؤں نے فارسی بڑھ کے سلطنت کے دفاتر فارسی میں ملازمت شروع کی۔ اور اسی کے مقابل بعض سلطنتوں نے اپنے دفاتر کو خالص ہندوستان کی وطنی زبان میں رکھا۔ اور مسلمان ملازمت کے لئے یہاں کی وطنی زبان علمی حیثیت سے سیکھنے لگے۔

یہ تمام باتیں صاف طور پر تباہی ہیں کہ ان دنوں مسلمانوں اور ہندوؤں میں میل جول اور ربط و ضبط کس قدر بڑھ گیا تھا۔ اور اس ربط و ضبط اور اتفاق و یکجہتی کا پھل جو قیامت تک ہمارے گزشتہ اتحاد کو نہ بھولنے دیکھا۔ وہ ہماری اردو زبان ہو اس کا مثلاً دراصل اُس مبارک عہد کی یاد مل جاتا، جو جب ہم دونوں میں دوستی کے درجے سے بڑھ کے عزیز داری قرابت کا رشتہ خوب مضبوطی کے ساتھ

قائم ہو گیا تھا  
 ہر چیز کی تولید کے لئے والدین کی ضرورت ہے۔ اور جس شخص یا چیز کی مہلیت کا  
 پتہ لگانا ہو تو ہمیں اس کے حقیقی ماں باپ کو ڈھونڈنا چاہیے اُردو کے ماں باپ  
 اسمیں ذرا شک نہیں کہ بھاشا اور فارسی میں جو اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کی  
 زبانیں تھیں۔ بھاشادہ اصلی زمین ہی جس میں یہ پودا اگا اور جکی آب و ہوا میں اس کا  
 نشوونما ہوا۔ بمقابلہ اس کے فارسی کو اس زبان کی ولادت میں باپ کی حیثیت  
 حاصل ہے۔ جس نے تخم ریزی کی۔ اور زمین ہند کے بطن میں ایک نئے بچے کے لئے  
 حیاتی مادہ پیدا کر دیا۔ جن لوگوں نے مسئلہ تولید میں غور کیا ہو وہ بخوبی جانتے ہیں  
 کہ ہر بچے میں جنفہ زیادہ اثر ماں کا ہوتا ہے باپ کا نہیں ہوتا۔ اس کا سارا جسم تمام  
 اعضا، گوشت پوست رگ و پے سب ماں کے ہوتے ہیں ایک ضامن کی طرح  
 پیری نطفہ کے امتزاج سے اسمیں بعض پیری خصائل عادات مخفی و مستتر پائے جاتے  
 ہیں۔ جو اکثر ثبوت دیدہ یا کرتے ہیں کہ کس باپ کا بچہ ہے۔ اور اسی بناء پر مشہور ہے کہ  
 ”اَوَّلُ لَدُنِّ مِسْحَرٍ لَا بَیِّنَہُ“

یہ دونوں اثر اردو زبان میں صاف نظر آرہے ہیں۔ اصلی ڈھانچہ نظام نحوی  
 اصول اشتقاق سب خالص ہندی اور بھاشا کے ہیں۔ فارسی و عربی الفاظ عزیز  
 پسندیدہ ہمانوں کی طرح آئے اس طرح بل گئے کہ ایک جان دو قالب ہو گئے ہیں آخر  
 زمانے میں بہت سی فارسی کی بندشیں بھی پوری پوری ترجمہ کر کے زبان میں شامل  
 کر لی گئی تھیں بلکہ بعض شعراء نے یہاں تک کیا کہ ان فارسی بندشوں کو اُسی فارسی  
 ترکیب سے اُردو میں نقل کر لیا۔ لیکن غور سے دیکھئے تو وہ بندشیں بالکل بے ربط ہیں

اور اسی وجہ سے زبان میں کبھی نہ شامل ہو سکتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں اور منظر جان جاناں کی جو گفتگو میوہ لوی محمد حسین صاحب آزاد نے آپ حیات میں نقل کی ہے اس سے یہ طرح کی حیرت ہوئی ہے کہ ان دنوں فارسی لفظوں کے ساتھ فارسی بندشوں کو بھی لوگ کس بے احتیاطی سے گفتگو میں شامل کر دیتے تھے۔ سیدنا فرماتے ہیں: ”ابتداءً سے صبا سے تا ادائل ریان اور ادائل لیان سے الی الا ان اشتیاق الالیاطق تفصیل عقیدہ عالمیہ نہ بخدا تھا کہ سبک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔“

مرزا صاحب جواب دیتے ہیں: ”اپنے تئیں کون بھی بد و طفلی سے تمہیں ایسے اشتیاق کے ساتھ موانست اور عجالت رہا کی ہے“

اس قسم کی چند بندشیں مرزا غالب کے بعض اشعار میں بھی ہیں لیکن ان دنوں لوگوں کی زبان سے ایسی ترکیبیں محض اسوجہ سے بھل جاتی تھیں کہ درباری زبان فارسی تھی۔ فارسی شعر و سخن اور ایرانی ادب کی مہذب صحبتوں میں زیادہ قدر تھی فارسی انی کا اظہار بات کرنے والے کی علمی قابلیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگوں کو اپنی لیاقت ظاہر کرنے کے شوق میں اس کا خیال نہ رہتا کہ فارسی کے استعمال میں ہم کہاں تک بے احتیاطی کر رہے ہیں۔ بعینہ جس طرح آج کل اکثر انگریزی اُن حضرات انگریزی لفظوں اور جملوں کے استعمال میں بے احتیاطی کیا کرتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ کہ فارسی کا دور ختم ہوتے ہی اُس قسم کی تمام بندشیں زبان سے نکل گئیں۔ اور چین چھانکے وہ زبان باقی رہ گئی جس کا اغز چاہے کہیں سے ہو مگر اب اُردو ہر اور خاص اُردو میں خیال کرنا ہوں یہ اصول معلوم ہونے کے بعد کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ ہندوستانی ہے۔ اور اُس میں فارسی۔ عربی الفاظ کا فقط ضامن ہو گیا ہے یہ امر بھی اصرح ہو جاتا ہے کہ

اُردو میں ہندی و سنسکرت اور فارسی عربی کو کسی حد تک گنتا اور کس قسم کا تصرف کرنے  
 کا حق حاصل ہے۔ اُردو کے ساتھ مذکورہ بالا زبانوں کا رشتہ معلوم ہو جائے گا۔  
 یہ مسئلہ میت : اصول طریقے سے صاف ہو جاتا ہے۔ اس کی بندشوں نحو کی ترکیبوں  
 ترتیب الفاظ - افعال کی گرواؤں - صفات در دالط کے استعمال - اور تمام اوصاف  
 سے کام لینے میں دخل دینا خاص سنسکرت اور بھاشا کا حق ہے۔ اُس میں اگر عربی زبان  
 دخل دے تو وہ زبان کو بنائی نہیں بلکہ بگاڑ دیگی۔ اس لئے کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ  
 بھاشا و سنسکرت سے ماخوذ اور انھیں کا بنایا ہوا اور بالکل آریں اصول رکھتا ہے۔ فارسی کے اس  
 میں دخل دینے کا کسی قدر حق ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ بھی آریں زبان ہے۔ مگر اس کا  
 کیا علاج کہ اُردو کا اشتقاق اور اُس کی نحو کی ترکیبیں بالکل بھاشا کے مطابق ہیں یہی  
 عربی اُسے تو اس میں دخل دینے کا مطلق حق نہیں ہے۔ بمقابل اس کے عربی کو ترتیب  
 اصول نحو چھوڑ کے صرف یہ حق حاصل ہو کہ اپنے ذخیرہ الفاظ میں سے اُردو  
 کو نئے نئے الفاظ دے۔ اس لئے کہ تولید زبان میں اُس کا جو پہلا ضامن پڑا تھا  
 اُس نے اُردو کی بندشوں میں عربی الفاظ کو ہمان عزیز اور اوس بنادیا ہے۔ اور جس  
 طرح ہر باپ کو حق ہو کہ اپنے فرزند کو اپنے علمی ادبی فنون سکھائے اُسی طرح عربی کو حق ہو کہ  
 اُردو کے لئے نئی اصطلاحیں ہتھا کرے۔ اُس کے ذخیرے میں اپنے الفاظ کو صحت و ثبات سے  
 پیدا کرے۔ اور دنیا کو دکھا دے کہ یہ بچہ اگرچہ ہندی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے مگر میر فرزند  
 آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ اُردو میں زیر دست چاہے جس زبان کے اسم لے لئے  
 جائیں ربط نہیں کھاتے اس کے فطری اوزان سے باہر ہونے اور عربی الفاظ اُس  
 میں آتے ہی اُس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور یہ اختیار کرنا دشوار ہوتا ہے کہ

وہ خالص اُردو لفظ ہیں یا عربی سے لئے ہوئے۔ اس لئے جس طرح عربی فارسی کے لئے یہ ناجائز ہو کہ اُردو کی نحوی ترکیبوں اور بندشوں میں دخل دیں۔ اسی طرح بھاشا اور سنسکرت کے لئے ناجائز ہو کہ اس زبان کے ذخیرہ الفاظ میں نئے غیر ماتوس لفظ داخل کریں جو اس کے نظری اوزان اور لفظ و نوعیت کے خلاف ہیں۔ لیکن دونوں کے حدود مقرر کر دینے کے بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوں زبان اُردو کا جو کھٹا دراصل سنسکرت اور بھاشا کا بنایا ہوا ہے۔ اس لئے یہ زبان خالص آری زبان ہے۔ اور عربی و فارسی نے فقط اسے اپنے خوبصورت الفاظ کا زیور دلہاں پہنا دیا ہے اس بنا پر مدت دراز سے میری رائے ہے کہ جو لوگ اُردو کو صرف مرتب کرنے میں عربی قواعد زبان سے مدد لیتے ہیں سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ عربی کے قواعد ہماری زبان میں ہرگز پورے نہیں اُتر سکتے۔

نحو صرف کی اصلی عمارت افعال کی بحث پر قائم ہو اگر تھی۔ عربی اور میرا خیال ہے کہ تمام سامعی زبانوں میں فعلوں کا اشتقاق بغیر کسی دوسرے فعل کے ملائے فقط ایک حرف کے بڑھانے گھٹانے یا حرکتوں کے بدل دینے سے ہو جاتا ہے۔ بخلاف اسکے آریہ زبانوں میں بغیر کسی دوسرے فعل یا لفظ کے ملائے پورا اشتقاق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نحو اُردو کے صدہا مسائل میں جیکے بیان کر نیکادقت نہیں ہو مگر وہ سب ثابت کرتے ہیں کہ اُردو آریہ زبان ہے۔ سامی نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اس زبان کو جو انس اور حبشہ اتحاد بھاشا اور سنسکرت سے ہے فارسی عربی سو نہیں۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اُردو اگرچہ ہندو مسلمان دونوں کو قریبی تعلق ہے اور دونوں اسکے پیدا کرنے والے ہیں۔ مگر ہندو و نکھل تعلق زیادہ مضبوط اور بہت بڑھا ہوا ہے۔

عبدالحکیم شہر



# وسعت خیال

(باجازت)

خیال ایک طرف ہو جو جزئیاتِ محسوس کا مخزن ہو عام ہو کہ وہ جزئیاتِ حسی ہر  
سے محسوس ہونی ہوں یا جس باطن سے۔ یہ وہ طرف ہے جس میں وسعت ہی وسعت ہے  
تنگی اس طرف کے سامنے دل تنگ ہو اور عقل انسان اس کے دائرہ وسعت سے  
دنگ جتنی معلومات پڑھیں گے اسی قدر یہ طرف بھی وسیع ہو جائیگا۔ محسوسات اور  
معلومات آنے نہیں پاتے کہ یہ میزبان پہلے ہی اپنی فیاضی اور سیرجشی سے اُنکے لئے  
فرد و گاہ تجویز کر لیتا ہو۔ خیال میں قوتِ جاذبہ اور معلومات میں قوتِ میلان ہوتی ہے  
اور جب یہ دونوں غلط ملط ہو جاتی ہیں تو جس طرح مسرخ اور زرد یا سبز اور ادودہ وغیرہ  
دو مختلف رنگوں کے ملنے سے ایک تیسرا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح جب یہ طرف خیال  
میں معلومات کا داخل ہوتا ہے تو نہ صرف قوتِ علمی بلکہ قوتِ خیالی اپنا رنگ دکھاتی ہے اور  
قوتِ نا علی اور انفعالی کا اثر زبان پر یا قسطاں پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہم آج کل جو کچھ کہتے  
دیکھ رہے ہیں یہ سب وسعتِ خیال کے ہی طفیل ہیں۔

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تک معلومات نہ ہوں طرفِ خیال کوئی شے نہیں جس  
طرح مکان کی زیب و زینت کمین سے ہو اسی طرح طرفِ خیال کی رونق معلومات سے ہے  
فلاں شخص کے خیالات بہت صاف اور بلند ہیں، اس کے یہ معنی ہیں کہ اُسکے معلومات

وسیع ہیں۔ فلاں شخص کا داغ روشن ہو۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ علم و فن کی روشنی نے  
 بھالائے گی تاریکی کو زائل کر دی ہو اور محین خیال میں ایک شب چرخ روشن کر دیا ہو۔  
 جس شخص کی معلومات صحیح اور خیانات صاف ہیں وہ کبھی متباہ نہیں رہ سکتا اس کے پاس  
 ہر وقت ایک مونس و مشیر رہتا ہے ۵

ہے آدمی بجائے خود اک تحشر خیال ہم انجن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو  
 شعرا اور دانش پرداز اسی کے سہارے جیتے ہیں۔ خیالات کا خزانہ جس شخص کے قابو  
 میں ہو وہ اپنے کو بادشاہ سمجھتا ہو وہ خلوت سے گھبراتا ہو خلوت ہی کو اپنی زندگی کا  
 ٹھکانا سمجھتا ہو، جس شخص کو تصفیہ خیال حاصل ہو ذرا صوفیوں سے پوچھو کہ اُس کا کیا  
 مرتبہ ہو اگر تصفیہ خیال نہ ہو تو عبادت و ریاضت بالکل بیہنج ہو۔ عرقی کتا ہو ۵  
 کہے کہ طاعت لذت بود محروم من ضامن کہ بگزارند در جنت ولے یاد داغ حرامش  
 یعنی جو شخص بات دن عبادت و ریاضت کرتا ہو اور طاعت الہی کی لذت سے  
 نا آشنا ہو۔ میں اس بات کا ممان ہوں کہ اُس کو جنت میں ضرور داخل کرینگے مگر داغ  
 حرام کے ساتھ، یعنی دیدار الہی حاصل نہوگا۔ ایسے شخص کو گو یارات دن کے آٹا پیسنے  
 کی اجرت یعنی چند کھوٹے پیسے لچائیں گے۔ پڑے پڑے لوگ اسی تصفیہ خیال کے  
 لئے مٹ گئے اور مر گئے مگر بہت کم ایسے انسان گزرے ہیں جن کو یہ دولت نصیب  
 ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ خیال کی وسعت صرف معلومات سے ہوتی ہے لیکن  
 اُس میں مصافی، پاکیزگی، جدت، جودت اور روشنی اسی وقت آتی ہے جب کہ وہ  
 حق کی تلاش میں سرگرم ہو کر اپنی مُراد کو پہنچ جاتا ہے۔ طاعت خداوندی سے  
 بشرطیکہ شوق، ذوق، خلوص و مصافی قلب سے کی جائے، خیال کا تصفیہ ہوتا ہو

طاعت الہی ایک متقبل ہر جہان کیمہ میں کو مدافعت و شفا کرتی رہتی ہر علم اور  
اور خدا و حکماؤ کی صحبت میں بیٹھنے سے خیال کو بخیر ہوتا ہے۔

فلان شخص کے خیال نہ تاریک و تنگ ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح اس نے  
تعلیم نہیں پائی اسی طرح علم اور خدا کی صحبت میں بھی نہیں بیٹھا۔ مکویسے سال  
ہی میسر نہیں ہوئے۔ اسے اس طرح خیال وسیع ہو کر خس و خاشاک جہالت سے  
صاف ہوتا۔ سنیاں داسے جوگی نہ کرکے ضیاء کا دعویٰ کرتے دسے صوفی ذات کثرت  
میں اپنے کو فانی بتانے والے وجودی جب اپنے مریدوں و حیلوں کو کسی قابل  
سمجھتے ہیں تو ان کے اصول و عقائد میں یہ بات پھیری ہوتی ہر کہ عالم خواب میں  
رہا کہ وہ واقعہ اور مشاہدہ یا ناسوت بتاتے ہیں ان کے سامنے روئے زمین کے  
دقائق و خزان پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ میری میں مال و دولت یہ ہاتھ ڈالنے سے  
انسانوں کی شرم و حیا بھی دامن گیر ہوتی ہر اس لئے خزان روئے زمین خواب میں  
پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ وہ یہاں مقام اور موقع ہوتا ہو کہ کوئی مزاحم اور جاسوس نہیں  
جس کی شرم سنیاں لینے والوں پر طاری ہو ایسے وقت میں اور ایسی حالت میں  
اگر کچھ بھی میدان اس کی روح کو دنیوی نعمتوں کی طرف ہوتا ہے تو طمسال باہر کر دیا  
جاتے ہیں اور حکم ہوتا ہے کہ ”آیا ز قدر خود بتا“ ابھی چند روز اور بھی یا صفت  
کر دے تم میں ترقی کرنے کا مادہ اور موصولی المطلوب ہونے کا طرف ابھی پیرا نہیں  
ہوا۔ واقع میں یہ حالات کیسے ہی ہوں مگر تصفیہ خیال کی خوبی ظاہر کرتے ہیں۔  
انسان جس شے سے عبارت ہر وہ صفت پاکیزہ اور روشن خیالات اور تصفیہ  
ادراکات کا ظرف ہر درجہ اس میں اور حیوانات مطلق میں مطلق فرق نہیں دیتا یہ جہد

علوم و فنون پھیلے اور پھیلتے جاتے ہیں اور جس قدر مقدسین تراہیب گزرے ہیں جن کے نام بہت بڑی عزت کے ساتھ زبانوں پر جاری ہیں یہ سب روشن اور صاف خیالات ہی سے دنیا میں یہ نسبت دیگر افراد کے ممتاز ہو گئے درنہ جسمانی عنصر کے لحاظ سے تو سب مساوی ہیں۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ جس صورت میں اُن کے خیالات سے جو بڑی بڑی مجلّات میں موجود ہیں۔ طبائع اور قلوب انسانی دماغ پر یہ کچھ اثر پڑتا ہو تو اُن کی زندگی کی حالت میں قلوب انسانی کیسے کچھ اثر پذیر ہوتے ہوں گے

(شوکت)



# سفرِ بغداد

۱۹۰۴ء

(کرلیجی تالیف)

(باجازت)

میں یہ نہ بتاؤں گا کہ میں کب اور کیوں اور کہاں سے روانہ ہوا، کیونکہ میرے دوست ان تمام باتوں سے واقف ہیں اور جو مجھے نہیں جانتے انہیں بتانے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کہ دینا کافی ہے کہ بغداد شریف جا رہا ہوں اور آج کل بصرہ کے اُس خوش سوازدندان میں جسے عرف عام میں قرقطیہ کہتے ہیں ہندستان سے آنے کے جرم میں دس دن کی قید بھگت رہا ہوں۔

۲۶ مارچ ۱۹۰۴ء کو اپنے پیارے دوستوں سے، کچھ ارمان بھرے اور زیادہ تر حرمان بھرے دل کے ساتھ جُدا ہوا، دوستوں نے جس عنایت اور محبت سے مجھے خیر باد کہا، اس کے شکر یہ کہ بجائے شکایت کو دل چاہتا ہوں، کیونکہ اُس نے جُدائی کے فتنے کو اور صد گونہ کر دیا۔

کراچی پہنچتے پہنچتے مجھے احباب اور اعزاء کی کشش کئی اور شہروں میں بھی لے گئی ۵

جلالین ادبی الفتن میں اہ سوزن کی قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہے

آخر کار ۱۸ اپریل کو جہاز کو لاہور پر کراچی سے روانہ ہو گیا، موسم نہایت خوشگوار تھا اور سمندر کی جبین پر زرا بھی بل نہ تھا، اور اگرچہ یہ میرا پہلا سمندر کا سفر تھا، لیکن میں نہیں جانتا کہ سرگرائی، اور طبعیت کا متلا تاسکتے تھے، اور اگر سفر بحر ایسا ہی ہمیشہ ہوتا تو میرے سفر پر سفر کرنے کو تیار رہوں۔ لیکن اب تک کہتے ہیں مئی، جون میں خلیج فارس کا مزاج بہت ہوتا ہے اور اس وقت دو کسی کی انہیں سنتے۔

۱۵ اپریل کو، کچھ مسافر کے قریب منقط پہنچے، اس مقام کو دیکھ کر طبعیت نہایت اچھی لگتی تھی۔ پہاڑ بھی پہاڑ ہیں۔ جن پر درخت کیسا، سوکھی لکھا اس کے ایک پتے تک کا نشان نہیں اور اس پر چاکم منقط کو درختوں سے سبب میری رائے میں اگر وہ اپنے تئیں ملک دور منقط کہیں تو نہایت مناسب رہے۔ شہر منقط پہاڑوں سے گھرا ہوا اور خود پہاڑ کی ڈھال پر درخت تھے اور دور سے تو خوش نما معلوم ہوتا، چرچے اور کئی منزل کے مکانات ہیں جو سمندر کے کنارے تک چلے آئے ہیں کراچی میں سردی تھی اور آگے چل کر تو مجھے پوری پوری سردی ملی۔ مگر یہاں خیر سے ابھی سے وسط مئی کا لطف آ رہا تھا۔

میں نے جہاں کہ اتر کے شہر دیکھے اؤں مگر قرطبیہ کے ڈاکٹر نے کسی کو اجازت نہ دی اور ہم منقط کو دور ہی سے ڈنڈوت کر کے ۶ بجے شام کو روانہ ہو گئے۔ منقط کے بعد بو شہر تک سمندر ذرا خراب تھا، مگر میری طبعیت پھر بھی خراب نہیں ہوئی ۸ اپریل کو ۸ بجے صبح بو شہر پہنچے۔ یہاں بھی اترنے کی اجازت نہیں دُور میں ہی سے شہر کو دیکھا، اور کچھ اچھا نہ پایا، (متاسفہ) بو شہر کے انگوڑے کھٹے ہوتے ہیں)

مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدھا بوشہر تو ہمارے جہاز کے گرد ہی آگیا تھا ایک صاحب مجھ کو قرظینہ پھرتے تھے یعنی اُن کی ٹوپی پر تہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا "قرظینہ" جس کے پیچے ایرانی نشان یعنی شیر آگے کے پیچے میں شیر لے کھڑا تھا مگر صرف ایک نمکی تھی وہ یہ کہ خود "قرظینہ" صاحب کی صورت ڈراؤنی نہ تھی۔ پھر بھی میں اُن کو ہمیشہ دس قلم کے فاصلے پر ہا جا رہے تھام کو انھیں بھی خیر باد کہا۔ ہر ایریل، منجے صبح سبحان اللہ سبحان اللہ ہم کس خطے میں جا رہے ہیں رات بھر میں یہ کیا ظلم ہو گیا، جہاز کی دونوں جانب کیسا دل کش منظر، ہر دو طرفہ خرے کے درختوں کی مسلسل قطاریں ہیں اور اُن کے پیچھے اور نیچے گلاب اور نارنگی اور انار کے درخت ہیں جو پھول اور پھل سے لدے ہوئے ہیں اور جہاں تک نگاہ دوڑے کے ذریعے سے کام کرتی ہو یہ مارے خوشی کے پاگل کر دینے والا منظر سامنے ہے اور میں حقیقت میں تھوڑی دیر کے لئے پاگل ہو گیا تھا۔ جہاز پر دو ڈراوڑا بھرتا ہوں کبھی اس طرف کے منظر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اس طرف کے۔

معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کے دجلہ اور فرات کے مجموعہ پانی کے سینہ پر چل رہا ہے اور ایک طرف ساحل ترکی ہو اور دوسری طرف ایرانی۔ دجلہ اور فرات کے نام نے میں عرض نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا اثر کیا۔ آہ! تو اب ہم اُن دریاؤں پر ہیں جو اسلامی تاریخ، اسلامی خزانہ، اسلامی ادب، اسلامی شاعری کے ہر صفحے پر موج زن ہیں۔

دجلہ فرات، دجلہ فرات! تو یوں کہیے کہ یہ اُن منتظروں میں سے گزرتے ہیں، اور ان ساحلوں کو میرا ب کرتے ہیں میں نے سوائے کشمیر کے کہیں کسی

دریا کا کنارہ اتنی دُور تک ایسا سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، اور اصل تو یہ ہے کہ جہلم کا کنارہ شاداب ہو اور بہت شاداب ہو، آخر ملک کشمیر ہے، لیکن دوطرف میدان نظر آتا ہو، اگرچہ سرسبز میدان ہو، یہاں اس دریا کے کنارے سوائے گھنے، اونچے اور سرسبز درختوں اور پھولوں کے آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے ہیں اور یہ آسمان ہو، نیچے پانی ہے، اور دائیں بائیں نظر کو یہ درخت روک رہے ہیں اور یہ سلسلہ میں سنتا ہوں کہ یہاں سے بغداد تک یعنی چار سو میل تک قائم ہے، آپ کا جہاز ان سرسبز پوش سنتریوں کے بیچ میں فادے سے (جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے) بغداد تک جا بیگا۔ شاید لوگ خرمے کے درختوں کی اس قدر تعریف سن کر زیر لب مسکرائیں گے، مگر یہ خیال رہے کہ یہ حجاز یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں ہیں، کہ چار یا پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں اور گرد بیکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان ہو۔ یہ عراقین کے نخلستان اور خرمستان ہیں جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھول اور پھل لگے ہوئے ہیں اور دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔

دونجے ہم حمزہ پونچے، یہ ایک چھوٹا سا مقام ہو، یہاں ایرانی سرحد ختم ہوئی ہو، اور یہاں سے دوطرفہ ساحل طرکی ہو۔

یہاں بھی دہری قرظینہ! کو لا پر برٹش سفارت کے ایک جج ہزار ہر بیڑہ تھو پکٹ قطنینہ سے بغداد شریف لے جا رہے تھے، جو جہاز ہندوستان سے آتا ہو، اُس کے مسافروں پر بصرہ میں ایک نہ دو، دس دن کا قرظینہ ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے یہ ترکیب کی گئی تھی کہ بغداد سے برٹش اسٹیم لائنز کا میٹ حمزہ بھیجا گیا تھا تاکہ وہ حمزہ سے اُس میں سوار ہو کے بصرہ جائیں اور کہیں کہ میں



فخر سے آ رہے ہوں تو اُن پر کو قرظیہ نہ ہو گا۔ لیکن وقت یہ آن پڑی کہ فخر کے قرظیہ کے افسوس نے کہا کہ اگر میاں اترینگے تو پانچ دن قرظیہ میں رہنا ہو گا! آخر کار یہ ہوا کہ لایق جہاز کے ساتھ ساتھ چلا اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو ایک خالی مقام دیکھ کر چپے سے جہاز کھڑا کیا گیا اور ہزار ہزار دھاک میٹ میں سوار ہو گئے اور باقی ہم سب یوں ہی سرت سے دیکھتے رہے۔

فخر سے بصرہ صرف کوئی تین عینیتیں میل کے فاصلے پر ہے اور ذرا آگے بڑھتے ہی بصرہ کے مقامات شروع ہو جاتے ہیں دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ ہیں، بیابانوں دیہی ہیں، مگر اب اتن میں امرائے بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں اور ان قدرتی بے حجابیوں میں انسانی زندہ پھول اور غنچے فطر آنے لگتے ہیں، یعنی حسین اور نہایت حسین یہودی آئینین اور غال غال ترک عورتیں لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کے لب دریا ہمارے جہاز کو دیکھنے آتے ہیں، اور ہم دوڑ دوڑ کے ٹک کے کنارے اُن کو دیکھتے جاتے ہیں، کاش یہ سلسلہ نامتناہی ہوتا، مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہنچ گیا، اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم قرظیہ پہنچائے گئے۔

زندہاں کو چلے چل چل کر

مگر حق یہ ہے کہ ہمارا قید خانہ بُرا نہیں، اُس کے سامنے دریا کا منظر نہایت عمدہ ہے اور رات دن کشتیوں کا تاننا بندھا رہتا ہے، یہاں گاڑی کا کام کشتی و جتی ہو، اس لئے کہ ہر وقت باد بانی، اور غیر باد بانی اور دھانی کشتیاں سامنے سے گزرتی ہیں، بعض یہودیوں کا جھرمٹ اُن کشتیوں میں عود بجاتا اور عربی کا سننے

جنہیں ہم خاک نہیں سمجھتے، گاتا سانسے سے گزرتا ہے اور عجب پُر لطف سین ہوتا ہے۔

قرنطینہ کا مکان سبکدوشوں کے لئے خاص آرام کا ہے، اور میں سوئے اس کے کہ تنہا ہوں، نہایت آرام سے ہوں، موسم بے انتہا پیارا ہے کھر کی کے سامنے گلاب کا تختہ کھلا ہوا اور نمک رہا ہوا، اور اگر یہ سچ ہے کہ ۵ بہشت آں جا کہ آزار سے (ہائے مار ڈالا کہ بخت، کس زبیر سے کاٹا ہوا، لکھنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کی جھنجھٹا بہشت کی آواز بھی تو نہیں سنی، ورنہ یہ تو خبردار کر کے کاٹتے ہیں) نباشد بد کسے ربابا کسے (ارے تیری ایسی کی تیری، پسو ہیں کہ قہر خدا کا، تمام کپڑوں کے اندر گھس گئے، اور مارے دوڑوں کے تمام جسم سوچ گیا) مارے (ارے تو بے پھر بیچ میں کاٹا۔ اب بغیر اس کے کہ تمام کپڑے آٹاڑوں، پیوڑوں کا ملنا مشکل ہو، چھڑ کو تو آسانی سے مار بھی سکتے ہیں، کل ڈانگے جاے گی، مضمون ختم کرنا ضروری ہو، اور یہ کاٹ کاٹ کر بے تاب کئے دیتے ہیں) نباشد بد تو یہ مقام بہشت (ہائے ہائے) ایسا کاٹتے ہیں، میں باز آیا اس بصرہ سے، اس شدت کے چچر اور پسو تو میں نے کہیں نہیں دیکھے ہے۔

اور یہ خیال رہے کہ مایہ اور اپریل کے بصرہ کا ذکر کر رہا ہو، ورنہ جون جولائی میں تو بصرہ کا نام لیتے ہوئے بھی زبان پر جیلا پڑتا ہے، رہا بقدر، تو وہ اس ولایت کا شہر یا نیننی نال یا کتہہ سمجھا جاتا ہے، کراچی سے یہاں تک جس شخص سے بغیر اذکار ذکر آتا ہو، مابین تعریف کے اس کی زبان خشک ہوئی

جانی ہے بغداد کا موسم یوں اچھا، میوسے یوں اچھے، پانی یوں اچھا غرض کہ ہر چیز اچھی ہی اچھی ہے۔

اور صاف تو یوں ہو کہ جگہ تو سب یہ اچھی ہیں، مگر دس دن کا قرطبیہ، خدا کسی کو اس مصیبت میں نہ ڈالے۔ اب مجھے بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ میں سن کی قید (غیبت تھا کہ قید یا مشقت نہ تھی) بھگت چکا ہوں قسمت میں یہ لکھا تھا۔ اب تک منظر ہی دیکھے، یا کسی آدمی سے بھی ملا، ہاں کہوں نہیں۔ کراچی سے سہ ماہ پر بیٹھے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب زیادہ تر دوسط ایرانی، عرب، یہودی ترک اور آرمینیوں سے ہو گا۔

جہاز پر میرے ہم کلاس تین صاحب تھے، ایک ایرانی، دو آرمینی، ایرانی صاحب کو اول تو میں انگریز سمجھا، باتیں کرنے سے خیال ہوا (چونکہ انگریزی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے) فریخ ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانی ہیں۔ آقا محمد نازی شیرازی نام ہے۔ شنگھائی سے آرہے ہیں، اور وطن جا رہے ہیں، شنگھائی میں بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ سن کے مجھے بہت بڑی خوشی ہوئی حقیقت میں بعد ممبئی کے مسلمانوں کے اگر تجارت میں کوئی مسلمان قوم ہمت سے کام لیتی ہو، تو وہ ایرانیوں کی قوم ہی، ترکوں کا تو اس میں نام و نشان نہیں۔ شیرازی صاحب اپنے ملک کے شہر تھے، اور ان کے خیالات سننے کے لئے میں نے خواہ مخواہ ایران اور ایرانیوں پر اعتراضات کرنے شروع کئے، اور مجھے ہنایت لطف آتا تھا جب وہ سچے جوش و خروش سے اپنے ملک کی حمایت کرتے تھے۔

دو دنوں آرمینی ممبئی میں تجارت کرتے ہیں اور اپنے وطن بصرہ کو آرہے ہیں۔

جب وہ عربی میں باتیں کرتے تھے، تو مجھے نیا لعین عربی بہت یاد آئے تھے کہ کاش وہ انھیں دیکھیں اور بتائیں کہ عربی نے ان پر کیا تتم ڈھایا، اچھے خاصے انگریز بنے ہوئے تھے۔

یہاں قوموں میں بہت مغالطہ ہوتا ہے مسلمان، عیسائی اور یہودی عبادِ قبا بھی پہنتے ہیں اور بہت سے کوٹ پتلوں پہنتے ہیں، ترکی ٹوپی سب اوڑھتے ہیں اور تو اور تاراموں سے بھی تو بتا نہیں جاتا کہ کون مسلم، کون غیر مسلم میرے ساتھی ارمنی جو تھے، اُن کے نام تھے۔ نصر اللہ مسیح اور شکر اللہ صباغ۔

یہاں ایک اور عجیب بات دیکھی، ہمارے ہاں تو انگریز عموماً اس بات کو بدتھیں کرتے کہ ہندوستانی انگریزی کپڑے پہنتے ہیں اور خاص کر یہ کہ انگریزی ٹوپی اوڑھیں، یہاں ترک اس بات کے خواہشمند ہیں کہ سب اُن کی ٹوپی اوڑھیں۔ چنانچہ یہ دونوں ارمنی انگریزی ٹوپی پہنتے تھے بھرپور پختے ہی ترکی ٹوپی پہنتے لگے، میں نے پوچھا تو کہا، ہم ترک کی رعایا ہیں، لہذا ہمیں یہاں ترکی ٹوپی پہنی ضروری ہے۔

یہودی عموماً عبادِ قبا پہنتے ہیں، اور عرب تو بالکل یہی، ترک سب یورپین لباس پہنتے ہیں اور اپنے تئیں یورپین سمجھتے ہیں، یعنی عربوں، یہودیوں اور ارمنیوں سے بالاتر۔

مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سرکاری نوکرا رمنی زیادہ ہیں اور ترک کم، اب تک مجھے پانچ چھ ترکی حکام سے واسطہ پڑا ہے۔ اُن میں سوائے احمد بک کے جو میرے سول سرجن ہیں، باقی سب (یعنی ڈاکٹر، ٹیپینہ، دیپید کارک وغیرہ) گریک یا ارمنی ہیں۔

احمد یک نو عمر آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کیسے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا۔ مگر فیشن ایبل جینس  
 بہت زیادہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے ابھی پیرس سے سلاؤ اگر منگو ائے ہیں۔  
 اس معاملے میں ہمارا علی گڑھ کلج دب کے نہیں رہا۔ قید تنہائی میں بیٹھا  
 بیٹھا دوستوں کی تصویریں اور گروپ جو ساتھ لایا ہوں، دیکھا کرتا ہوں، وہ دوا رمنی  
 بھی جو ساتھ ہی قید میں آئے اور تصویریں دیکھنے لگے۔ اور پوچھنے لگے، کیا یہ سب  
 ہندوستانی ہیں میں نے کہا، ہاں! تو انہیں یقین نہ آتا تھا، کیوں کہ وہ تو بمبئی کے  
 بوٹروں اور خوجوں کا لباس ہی ہندوستان کے مسلمانوں کا لباس سمجھتے تھے۔ مجھ سے کہتے  
 لگے کہ یہ تو ترک معلوم ہوتے ہیں، اور ان میں سے دو ایک کی تصویر کی بہت تعریف کی میں  
 نے کہا یہ کیا ہیں، ہمارے کلج میں ان سے بڑھ بڑھ کر ہیں۔

جن صاحبوں کی تعریف ہوئی، ہی میں ان کے نام نہیں لکھنے کا، جب فراملا  
 تو بتاؤں گا، فی الحال سب دوست سمجھیں کہ انہیں کی تعریف ہوئی ہے۔  
 لوگ یقین نہ کرینگے، مگر مجھے تند باد صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا، اب تو تنہا  
 معمر ہو گئے ہیں، اور جیسا سب جانتے ہیں، مدتِ مدید سے غائب ہیں، اور سیاحت  
 ترک کر دی ہے۔

میں نے عرض کی کہ اب سیاحت کو کیوں تشریف نہیں لے جاتے، فرمایا کہ اب  
 سیاحت کا اور جہاز رانی کا کیا لطف، دُخانی جہاز میں قبرہ سے بیٹھ، جہاں جاہو  
 چلے جاؤ۔ نہ خوف نہ خطرہ نہ جہاز کی تباہی، نہ نئے نئے جزیروں کا ملنا۔  
 میں نے عرض کیا، آپ نہیں تو آپ کی قوم، جو جہاز رانی میں سب کی اتاد رہی،  
 ہر وہ تو کچھ کرے۔ یا تو عرب دنیا بھر میں جہاز اور وہ بھی باد بانی جہاز نے پھرتے تھے

یا اب بصرہ سے بمبئی تک بھی نہیں لے جاسکتے، اس کو سن کر ایک آہ سرد بھری اور فرمایا: ”میاں تم ابھی بچے ہو، تم ان باتوں کو کیا جانتو، یہ نصرانی کا خالے ہیں عہ ہر کسے پنج روز زو بیت دوست۔ اب عرب وحشی اور جاہل ہیں اب جو لوگ اس کے اہل ہیں ان کے پاس یہ کام گیا۔“ یہ فرمایا، اور اس نورانی چہرے پر دو بڑے بڑے آنسو ڈھلکتے نظر آئے اور پھر وہ یکایک نظروں سے غائب ہو گئے۔  
 اس تقریر کا مجھ پر بھی بہت اثر ہوا، بڑی دیر تک میں خیال میں محو رہا اور پھر میں سوچا تو دیکھا کہ ان کا فرمانا صحیح تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

(۲)

(بصرہ تا بغداد)

رسید مشردہ کہ ایام غم نہ خواہند چنانہ دجنیں نیز ہم نہ خواہند چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارا بھی زمانہ رنج و محن یعنی قرنطینہ ختم ہو گیا اور ہم اپنے قفس سے بال بال دپر نکل آئے۔ قسمت کا ستارہ افج پر تھا یعنی اسی روز ”مجید“ نامی جہاز بغداد کو روانہ ہونے والا تھا بعد ”خرابی بصرہ“ قرنطینہ کے مکان سے رسید جہاز پر ہوئے۔ اب جہاز پر جو قدم پڑتا تھا اس میں ایک خاص غور کی شان تھی، کیونکہ اب ہم آزاد تھے اور اس لفظ آزادی کے معنی کی تہ پر ہم اب پہنچے تھے۔

سہ پہر کو جہاز بصرہ سے روانہ ہو گیا، اور اُس وقت میں نے اطمینان سے جہاز کا چکر لگانا شروع کیا، فرسٹ کلاس میں صرف ایک ترک مصطفیٰ افخمی آؤدی ناظر دیوان عمومہہ دلائین بغداد تھے، دوسرا مسلمان میں تھا (میں بھی مجبوری سے اس کلاس میں تھا) کیونکہ سیکند کلاس میں بالکل جگہ باقی نہ تھی باقی سب یہود و نصاریٰ

تھے، لیکن ڈکلاس باکل یہود و نصاریٰ سے پڑتی تھی، صرف ایک تھوڑا سا تھی جس میں  
 شوکتِ اسلام ظاہر ہو رہی تھی۔ اللہ اکبر! مسلمانی حکومت میں بھی دولت اور دولت  
 کے ساتھ عیش و آرام دوسری ہی قوموں کے پاس ہوا، انھوں نے دیر بعد کپتان سے  
 یہ یاد رہے کہ جہاز ایک انگریزی کمپنی کا ہے اور کپتان انگریز ہے، ہاتھوں میں اس کا  
 ذکر آگیا، تو اُس نے عجیب باتیں بتائیں، یہ کپتان تیس برس سے اس جہاز پر ہے  
 اس لئے اس کا تجربہ کوئی آج کا تجربہ نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ میں برس پہلے بغداد  
 کے مسلمان تاجر کسی طرح یہودیوں سے کم نہ تھے بلکہ بڑھ کر تھے، لیکن اس وقت  
 یہودیوں نے یہودیوں کو دین یا کہنا چاہیے امریکن ڈھنگ کی تجارت نہ کی تھی، اس لئے  
 مقابلہ برابر کا تھا، تاجر سچے میدان میں لڑ رہے تھے، لیکن پھر یہودیوں نے امریکن  
 ٹرسٹ کا قاعدہ اختیار کیا، جس میں تاجر کا مقصد شروع شروع میں نفع حاصل کرنا  
 نہیں ہوتا بلکہ اپنے حریف کو نقصان پہونچانا، اس لئے وہ حریف کو تباہ کر نیکی  
 لئے اپنا مال کوڑیوں کے مول بیچ دیتا ہے کہ خود بھی تباہ ہو جاتا ہو اور جب مقابلہ  
 کے لئے کوئی نہیں رہتا، تو میدان اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ  
 تجارت کا مالک بلا شرکتِ غیر ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسی طریقے سے یہودیوں نے  
 مسلمان اور نصاریٰ کو تجارت کے میدان سے نکال دیا ہے اور اس وقت بصرہ اور  
 بغداد کی تین چوتھائی دولت اور تجارت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ یہودیوں کے بعد نصاریٰ  
 کا نمبر ہوا اور مسلمان تیسرے درجہ پر ہیں۔ عراق و شام کے یہودی بھی قازقستان کے  
 سے عجیب قوم ہیں اہل بائبل انھیں قید کر کے لائے اور حالتِ جلا وطنی میں انہوں نے  
 دولت پیدا کرتی شروع کی، یونانی و رومی و عرب و عجم و مغول و ترک نے جیسے بعد

دیگر سے حکومت کی مگر اس قدیم قوم نے ان سب کو اپنی دولت کا بوجھ کھینچا اور سمجھتی ہے اور انھیں اُن کی چوکیداری کا حق دیتی ہو اور خود دولت پیدا کرنے میں مشغول رہتی ہو۔ چوکیدار کبھی کبھی انھیں ذلیل سمجھتے ہیں مگر وہ پیہ کی ضرورت ہوتی ہو تو انھیں کے آگے دست سوال دراز کرتے ہیں۔ اس وقت بغداد میں کوئی ہاجن اور بنیکر غیر یہودی نہیں ہے۔

یہ تو اُس دولت کا حال ہو جو چلتی پھرتی چھاؤں کی جاتی ہو گویہ چلتی پھرتی چھاؤں اُن کے پاس سے چلتی پھرتی نظر نہیں آتی) مگر قدرت نے ایک دولت یہاں مادی تقسیم کی ہو اور وہ دولت حق ہے۔ یہود و نصاریٰ و ارمنی و عرباء کی سب قومیں اس سے برابر ہر مند ہوئی ہیں، ہمارے سوائے میرے اور چند دیگر ہندیوں کے جو کہ بلائے معلیٰ کی زیارت کو جا رہے تھے کوئی سا نولانہ تھا، یہ تو مردوں کی کیفیت تھی اور عورتوں کے حسن کا عالم تو یہاں کچھ درہی ہے۔ میں نے بغداد میں ابھی تک سوائے حبشیوں کے کوئی گریہ المنظر عورت نہیں دیکھی جس میں سب میں یکساں ہو لیکن چونکہ علیائیموں اور یہودیوں میں پردہ مطلق نہیں اس لئے جلب نظریہ زیادہ کرتی ہیں عراق کشمیر یا یورپ کی طرح سر ملکہ نہیں، قریب قریب ہندوستان کے برابر گرم ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہو کہ قدرت نے یہ نعمت بھی یہاں کے لوگوں کو ایسی دریا دلی سے رکھی ہے؟ ہمارے بھی مجمع حیثیتوں کا غیر معمولی نفا اور دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ چھوٹے پیمانہ پر محاصرہ ٹرائے اور محاصرہ چتور گڑھ کے واقعات ”مجید“ پر بھی ہوئے ہیں اور ہیلن اور یمینی کی ایک جانشین دو یہودی خاندانوں کے امن و امان میں خلل انداز رہی یعنی ایک نہایت حسین لڑکی مع اپنے والدین کے بغداد جا رہی تھی



اس لڑکی کی شادی بغداد کے ایک نوجوان یہودی سے ٹھہری تھی، وہ بھی ساتھ تھا لیکن جہاز پر ایک دوسرا نوجوان سے اپنے والدین کے تھا۔ جو لوگ اس بات پر اصرار ہوئے تھے کہ اوّل الذکر نوجوان سے شادی نہ ہونے دیں بلکہ اس لڑکی کو اپنے گھر کا نور بنائیں۔ روزانہ ان تینوں خاندانوں میں کسی نہ کسی بہانے سے لڑائی ہوتی تھی یہاں تک کہ بعض اوقات کینان کو دخل دینا پڑتا تھا۔

شہر، جیمسٹ کریں فتنہ پر آشوب۔ ایں قدر نیز نیا یہ کہ کسے خوب شود  
گمراہ میلنیوں اور پدنیوں کے لئے پیرس اور علماء الدین ملجی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں  
اُن کی خاطر ہزار ہا خلق خدا کا خون کر دیتے ہیں یہاں اگر تین خاندانوں میں لڑائی ہو گئی تو کونسا نفع ہے۔

دوسرے روز شط العرب (جسے میں نے اس سے قبل دجلہ و فرات کا مجموعہ یا نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہا تھا) ختم ہو گیا، یعنی وہ مقام آگیا، جہاں دجلہ و فرات کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اور پھر ہمارا جہاز الف لیلہ کے چہیتے اور شیخ سعدی اور شمس العرب کے حمد وچ دریائے دجلہ پر چلنا شروع ہوا، اللہ سے دجلہ کی پیچیدگیاں شاید ہی کوئی دیکھا یا سنا ہو اور عکیر گھاتا جاتا ہو۔ اس وجہ سے جہاز بہت کم فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ اگر دریا بید رہا ہوتا تو جہاز زیادہ فاصلہ طے کرتا، مگر مجھے ایسے غیر لطف منظر کب نظر آئے؟ ہاں اس وقت یاد آیا، ناؤ سے بصرے تک کے منظر کی میں نے بجز تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ میں سُنتا ہوں کہ بصرے سے بغداد تک دریا کے دونوں کناروں پر ایسے گھنے درخت نہ تھے جیسے ناؤ سے بصرے تک تھے، لیکن پھر بھی بڑے اعلیٰ درجہ کے اور دلکش نخلستان نظر آئے جو شادابی میں تو بصرے کے

نخلستانوں سے شاید بڑھے ہی ہوئے تھے اور جگہ کے کنارے صحرا نور بدول کے  
 خیمے بھی نظر آئے ہمارے جہاز کو دیکھ کر یہ لوگ کنارے پر ساتھ ساتھ دوڑتے اور  
 پیچھتے چلاتے تھے اور جہاز کے مسافران کے لئے خیمے اور زانگیاں پھینکتے تھے جنہیں وہ  
 بڑی شوق سے اٹھاتے تھے اور بایستے تھے، ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ یہ بھی  
 قضا و قدر کا ایک چھوٹا سا مذاق ہے کہ جن ممالک میں ہزاروں برس اول مدینیت نے انیسویں  
 ترقی کی ہو کہ باہل و دینو اور مدائن کا نام تاریخ میں یادگار ہے، وہاں بیسویں صدی  
 عیسوی میں بادینیتین عرب اپنے خیمے لگائے پڑے ہوں اور تمدن میں صرف اتنے  
 بڑھے ہوں کہ گلے چراتے ہوں کوں کہہ سکتا ہو کہ انسانی ترقی دیر یا ہری؟ اب ہم  
 اس خطے میں جا رہے تھے جس کا چپہ چپہ قدیم تاریخ کی زینبت ہے۔ وہ جہاں بلکیاں چری  
 ہیں طاق کسریٰ ہی، وہ مٹی کا ڈھیر جو مزیدہ معلوم ہوتا ہے سلویا (مدائن) ہے۔ وہ کوئے  
 میں ابق کے کنارے جو مقام نظر آتا ہے وہاں یونانی خبرل فلاں و فلاں خیمہ بن ہوا  
 اور وہاں رومن شاہنشاہ کا پرچم لہراتا تھا۔ جب وہ یہاں سے گزرا تھا۔

جو تھے روزیار تھا، گلزار تھا، باد صبا تھی، میں نہ تھا، نہیں میں بھی تھا، ان  
 کے نونجے تھے آفتاب میں مطلق تمازت نہ تھی، ہوا نہایت خوشگوار تھی، کہ ہم  
 شاہد مقصود سے ہم کنار ہوئے یعنی دارالسلام مدینہ بغداد پہونچے۔

جہاز آہستہ آہستہ مگر بغداد کسٹم ہوس تک پہونچا، اس عرصے میں میرے  
 خیالات نے آہ! کس کس زمانے اور کس کس وقت کی سیر کر لی اور کن کن واقعات  
 کو حجم کر کے اپنے سامنے بلالیا! مگر گریہ پہونچتا تھا کہ کسک سیر خیالات عہد خلافت  
 عباسیہ سے بڑی بیدردی سے دایں بلائے گئے۔ کشتی والوں اور چالوں کی

ایک فوج سے میں محصور کر لیا گیا۔ جنہوں نے بڑی فصاحت اور روانی کے ساتھ مجھے عربی سنانی شروع کی، اور میری طرف سے اس عربی کی داد نہ ملنے پر کسی نے نکس اٹھایا کسی نے بستر میں کچھ فارسی کی لیاقت جتنا آہوں اور کچھ ترکی کی ٹانگ توڑنا ہوں مگر وہاں کون سنتا ہے۔ آخر یہ ہی مناسب سمجھا کہ اگر اسباب گم کرنا منظور نہیں ہے تو ان لوگوں کے ساتھ ہو لینا چاہیے ۵

رشتہ درگرم افگندہ دوست“ می بردہر جا کہ خاطر خواہ دست  
اسباب ایک کشتی میں رکھ دیا گیا، اور میں بھی اس طرح گویا کہ اسباب کا ایک جزدہ  
ایک کونے میں رکھ دیا گیا، ادویوں پایدست درگرمے دست بدست درگرمے ہم  
(یعنی میں منہ اسباب) مگر کہ پہونچے، اور وہاں اپنی قبیل ترکی دانی نے اس قدر سمجھا دیا  
کہ اگر اپنا کل اسباب بکھردانا نہیں چاہتے، اور اپنی کل کتا میں ضبط کرنا نہیں چاہتے  
تو ایک روپیہ افسر مگر گے بھینٹ چڑھاؤ۔ ہم نے خوشی خوشی اس قاصی الحاجات  
روپیے کو نذر کیا اور مگر گے سے باہر آئے، یہاں ایک صاحب جو میرے آنے سے واقف  
تھے۔ مگر مجھ سے واقف نہ تھے ملے، میں نے اپنے تئیں اُن کے سپرد کیا اور اب  
ہماری پریشانیوں اور تکالیف کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد الحمد۔

.....

.....

.....

آج مجھے بغداد میں دو ہینے ہو گئے ہیں، اس لئے اس کے متعلق رائے کچھ دیکھ کے  
قائم ہوئی ہے، یورپ والے تو ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ شہروں کو بھی خراب کہتے

ہیں، لیکن جہاں تک میونسپلٹی کا تعلق ہے، بغداد، ہندوستان کے شہروں سے بھی گھرا کر  
 ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں میونسپلٹی نہیں، میونسپلٹی ہے، اس کا رئیس (ریسڈنٹ) ہے، اور منتخب  
 شہر اور حکومت کے نامزد کردہ، دونوں قسم کے اعضاء (ممبر) ہیں، مگر شہر کے (اور شہر  
 چھوٹا نہیں، بڑا غذا شہر ہے) تمام گلی کو سچے کچے ہیں، کوئی کیڑی نہ لگے، کو سچے  
 سنگ اور پیپار جن میں ہفتہ بھر کوڑا پڑا رہتا ہے، ہفتہ میں ایک مرتبہ صفائی کھیتی  
 ہے، صرف میدان یعنی وہ حصہ جہاں تریک رہتے ہیں اور کچھریاں ہیں، صاف ہے اور  
 وہاں سڑکیں بھی چوڑی ہیں، مگر کچی لیکن سچ

عیب سے جملہ بگھتی ہنریش نیرنگو

بغداد کے مکان سب پکے اور شاندار ہیں، وجہ کے دونوں کنارے قصر بہت  
 خوبصورت اور نئی وضع کے ہیں، سڑک سے مکانات میں داخل ہو جیتے تو تعجب ہوتا  
 ہے کہ مکانات میں کیسی صفائی رکھی جاتی ہے۔ یہاں عام طور پر لوگ مصارعت زندگی پر  
 زیادہ خرچ کرتے ہیں، مکانات کے تمام کمرے (یورپین وضع میں) سجے  
 ہوتے ہیں۔ سلاطین یا مسافر (دراکننگ روم) کی آرائشیں بہت صرف  
 کیا جاتا ہے اور اکثر ڈرائنگ روم کے سٹ نہایت خوبصورت اور قیمتی ہوتے ہیں۔  
 اہل بغداد کے شوق کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ باوجود ان سڑکوں کے یہاں  
 بہت سی فتن اور بگھیاں ہیں اور کم دہش سوائسنگلیں ہیں جو ان سڑکوں پر خدا ہی عانتا  
 ہے کس طرح دھڑکتی پھرتی ہیں۔

گورنمنٹ ہوس یعنی وہ عمارت جس میں تمام کچھریاں اور دفاتر ہیں اور جسے یہاں  
 سربراہ حکومت کہتے ہیں۔ بڑی شاندار عمارت اور دفاتر ہندوستان کے دفاتر

کے بلکہ ان سے بہتر سمجھے ہوئے ہیں۔

مدینۃ العلم و الفضل بغداد، اپنی تمام فضیلت کھو بیٹھا ہو۔ مدرسہ نظامیہ کے شہر میں  
آج پرانی یا نئی تعلیم کا کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہے جسے کالج کے لقب سے یاد کیا جائے  
ہاں دس بارہ اسکول ہیں جن میں زیادہ تر یہود و نصاریٰ کے یا امریکن مشن  
پریسٹنٹ مشن فرسٹ کیتھولک مشن کے ہیں۔ یہ اسکول ہندوستان کے مشرقی  
اسکولوں کی طرح بہت منظم اور عموماً حالت میں ہیں مسلمانوں کی طرف سے کوئی اسکول  
نہیں۔ صرف حکومت کی طرف سے چند اسکول ہیں۔ مثلاً مکتب ابتدائہ، مکتب  
رشدیہ، مکتب اعدادیہ، مکتب صنایع، مگر اہل شہر عرب مسلمان ان میں بھی کم پڑھتے  
ہیں، بالترک ہی زیادہ تر ان مدرسوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مکتب اعدادیہ فوجی اسکول ہے، یہاں سے تعلیم پا کر طلبہ قسطنطنیہ کے ملٹری کالج  
میں بھیجے جاتے ہیں۔ اعدادیہ کے سب طالب علم فوجی دردی پھنتے ہیں اور یہ  
گورے گورے چھوٹے چھوٹے کپتان و کرنیل و جنرل اپنی چھوٹی چھوٹی دردیوں اور  
لال لال ٹوپیوں میں بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا خبر، کوئی آئینہ زمانہ  
کا عثمان پاشا ان ہی میں پڑھ رہا ہو۔

یہاں تعلیم نساں کے معنی صرف مضامین متعلق تعلیم نساں لکھنا نہیں ہے  
غیسائیوں اور یہودیوں کے تو بہت سے مدارس نساں ہیں۔ اس کے کہنے کی  
ضرورت نہیں؛ مسلمانوں کے لئے بھی ایک مکتب نساں ہے، جو اپنی اسکول کے  
درجہ تک ہے۔ اور اس میں ترکی اور بعض عربی خانیں پڑھتی ہیں۔ خانموں کے ذکر  
میں پردہ کا ذکر بھی بے موقع نہ ہو گا یہاں تمام مسلمان عورتیں، ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ

کی برقع اوڑھ کر خود بازار جاتی ہیں اور خود خرید و فروخت کرتی ہیں، ترکی خاتون کا پردہ بالکل برائے نام ہوتا ہوا، اُن کے چہرے کا نقاب اس قدر باریک ہوتا ہے کہ بعض اوقات قریب سے دیکھنے والوں کو چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ لباس ترکوں کا بالکل انگریزی ہی ہے۔ لیکن عربوں کا عربی ہوتا ہے۔

ترکی حکومت کا رسول انتظام کیا ہی ہے اور خدا شاہد کہ اس میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے، لیکن میں افواج عثمانی کی بہت تعریف سنا تھا، وہ بہادر اور توانا ضرور ہیں مگر اتنا کہنا پڑتا ہے کہ احمد فیضی پاشا مشیر (کمانڈر انچیف) ولایت بغداد عساکر عثمانیہ کو اچھی حالت میں نہیں رکھتے، در دیاں بھیڑی ہوئی ہیں، جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں اور وہ اس حالت میں سڑکوں پر پڑے پھرتے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ مالک عثمانیہ کی دیگر ولایات ایسی ابتر حالت میں نہیں ہیں، انھیں خرابیوں کے رفع کرنے کے لئے سلطنت عثمانیہ میں کئے گئے تعلیم یافتوں کی ایک پارٹی جو جسمیں عام طور پر اس کے فرانسیسی نام (نوجوان ترک) کے نام سے پکارتے ہیں، اور جسے انگریزی اخبارات ینگ ٹرکس پارٹی کے لقب سے یاد کرتے ہیں، یہ پانی ٹرک کی کینشل کانگریس سمجھتی جاہل ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ اس ٹرکس کینشل کانگریس کے ممبر ٹرک ہیں۔ اب یہ زبان نہیں کھول سکتے اور انڈین نیشنل واسے دھڑلے سے ہندوستان میں چلتے کرتے ہیں اور اخبار نکالتے ہیں۔ بانی اس پارٹی کا مرحوم مدحت پاشا تھا جسے میں اپنے عقائد کے موافق ٹرک کی کالبرل سید احمد خاں اور پوٹیکل نجات دہندہ سمجھتا

۱۔ یہ ولایت بغداد کے مشیر ہیں اور اب کوئی سالانہ سے دائی پندرہ روزہ جرنل غلبا بھی بھی ہیں۔ یہاں عام طور پر ان کے منظم سے ناراضی پھیلی ہوئی ہے۔

ہوں۔ اس پارٹی والے بے چارے، لندن اور پیرس میں جا جا کر جلسے کرتے ہیں  
 وہاں سے اختیار نکالتے ہیں مگر ان کے ہمدرد یہاں "جز آں کہ بصدق دل" عامیہ کنیز  
 اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ پارٹی ہمیشہ ایسی ختمہ حالت میں نہیں رہی، جب میں اللہ  
 مرحمت پاشا کا دور دورہ تھا، تو اس پارٹی کا زور تھا، اور ششہ میں طرکی کو پارلیمنٹ  
 نصیب ہو گئی تھی، اکاش دہ دورہ قائم رہتا، تو آج ٹرکی کا چھوٹا بھائی، جاپان اکیلا  
 ترقی نہ کرتا، بلکہ ترقی کی بساط پر اس کے ساتھ یہ بھی بیٹھی ہوتی۔

اس پارٹی کے چند ممبروں سے میری بھی ملاقات ہوئی، اور تبعہ دولت اجنبی  
 سمجھ کر اپنے خیالات کو انہوں نے مجھ سے ظاہر نہیں کیا۔ ان کی لیاقت ان کی  
 وسعت نظر، ان کی حسبِ وطن اور حسبِ ملت دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ ملک  
 کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سلطان عبدالحمید خاں سے بالکل خوش نہیں اور  
 انہیں ہمیشہ تخت سے اتارنے کے درپے رہتے ہیں، ابھی حال ہی میں ریوٹر نے  
 اطلاع دی تھی کہ خود سلطان کے داماد، کامل پاشا، بہت سے اعلیٰ عہد دار  
 کے شاہزادی غریبہ دختر معزول سلطان مراد خاں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کھنے  
 کے جرم میں پکڑے گئے۔ یہ بھی ننگ ٹرکس پارٹی کی ناکام کوششوں سے ایک  
 کوشش تھی، یہاں اس کے حالات مفصل معلوم ہوئے ہیں، باکوشش یہ تھی کہ  
 سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کر کے سلطان مراد کو دوبارہ تخت پر بٹھائیں، مگر یوپی  
 نہ ہوئی، تو جوان ترکوں کو چھوڑ کر عام اہل ملک بہت وقار معلوم ہوتے ہیں۔

اللہ اللہ! بغداد کی خاک میں کیسے کیسے بزرگ سوتے ہیں، امام موسیٰ کاظم د  
 امام محمد تقی علیہم السلام، شیخ عبدلقدار جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ

اُن کے مزاروں کی زیارت میں نے کی، اور ہر جگہ نہ معلوم کن کن خیالات کا جوہر ہوا  
افسوس ہو کہ میں مذہبی آدمی نہیں اور نہ مجھے مذہبی واقفیت ہوتا، ہم میرے بڑے بھروسہ  
پر اس امر کا اثر ہوتا تھا کہ میں ان بزرگوں کی حضور میں ہوں جو اپنے علم اپنی  
فضیلت اور اپنے تقدس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کیلئے باعثِ فخر و سببِ برکت تھے،  
امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا مزار نہایت ہی شان دار ہے، مگر شیخ، اور امام  
ابو حنیفہؒ کے مزاروں کی عمارتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں، تاہم کیا اُن کی شان مزاروں کی  
رفعت سے متغنی نہیں؟

مگر دار الخلافہ بغداد کے شاہی محل کہاں ہیں؟ وہ کتب خانہ، وہ مدرسے، وہ  
وصدگاہیں کدھر ہیں؟ مدرسہ نظامیہ کس جگہ ہے؟ قصر خلعت کس طرف ہے؟ آہ! یہ  
سوالات ہلاک و خاں سے کردہ۔ ہم کیا جواب دیں۔ شمسِ اکملہ مولانا حالی دہلی کے  
سیاح سے کہتے ہیں ۵

لیکے داغ آہنگا سینے پہ بہت سیاح دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز  
لیکن یہاں اس نصیحت کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہاں کھنڈر تک نہیں رہے  
دلالتِ بغداد کے سرکاری سال نامہ میں مؤلف تاریخی عمارات کے ذکر میں فرماتے ہیں  
جہاں آج کل دفتر نظارتِ رسومات ہے، وہاں مدرسہ نظامیہ تھا،

ہارڈن اور راموں کی تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہے!! ہاں ایک زبیدہ کا مقبرہ تو  
شکستہ حالت میں باقی ہے، جہاں عجب راہزن رات کو جمع ہو کر مالِ غنیمت آپس میں  
تقسیم کرتے ہیں۔ بابل جو ہزاروں برس پہلے تباہ ہوا اس کے کھنڈر تو باقی ہوں اور  
نہ باقی ہوں تو عیاسیوں کے جاہ و جلال کے نشان! مگر بابل کو ہلاک کرنے غور اہی



تاراج کیا تھا۔  
 کیا یہ تنجب کی بات نہیں کہ جو قوم بغداد کو تباہ کرے اُسی کی ایک شاخ  
 جامع مسجد و قلعہ دہلی، تاج محل آگرہ جیسی عمارتیں ہندوستان جا کر بنائے گیا  
 یہ مغلوں کی طرف سے تباہی بغداد کا نادانستہ کفارہ تھا؟  
 بہر حال اسے بد بخت دہلی و آگرہ: تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تمھاری بہت  
 سی عمارتیں قائم ہیں؛ اور تمھارے کھنڈر ابھی غائب نہیں ہوئے مگر اسے  
 بغداد! — ۹

سیاح و حید (بلدیرم)



# فروعِ ادب

(باجازت)

اگر ادبی رسالوں کی کثرت۔ اخبارات کی بہتات اور نئی کتابوں کے اشتہارات کو دیکھ کر اسے لگائیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں علمِ ادب کو بہت فروغ ہے۔ اور اردو زبان کے دن پھرنے والے ہیں۔ لیکن نظر غائر سے دیکھیں۔ تو یہ آہنا ترقی محض سطحی ہے۔ اور ابھی ہمارے ملک میں لٹریچر کی وہ قدر جس کا وہ مستحق ہے۔ پیدا نہیں ہوئی ابھی نہ ادیبوں کو یہ خبر ہے۔ کہ ان کے سینوں میں کیسی دولت اور ان کے دماغوں میں کیسی قوت پنہاں ہے۔ اور نہ ان کے خرمینِ ادب کے غوشہ چین یہ جانتے ہیں۔ کہ انھیں ادبی خدمت کرنے والوں کی کس درجہ قدر کرنی چاہیے۔ دنیا میں لٹریچر سے بڑے بڑے کام نکلے ہیں اور نکل سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی اردو خواں دنیا ابھی اس اصول سے بہت کچھ بے خبر ہے۔ لٹریچر نفا ہر تو الفاظ کا مجموعہ ہے مگر الفاظ اگر دل سے نکلیں۔ اور کسی عالی مقام کے انکار کا نتیجہ ہوں تو ناپائیدار ہو جاتے ہیں۔ اور دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ لیکن مشرقِ طیبہ کی ادیب فنا فی الادب ہو جائے۔ اٹھتے۔ بیٹھتے۔ سوختے۔ جاگتے اسے فکرِ سخن کے سوا اور کوئی کام نہ ہو۔ وہ ہوا اور اُس کی کتابیں۔ وہ ہوا اور اُس کے خیالات دنیا کے معمولی تفکرات سے جہاں تک ممکن ہو اس کی قوم یا اس کا ملک اُس کو بیفکری نہ کرے اور عملی زندگی کی کشش سے وہ الگ اور آزاد رہے۔ یہاں کیا ہوتا ہے

جہاں کہیں کسی شخص میں اس کمال کی جہلک نظر آئی۔ لوگ ہر قسم کی توقعات اس سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے معمولی تحریرات کا کام بھی اسی سے لو۔ کوئی کہتا ہے تقریر کے لئے بھی اسے ہی بلاؤ۔ کوئی اسے کسی تحریک کا بانی بنا چاہتا ہے۔ کوئی کسی تجویز کا عملی پیشوا بے چارہ ادیب خراسان ہی تو ہے۔ اور کوئی اسے کمزوریوں سے خالی نہیں۔ اسے یہ گونا گوں رجوع خلائق اپنی اصلی جگہ کھڑا نہیں رہنے دیتا۔ کہیں میدان تقریر کی تالیوں کی دلکش آواز اسے بھائی ہے، کہیں عارضی تحریریں کی داد اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، کبھی سیاسی تحریکوں کی دلچسپی اور آسان شہرت اسے اپنا گردیدہ بناتی ہے۔ اور کبھی وہ تجارتی تاجر سے مالا مال ہونے کی آرزو کا شیرازی ہوتا ہے۔ اس رنگارنگ کی کشش کے سبب غافل ادیب اس کی آہ سے معراج کمال پر پہنچتا ہے ایک کٹھن اسے نظر آتا ہے۔ جب وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر وہ ایک گوشہ تنہائی تنہائی میں بیٹھ کر حوصلہ شکن رہے گا تو خواہ وہ کیسے ہی اچھا اور اچھوتے خیال پیدا کرے۔ مدتوں خود اس کے سوا کوئی ان کا مزالینے والا نہ ہوگا۔ اگر ان کو شائع کرنا چاہیگا۔ تو اس کے پاس شاعرت کے خراج کیلئے روپے نہ ہونگے اور اگر صرف برداشت بھی کر سکے گا تو شاید دیر تک اس مطبوعہ مجلس کا کوئی خریدار نہ پیدا ہو۔ تو وہ اس شہرت کو جو فوراً یا جلد ہاتھ آئے۔ خواہ ناپائیدار ہو، شہرت پائیدار پر جو ایسی معصائب بگڑے بعد ہاتھ آئے ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو ترقی ماہ و منصب کی ہر بلندی اور ہر شہرت اس حیات جاوید کے مقابل جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جنہوں نے اعلیٰ لڑچکر کی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں کیا حقیقت رکھتی ہے ؟

آج کل بہت سے ادبی قابلیت والے داغ اپنا کام معمولی مضمون نگاری سے شروع کر کے مضمون نگاری پر ختم کر دیتے ہیں۔ مضمون نگاری بطور مشق تو ابتدا میں لازم ہے۔ مگر حیف ہے اگر یہی انتہا ہو ہو۔ قوت مضمون نگاری اکثر ذہنی سیاسیات نظر آتی ہے۔ سیاسیات بجائے خود اہمیت رکھتی ہیں اور جدید زندگی کے لوازم میں ہیں۔ لیکن جو درجہ ہمہ اوست کا سیاسیات کو ہمارے ملک میں بعض اصحاب نے دے رکھا ہے یہ نہ اُن کے لئے نہ اغراض ملکی کیلئے مفید ہے بلکہ خود سیاسیات کی خدمت لٹریچر کے ذریعے سے بہت کچھ ہو سکتی ہے۔ کسی استاد فن کا ایک فقرہ یا ایک مصرعہ با اوقات زبان زد خاص و عام ہو کر سیاسی فحش میں ایسی لہر پیدا کرتا ہے جو سارے ملک میں پھیل جاتی ہے۔ اور ملک کی سیاسی زندگی میں جان ڈال دیتی ہے۔ جو لوگ اس ایک فقرہ یا ایک مصرعہ سے محفوظ ہوتے ہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ جس شخص کی زبان سے وہ فقرہ یا وہ مصرعہ نکلا ہے۔ اس نے کتنے ایسے فقرے یا مصرعے سوچے اور رد کئے ہونگے۔ بیشتر اس کے کہ اسکی نگاہ انتخاب ان سوزوں الفاظ پر پڑی۔ جنہیں سن کر ہر شے والے نے یہ سمجھا کہ کہنے والے نے گویا اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔ اُمیر مبنائی نے کیا خوب کہا ہے

۵ اُمیر اک مصرعہ ترتیب کہیں صورت دکھاتا ہے  
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو و بوس

یہ محنت۔ یہ کوفت برداشت کرنا۔ یہ سوز یہ گداز ادیب کی زندگی کے لئے بائہ نام ہے اور اپنے جوہر اصلی کی حفاظت کرنا اس پر فرض ہے۔ اور اُس کو اُس کی حفاظت میں مدد دینا اہل ملک کے لئے لازم ہے۔

یہ اصول اگر عام طور پر تسلیم ہو جائے اور اس پر عمل درآمد ہونے لگے۔  
 تو ادب کو وہ فروغ نصیب ہو۔ جس کی آرزو ہر اداس سے ملک کے حق میں  
 مفید نتائج پیدا ہوں۔ جب اہل ادب اس اصول پر کار بند ہوں۔ اور  
 اُن کے ابنائے ملک اُن کے کام کی کما حقہ قدر کریں تو ادب کی ترقی کا ایک  
 نیا دور شروع ہوا۔ اس نئے دور کے متعلق اردو کی ادبی دنیا کو چند باتیں خاص طور  
 پر ملحوظ رکھنی چاہئیں اول یہ کہ اعلیٰ درجہ کے ماہران فن کے کمالات تو اپنی  
 قدر دانی پر خلافت کو خود مجبور کر لیتے ہیں۔ قدر دانی وہ چاہیے جو ہر کہ دمہ کو حسب  
 مراتب نصیب ہو۔ یعنی جیسے کسی عمارت کے کام میں معمار، مزدور، تاجر، آہن گر، نقشہ  
 نویس، اور دیگر سب درکار ہیں۔ اسی طرح ایوان ادب کی تکمیل کے لئے  
 ناظم ناشر، فنانہ نویس، مورخ اور مترجم سب بکار ہیں۔ اور ہر کسی کا کام اپنی جگہ  
 اہمیت رکھتا ہے۔ گو شائقین ادب کے زمرہ میں کچھ لوگ نظم کے زیادہ دلدادہ  
 ہونگے۔ اور کچھ نثر کے زیادہ قائل بعض فسانوں کے مشاق اور بعض تاریخ کی طرف  
 مائل کوئی ترجمہ سے حظ اٹھانے والے اور کوئی طبع زاد مضامین کی تلاش میں  
 رہنے والے۔ لیکن یہ کسی کو حق انہیں کہ ادبیات کے کسی ایک حصہ کو بے قدر یا حقیر  
 جانے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ادبی دنیا کے سب کارکن فروغ ادب کے خواہاں  
 ہیں اور اُن کا مقصد اصلی ایک ہے۔

عبد القادر

# حضرت داغ دہلوی اور حضرت امیر سیاحی

(راجازت)

جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہونا انسان کی ہستی سے باہر ہو کیونکہ شاعری کی دنیا ایسی دنیا نہیں کہ چند روزہ زندگی میں اس کی تمام منتزلیں طے ہو جائیں اسکی پوری پوری سیر کرنے کے لئے عمرِ فوج و دربار ہو سخن کے دریائے ناپید کنار میں ہزاروں موتی ہیں اور بڑے بڑے تیرنے والوں نے اس میں غوطہ زنی کی مگر ایک آدمی موتی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا ان کا خاص سبب یہ ہو کہ شاعر علوم پر خواہ کتنا ہی عبور رکھتا ہو مگر ابتداء سے اس کا دلی رجحان کسی خاص صنف کی طرف ہوتا ہو اور اسی میں اس کی شق حاصل ہوتی ہو یعنی اگر قصیدے کی طرف توجہ ہے تو قصیدے ہی میں کامل ہوگا غزل سے دلچسپی ہو تو غزل ہی کا استاد شمار کیا جائیگا۔ ہمارے پیدا کر لینا دوسری بات ہے مگر کہاں صرف ایک ہی صنف میں ہو سکتا ہے۔

فردوسی، النورینی، سعدی وغیرہ گو مسلم الثبوت استاد تھے لیکن ان کی شاعری بھی ابیات اور قصائد اور غزلیات کے دائرے میں محدود تھی۔ اسی طرح اردو شعراء بھی ایک ایک رنگ کے استاد گزرے ہیں۔ ریختہ گوئی کا میدان بقول حضرت غالب دہلویؒ

ریختہ کے تمغے استاد نہیں ہو غالب  
مستے ہیں اگلے زمانے میں کوئی امیر بھی تھا

میر تقی کے ہاتھ رہا۔ مرثیہ گوئی اور مرح اہل بیت علیہم السلام میر تقیؒ اور

مرد اور ہر کے حصے میں آئی۔ داسوخت اور مثنوی امانت اور مہر حق نسیم کے لئے  
 وقف ہوئی اسی طرح تمام تش و ناسخ وغیرہ بھی اپنے اپنے رنگ کے آئاد ہوئے  
 غرض یہ کہ آستادوں کو اس فن سے واقفیت پوری ہوتی ہو مگر کمال محدود  
 ہوتا ہو۔ ہمارے خیال میں کلیات شاعری کی سب سے بڑی جزئی غزل ہے ابتدائی  
 مشق کا دار مدار بھی اس پر ہے اور انتہا بھی اس پر موقوف ہو کیونکہ قصائد وغیرہ  
 کے مضامین مخصوص ہوتے ہیں جن کا نظم کر لینا ایک مشاق شاعر کے لئے بہت  
 آسان ہو مگر غزل کا تعلق ان جذبات کے ہے جو ہر طبیعت میں پیدا نہیں ہوتے  
 ہتعارف تشبیہ و تمثیل یہ تمام باتیں حسن کلام میں داخل ہیں مگر غزل میں ان کو بہت  
 کم بڑا جاتا ہو جذبات کا نقشہ کھینچنے کے لئے محض سادگی کی ضرورت ہو لفظی طبع  
 سازی اور ہتعارفات و تشابہ کا رنگ بھرنے سے معنی کی تصویر مسخ ہو جاتی ہو  
 دیگر قیود اور عادتوں کا لحاظ مضمون کی اصلیت کو خط کر دیتا ہے۔

غزل کا مشاق اور بالکمال استاد وہی شاعر ہو سکتا ہو جو سوز و گداز کے  
 مضامین لکھنے میں پوری پوری قدرت رکھتا ہو اور اس کا تیز قلم ان جذبات کو جو  
 دور و بھر سے دل میں پیدا ہوئے ہیں سلیقہ سے ادا کر سکے۔

اس دور میں حضرت داغ اور حضرت امیر بھی اس پایہ کے شاعر گزرنے میں  
 کہ زمانے نے ان کا نام استادوں کی فہرست میں ہمیشہ کے لئے جلی قلم سے لکھ دیا  
 بد نصیب زبان اردو جو ایام غدر میں تاراج ہو چکی تھی اور جس کا سر یہ حوادث  
 کے ہاتھوں لٹ چکا تھا اس کا از سر نو آراستہ کرنا اور دلنشین بنا کر دنیائے شاعری میں  
 لانا انھیں دو استادوں کا کام تھا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ مردہ زبان

کے قلب میں روح بیدار نہ تھی۔ دو معجز بیان شاعر دل کا حصہ تھا۔  
 ان کو آپس میں تزیین دیتا آسان کام نہیں کیونکہ اگر حضرت امیر قن شاعری  
 کے پورے پورے ماہر تھے تو حضرت داغ معاملہ بند ہی پر قادر تھے۔ حضرت امیر  
 کی فکر بلند پر داز تھی تو حضرت داغ کے لئے زبان مایہ ناز تھی۔ بہر حال میزان  
 سخن میں دونوں کا پلہ برابر ہوا اب دیکھنا صرف یہ ہو کہ رنگ تغزل کو جس کی ہم  
 تشریح کر چکے ہیں کس نے خوبی کیساتھ چمکایا ہے ہم ذیل میں دونوں کے چند اشعار بطور  
 موازنہ لکھتے ہیں اور انصاف کو مد نظر رکھ کر اپنی ناقص رائے بھی پیش کرتے ہیں۔

میرے سیاہ خانے میں شب کو وہ حور تھا

امیر پستلی کی طرح پردہ ظلمت میں نور تھا

در حقیقت کامل تشبیہ ایسی ہی ہوتی ہو۔ یعنی سیاہ خانے میں وہ حور اس طرح

تھا جیسے پردہ ظلمت میں نور پھرتی ہے۔ لفظ نے مضمون کو اس قدر اجالا ہے کہ سبحان

داغ جب تک کسی کی چاہ نہ تھی کیا مُرد تھا

میرا ہی دل بقل میں مری رشک حور تھا

تہایت سادہ اور پاکیزہ مضمون ہے۔ واقعی غزلیت کی یہی شان ہے۔

اے برق حسن یا رب اچھا ٹھہر تھا

امیر دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

دیکھئے اس مطلع میں نہ تشبیہ ہے نہ کوئی اجنبی ترکیب مگر مضمون کو اس صفائی

سے ادا کیا ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی۔ پھر دوسرا مصرعہ اس بلندی سے دیا ہے

کہ مضمون کی شان دوبالا ہو گئی ہے



داغ یاں امتحانِ برقی تجلی ضرور تھا  
کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلو کو طورتھا

حضرت امیر کا مطلع لا جواب تھا مگر حضرت داغ نے بھی جدت سے کام لیا ہر  
امتحان کا لفظ عجب شان لئے ہوئے ہو ریاں (کا لفظ حضرت داغ کے مترادف  
میں سے ہو مگر چونکہ یہ شعر گلزارِ داغ کا ہی اس لئے قابلِ اعتراض نہیں ہے  
میرے عمل تو قابلِ دوزخ ہی تھے مگر

امیر کرتا جو وہ نہ رحم تو رحمت سے دور تھا

اخلاقی مضمون ہو۔ یعنی میرے اعمال ضرور قابلِ دوزخ تھے مگر نہ نجات  
اُس کی رحمت سے بعید تھا۔ رحم اور رحمت میں کوئی معنوی فرق نہیں تاہم مساعد  
نہایت پر لطف ہو۔

داغ کیوں نا اُمیدِ عفو ہوں کیا یہ سُنے گا وہ  
اس کا نہ بخشنا تری رحمت سے دُور تھا

دونوں شعروں کا مضمون قریب قریب ہو مگر حضرت داغ کی ترکیب شستہ ہو

اور ردیف زیادہ ٹھکی ہوئی ہو ہے امیر چھانے ڈالینگے یہ جلتے ہوئے آندول میں  
گر میاں کر کے رلاتے ہو مجھے یاد ہو ضبطِ الفت نے کہا قید ہی آندول میں  
دل سے جلتی ہوئی انگلیوں نے جو لگائی

دونوں شعر نہایت اچھے ہیں تخیل کا لطف بھی پایا جاتا ہو۔ اور الفاظ بھی مساعد

ہیں ہے داغ اشک پیتا ہوں اگر ضبطِ محبت کے لئے  
رینے الماس کے بتاتے ہیں آندول میں

یہ کبھی بہت اچھا خیال ہو گیا ضبطِ محبت میں آنسوؤں کا پتیا زیادہ تکلیف کا باعث ہو جاتا ہو، آنسو دل کو چھلنی کرنے کے لئے الماس کے ریزے بن جائے ہیں (الماس کا کام کاٹنا ہی پہلے مصرع میں اشک کا لفظ موجود ہے اس لئے دوسرے مصرع میں آنسو کا لفظ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے مگر معنی کے لحاظ سے موزوں ہی بغیر اس کے شعر کی ترکیب درست نہیں ہو سکتی ۔

امیر ہجر میں ہوش نہیں صبر نہیں، تباہ نہیں  
جا بھی لے درد دل اب کیوں ہوڑا تو دلیں  
اس شعر میں تعقید کی وجہ سے قافیہ پر کسی قدر ضعف آ گیا ہے تاہم مضمون قابلِ داد ہے ۔

داغ ایک تیرے ہی نہ رہنے سے ہاکیا کیا کچھ  
کوئی حسرت نہ رہی جب سو ہا تو دل میں  
نہایت چست بندش ہو۔ حضرت امیر سے یہ قافیہ نہ بندھ سکا مگر حضرت  
داغ نے زبان کی حدود میں لا کر خوب نظم کیا ہے ۔  
امیر وہ کہتے ہیں نکلتا اب تو دردا رزی پہ مشکل ہے  
قدم کوئی کہاں لکھے جدھر دیکھو ادھر ل ہے  
کسی فارسی شاعر کا مشہور شعر ہے کہ  
مرا بگوئے تو رفتن چه مشکل افتاد است  
بہر طرف کہ نظرمی کنم دل افتاد است  
مگر حضرت امیر نے جدت سے پہلو بدلا ہے اور اچھی بات پیدا کی ہے داغ

قرینہ سے عجب آراستہ قاتل کی محفل کو جہاں سر پہ ہنسی سر پہ جہاں دل جا پہنچا دل  
محفل کے لئے قرینہ اور قاتل کے لحاظ سے سرور دل کا تقابل نقشِ بکری سے ہے  
خصوصیت کے ساتھ مصرعِ ثانی نہایت دلکش ہر فصاحت کے سانچے میں مضمون ملا ہوا ہے

امیر مجھے تو درد ہو تیرا تجھے کیوں ہو یہ بید دی  
مے پہلو میں بھی دل ہو تری پہلو میں بھی دل ہو  
گویا دلِ دل سب برابر مگر یہ متضاد عمل کیا ہے  
داغ بھلا دیکھیں تو بازی کون لیجائے محبت میں  
تم اپنے نام کے دلبر یہ اپنے نام کا دل ہے

— ❖ ❖ ❖ —

امیر دیرِ کریم پہ محشر میں تاکہ راہ ملے  
گناہگاروں میں چھپ چھپ کے بیگناہ ملے  
یعنی دیرِ کریم پہ گناہگاروں ہی کی رسانی ہوئی۔ اگر بیگناہ بھی چوری  
چھپے ہو نچے تو انھیں کا بھیس بدل کر اور انھیں کے طفیل میں۔ ۵

داغ قریب میکرہ مجھ کو جو خالفتا ہ ملے  
گلے ذاب کے کیا کیا مرا گناہ ملے  
گھے ملنے کا محاورہ کتنے اچھے موقع پر صرت کیا ہے، حضرت امیر کے مطلع میں  
تانتا ہو مگر یہ مطلع شوخ ہے اور صاف ہے ۵

امیر دمِ اخیر تو ظالم ذرا نگاہ ملے  
کچھ اس غریب مسافر کو زارِ راہ ملے

واہ کیا حسرت ہے ۵

داعغ کہاں تھے رات کو ہم سے ذرا نگاہ ملے

تلاش میں ہو کہ جھوٹا کوئی گواہ ملے

کتنا پھٹکتا ہوا مضمون ہو، گویا نگاہ کا نہ لہنا شب کی کیفیات گزشتہ کا  
پتہ دے رہا ہو اور اسی لئے جھوٹے گواہ کی تلاش ہو۔ یہ رنگ تو حضرت داعغ  
کے سوا کسی کو نصیب ہی نہیں ہوا ۵

امیر ہمیں بھی طور پہ موسیٰ کی طرح راہ ملے  
کبھی تو دیکھتے دالوں سے بھی نگاہ ملے

”دیکھنے دالوں سے نگاہ کا ملنا“ اس کا مزہ کچھ اہل نظر ہی لے سکتے ہیں ۵

داعغ بھلا ہو بیرمغاں کا ادھر نگاہ ملے  
فقیر ہیں کوئی چلو خدا کی راہ ملے

یہاں نگاہ کے ملنے نے کچھ اور کیفیت پیدا کی ہے جس کی توضیح اشارۃً مصرع  
ثانی میں ہے اور یہ ترکیب تو کہ (فقیر ہیں کوئی چلو خدا کی راہ ملے) زبانگی جان ہے

۵ امیر میں ہوں وہ کعبہ نشین جا کے دیر کے در پر  
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

بت پرستی میں کم از کم اتنی تو ثابت قدمی ہو کہ باوجود کعبہ نشین ہونے کے بتوں  
کی آرزو دیر کے در پر لے ہی گئی اور وہاں خدا کی راہ میں سوال بھی کیا تو بتوں  
ہی کا شعر میں لفظی رعایتیں زیادہ تر قابلِ داد ہیں ۵ داعغ

تراغور سما یا ہے اس قدر دلیں نگاہ بھی نہ ملاؤں جو بادشاہ ملے

گویا غرور دیکھتے دیکھتے خود بھی مغرور ہو گئے ۵  
 ہزاروں وعدے کئے پر دعا نہ کی اک دن  
 امیر فقیر بھی ہمیں جھوٹوں کے بادشاہ ملے  
 حضرت داغ سے زبان اور محاورات کے پہلو کم چھوٹے ہیں مگر یہ فیضانِ سخن ہو  
 کہ اس قافیہ کا سہرا حضرت امیر ہی کے سر رہا (جھوٹوں کے بادشاہ) ایک عام محاورہ  
 مگر فقیر کے لفظ سے اس کا حق دد بالا ہو گیا۔ پھر مصرعے اولیٰ میں معاملات کا ثبوت  
 بھی اچھا ہے ۵

کردوں میں عرض اگر جان کی اماں پاؤں  
 داغ کہوں پتہ کی اگر قبر سے پناہ ملے  
 دونوں مصرعوں کی نشست برابر ہو پھر یہ ٹکڑا کہ (کہوں پتہ کی) زیادہ معنی  
 خیر ہے اور مزے دار ہے ۵

کرم کرے جو وہ بندہ نواز بندوں پر  
 امیر بتوں کو ڈھونڈتے نکلیں خدا کی راہ ملے  
 وہی بات ہو کہ آگ لینے کو جائیں پیمبر ہی مل جائے ۵  
 میں خدا کی راہ ملنا نہایت پاکیزہ تخیل ہے ۵  
 ہوا ہے دردِ جگر سے یہ گھر مارتا ریک  
 داغ کہ موت ڈھونڈھتی پھرتی ہو کوئی راہ ملے

اچھی تلاش ہے ۵ امیر  
 کھلے بول تیرے اقرارِ وصل کرنے میں  
 ہوا میں خوش کہ برابر کے درد گواہ ملے

اقرار وصل پر برابر کے دو گواہ لبوں سے بہتر نہیں ہو سکتے۔ استادانہ شعر ہے  
 بلا سے دعوائے الفت نہ پیش کرتے ہم  
 ملے ہوئے ہیں جو دشمن سے وہ گواہ ملے  
 اس شعر کی ترکیب بھی شستہ ہو مگر حضرت امیر نے اس قافیہ میں بڑی فکر سے  
 کام لیا ہے۔

مندرجہ بالا اشعار سے نکتہ سیخ ناظرین دونوں کے جوہر کمال کا اندازہ بخوبی  
 کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں فیصلہ یہ ہو کہ حضرت امیر بحیثیت مضمون آفرین  
 وہی شان رکھتے ہیں جو ایک کہنہ مشق اور مستند استاد کی ہونی چاہیے۔ لیکن حضرت  
 داغ کو قدرت طبعیت اتنی شوخ اور رسالی تھی کہ اس کا جواب ہونا غیر ممکن تھا  
 تغزل کے رنگ میں مذاق دونوں کا متغیر ہو بہر حال دونوں نے ادبِ اردو  
 کی خدمت اپنی قوت سے زیادہ کی ہوا در ثابت کر دیا ہے کہ اردو ریختہ گوئی  
 کا وجود ابھی تک شاعری کی دنیا میں قائم ہوا اور اس کے حامی اور زندہ رکھنے  
 والے برقرار ہیں۔ ان دونوں محسنوں کے احسانات سے قوم قیامت تک  
 سیکر و ش نہیں ہو سکتی

مندرت میرٹھی

قطر





# حصہ نظر

مرزا محمد رفیع سودا  
تشیبِ قصیدہ

(۱۱)

دی سوزِ باں دہن لیکن سبھی میں لال  
ماں نہ آسماں نے کبھو ناخن ہلال  
کرتا ہے نورِ مرکبِ سایہ کے پانچ لال  
جوں جادہ خاکسار کوٹے ہے زیں پٹال  
ہو سرنگوں ازل سے یہ اب کائناتِ فعال  
محتاجِ نانِ شب ہو سدا صاحبِ کمال  
دولت کبھی کس کو نہ دی اُن نے بے زوال  
ہرگز کرے نہ شمع سے پروانہ کا وصال  
دیا ہی رازِ عشق کو پرشے سے یہ کمال  
خونِ بہار تیغِ خزاں پر کرے حلال  
ہر شب رکھے ہو خاطرِ بلبل کو پیرِ لال  
شکوہ نہ کر تو اس سے کہ نافرمانی ہو یہ حلال

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہرِ عرضِ حال  
ہرگز کسی گرہ کے لئے جزِ خراشِ دل  
روشنِ طبیعتوں سے بڑا ہی یہ تیرہ عقل  
دکھتا ہے ہر فرد کو جوں نیزہ سر بلند  
یک تن نوالہ خوار نہوا اس سے تابہ  
ہر روزِ نعمتوں سے کرے سفلہ کو غنی  
پارے کو دے ہے رتبہ اکسیرِ بعدِ مرگ  
گر پائے سوختن نہ رہے اُن کے دریاں  
دُھا پنے ہی جانماز تلے زاہدوں کا عیب  
ہم پر سدا رکھے مئے گلِ رنگ کو حرام  
ہر روز اٹھ کے غنچہ رگل کو کرے ہو تنگ  
لے دلِ غرض کسی کو نہ دے چین آسماں

حاصل ہو سوائے مشقت کے اور کچھ  
 ہم پست فطرتوں پہ چلی کشت تیغ چرخ  
 گم ہو شعور اس سے نہ چاہیں کشت دھار  
 گردن سے کار بستہ کھنڈے کیونکہ ہو محال  
 پس کیا ضرورت تھا جو کیا شکوہ سپہر  
 خواہش ہو دو جہاں کی اگر تو زبان سے  
 جزمع شاہ سرد علن مت سخن نکال

### تشبیب قصیدہ

(۲)

سو داہ جب جنوں نے کیا خوابِ خور جزا  
 احوال اُس کا دیکھ کے کہنے لگا طبیب  
 کہنے لگا سن اُس کو وہ دیوانہ در جواب  
 جو کچھ کہ میرے قن میں ہو تھا سو ابکی سال  
 مسہل طلب کرے ہے غذا کی زیادتی  
 کیا سوہ اس علاج سے کہ اُس کے ماروا  
 تب اُن نے یوں کہا کہ بتاؤں میں وہ علاج  
 اُس کے حضور عرض یہ کہ جس کے سایہ میں  
 سنتے ہی یہ نویدِ قصیدہ برائے نذر  
 لائی گھر اُس طبیب کے ہے عقل جس کا نام  
 اب نصو و مسہل اُس کے لئے ہو مفید عام  
 مجھ میں ہو کہاں یہ ترا ہے خیال خام  
 عامل نے خیر آباد کے پی کر کیا تمام  
 مجھ کو سو ماہ عید بھی گزر امہ صیام  
 تا اپنی میں فدا کر و لب کر کے قرض دم  
 اس درد سے تو پا کے شفا ہو جوشا دکام  
 موصیفت پہل سے لے اپنا انتقام  
 لے کر اب اس جناب میں حاضر ہو غلام

## تشبیب قصیدہ بہاریہ

(۳)

تیغِ اُردی نے کیا ملک خزاں متحمل  
 دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عز و جل  
 ڈال سے پاتِ تنک چول سو کیہ تا بھل  
 آپ جو قطع لگی کرنے روشنی پر محمل  
 پیشش چھینٹ قدم کار بہر دشت و جل  
 کار نقاشی مانی ہے دوم و اول  
 ہار پہنا سنے کو اشجار کے ہر سو بادل  
 ٹوٹے سے سنبہ پہ اندھس کہ ہوا ہر پیکل  
 شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہو بھل  
 شاخ میں گاد زیں کے بھی ہو پھوٹے کوئل  
 دین میں قسم حادات سے شاید ہو خلل  
 کہیں دھوا کے خدائی نہ کریں لاث ہل  
 بچہ کمرخ چمنِ ختم سے آتا ہے نکل  
 جو زباں سے سخن اب جو طلی کے آتا بھل  
 بچاں نشو و نما کرنے میں ہر ضرب مثل  
 گل ہم ہو بچے ہی عقدہ ہو کس طرح کا حل

چٹھ گیا بہمن دئے کا چھتاں سے گل  
 سجدہ شکر میں ہو شاخِ ثمر دار ہر ایک  
 قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض  
 واسطے خلعتِ نور دئے ہر باغ کے بیج  
 بخشی ہو گل نورستہ کی رنگ آمیزی  
 عکس گلبن پہ نہیں پے کہ جسکے آہستے  
 تارِ باش میں پرشے ہیں گہرائے تلک  
 بار سے آبِ رواں عکسِ ہجومِ گل کے  
 شاخ میں گل کی نزاکت پہ ہم ہو بھلی ہے  
 جو ششِ رویدگی خاک سے کچھ دور نہیں  
 دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہو اہو یاں تک  
 فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی  
 حدِ ایام کے پیش اب مددِ نامیہ سے  
 سنبہ پڑتا ہے فصیحی کے سبب ہر بار  
 دستِ گل خوردہ و شاخِ گل و گلزار ہم  
 غنچہ پہ کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہو یہ

اُن گلوں چھٹ جو ننگ کے ہیں سد مستعل  
چاہتی ہو بساجت کس سبز سے بدل  
غنیہ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکھل  
چشم سیاہ رنگت میں جھپکتی نہیں پل  
خطا گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول  
سافر نعل میں جوں کیجے زمرہ کو حص  
تیغ کسار ہوئی بس کہ ہو سے قسقل  
گل کو دیکھو تو ننگ جا رہے سبیل پھیل  
پانوں رکھتی ہو صحاحن میں گشت کے سبھل  
جو مفر شاخ سے اُترا سو گر اسمر کے بل  
شہد پٹکے جو لگے لشتر زبور غسل  
سبزہ داں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل  
گرتے گرتے یہ زمیں برکت بر آتا ہے نکل  
آگیا نعل زمرہ کے پر کھنے میں غسل  
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

## غزلیت

(۱)

جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا  
کھلتا ہو ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اُن ہے اُن کے نظر لاکھ طرح کا وہ چھول  
یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے انا  
چشم زنگس کی بھارت کے زبں ہو درپے  
اس قدر محتوماشا ہو کہ زنگس کی طرح  
آپ جو گر و چین لعلہ فور شہید سے ہے  
سایہ برگ ہو اس لطف سے ہر اک گل  
ننگ نے رہتہ آئینہ کیا ہے پیدا  
برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے  
در عطر طانی ہوئی پھرتی ہو خیاں میں نسیم  
اتنی ہو کثرت لغزش یہ زمین ہر باغ  
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب غفلت سے  
انجس شور زمیں میں نہ جلا دہقاں سے  
نشت کرنے میں ہر ایک تخم سے از فیض ہوا  
جو ہری کو چنستان جہاں میں اس فصل  
تاکجا شرح کردوں میں کہ بقول عربی

معدود نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا  
یہ برے کو تعین کے در دل سے اٹھانے کا

اس گلشنِ مستی میں عجیب و دید ہے لیکن ، جب چشمِ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا  
 سودا جو کبھو گوش سے بہت کے سنے تو مضمون یہی ہے جس ول کی فغاں کا  
 ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ  
 دنیا سے گزرنا سفرِ ایسا ہے کہاں کا

(۲)

دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائیگا جوں شک پھر نہی سے اٹھایا نہ جائیگا  
 پہونچیں گے اس چمن میں نہ ہم داد کو بھی جوں گل پہ چاک جب سلا یا نہ جائیگا  
 عمامہ کو اتار کے پڑھو مسازِ شیخ سجدے سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائیگا  
 ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس نگوں سے درگزر  
 سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

(۳)

میرے سخن کو فہم کے یوں فہم کا قیمت شکن جدا ہی یہ دیرِ یتیم کا  
 میخانے میں ازل کے مے دل سے زاہدا دھویا ہے نقشِ ساقی نے امید و بیم کا  
 غنیمت کو دل کے یاں ہر دم سر سے شکفت شرمندہ اس چمن میں نہیں میں نسیم کا  
 پہنے اگر لباس گہ انی حریر پوش بر چھپی بدن پہ اُس کے رواں ہو گلیم کا  
 سودا یقین کر اُس کا دم فقر ہے غلط  
 بالیدہ ہو دے جو کوئی ناز و تقسیم کا

(۴)

اٹک کے نظر سے نیاں کا اثر رکھتی ہی شمع سر سے لیکر تا قدمِ سلکِ گہر رکھتی ہی شمع

کون ہے میرا بجز پر دانہ مرغ نامہ بر  
 تو میرے غم سے نہ روایا اور میری خاک پر  
 شام سے تا صبح اپنی چشم تر رکھتی ہو شمع  
 خانہ خالوس میں ہر شب سفر رکھتی ہو شمع  
 حسن کو سودا جو دعویٰ سلطنت بہا سب نہیں  
 سر پہ اپنے کس لئے یہ تلخ زر رکھتی ہو شمع

(۵)

جب اس چین میں بھڑکے ہم آسمان چلے  
 کیا لیلیا تھا ہم نے اُجھتا جو کوئی خار  
 جوں گل ہم اُس کے بغیر سو دہنیاں چلے  
 مقراض کی طرح سے کہ جس کی زباں چلے  
 کر خوف ایسے تیرے جو بے کماں چلے  
 غافل ہماری آہ سے رہنا نہ بے خطر  
 راہ عدم بھی دور ہے سودا کہ جس کے بیچ  
 جس طرح پیر جائے ہو دو ہیں جواں چلے

## میر محمد تقی میر

### غزلتیا

(۱۱)

دل جو نہ یہ غبار اکثر تھا  
 اس پر تکیہ کیا تو غصا لیکن  
 کچھ مزاج ان دنوں مکر تھا  
 رات دن ہم تھے اور بستر تھا  
 دیر نہ ہر جا جہان دیگر تھا  
 سرسری ہم جہان سے گزرے

باز سجدہ ادا کیا تیر تیغ کہ یہ بوجھ میرے سر پر تھا  
خوش رہا جب تک رہا جیتا  
میرے معنوم ہے قلندر تھا  
(۲)

شریق خوب ہے آپس میں شستانی کا  
نہ پیش آوے اگر مرحلہ جدائی کا  
یہیں ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہو  
دماغ کسی کو ہے ہر درد کی جہ سائی کا  
رکھا ہے باز ہمیں درد بہ درد کے پھرنے سے  
سروں پہ اپنے ہے احسان شکستہ پائی کا  
ملا کہیں تو دکھا دیں گے عشق کا جھگل  
بہت ہی خضر کو غرہ ہے رہتائی کا  
نہ پوچھ ہندی لگانے کی خوبیاں اپنی  
جگر ہے خستہ تر ہے پنجبہ حنائی کا  
(۳)

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا  
کچھ ہمارا اسی میں دارا تھا  
کون لیتا تھا انا م مجنوں کا  
جبکہ خد جنوں ہمارا تھا  
ہم تو تھے محو دوستی اس کے  
گو کہ دشمن جہاں ہمارا تھا  
لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی  
جب تک لطف کچھ تھا ہمارا تھا  
(۴)

ہوئیں سوایاں جس کے لئے چھوٹا دیا راپنا  
ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یاد اپنا  
خدا جانے ہیں اس بخود دیئے کس طرف پھلیکا  
کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار راپنا

اگر چہ خاک اڑائی دیدہ توتنے بیاباں کی  
 عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہی بار آکر  
 وٹے مکھلا نہ خاطر خواہ ٹوٹنے سے غبار اپنا  
 جہاں سے لوگ سب سخت سفر کرتے ہیں راپنا  
 گیا وہ بوجھ سب ہلکے ہوئے ہم میر آخر کو  
 مناسب بھٹانہ جانا اس گلی میں بار بار اپنا

(۵)

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو  
 یاں برگ گل اڑاتے ہیں پرکار جگر  
 اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو  
 جا عندلیب تو نہ مری ہمصفیہ ہو  
 کرتی ہے بے مزہ جو قلم کے صریر ہو  
 اُفتادہ توجہ مجھ سے مراد ستگیر ہو  
 ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو  
 جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو  
 اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو

تم بھی تو میر صاحب قبلہ فقیر ہو

جن نام تر ایچے تب چشم بھراؤ (۶)  
 کیا جانے وہ مرغان گرفتار چین کو  
 ہر سو میر تسلیم رکھے صیدِ جسم میں  
 صنایع ہیں بے خوار از اہل علم ہوں نہیں بھی  
 اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آؤ  
 جب تک کہ بعد از نسیم سحر آؤ  
 وہ صید فغن تیغ بہ کف تا کہ ہر آؤ  
 ہو عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آؤ

اے وہ کہ تو بیٹھتا ہے سیر راہ پہ ز نہار

کھینچو کبھو میر بلا کش ادھر آؤ



(۷)

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے      ہم نے کیا چوٹ ول پہ کھائی ہے  
 لکھے رقعہ پہ لکھ گئے دفتر      شوق نے بات کیا بڑھائی ہے  
 دیرنی ہے شگفتگی دل کی      کیا عمارت عموں نے ڈھائی ہے  
 دل سے نزدیک اور اتنا دور      کس سے اس کو کچھ آشنا ہے  
 یاں ہوئے خاک سے برابر ہم      واں وہی ناز خود نسائی ہے  
 آرزو اس بلند بالا کی      کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے  
 مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میرے  
 کیا دوانے نے موت پائی ہے

(۸)

بات کیا آدمی کی بن آئی      آسماں سے زمین پہنوائی  
 بچخ زن اس کے واسطے جو عام      ہو گیا دن تمام رات آئی  
 ماہ و خورشید و ابر و باد بھی      اس کے خاطر ہوئے ہیں سودائی  
 کیسے کیسے تھے تزداد جب      رنگ رنگ اس کو چسپ نہنجائی  
 شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا  
 یہ بھی کرتے سدا جبیں سائی

(۹)

کعبے میں جاں بلبھے ہم دوریِ تباں سے      آئے ہیں پھر کے یار واکے خدا کے یاں سے  
 جب کو نرنی ہے بجلی تب جانب گلستاں      رکھتی ہے چھڑ مری ہی خاک آشتیاں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو حیران ہوں یہ شوخی آئی تجھیں کہاں سے  
 خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب ہر اک سے حال دل کا مدت گزار بن سے  
 اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میتہ تم کو  
 اُلجھا دے زمین سے جھگڑا ہوا آسمان سے

(۱۰)

برق کو اٹھا پھرہ سے وہ بت اگر آوے اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے  
 ممکن نہیں آرام دے بتیا بی جسگر کی جب تک نہ پلک پر کوئی طعنا نظر آوے  
 ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوقِ خبر میں لے جاں بلب آمد رہ تا خبہ آوے  
 مست متعین باغ ہو لے غیرتِ گلزار گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے  
 کہتے ہیں ترے کوچے سے تیرے آنے کے ہے  
 جب جائے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

## خواجہ میر درد

### غزلیات

(۱)

جگ میں کوئی دملک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا  
 دل زمانے کے ہاتھ سے سالم کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا  
 دل کے پھر دشمن تازہ ہوتے ہیں کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

ایک بیک نام لے اٹھا میرا جی میں کچھ اس کے آگیا ہوگا  
اُسے قصداً بھی میرے نالہ کو نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

دل بھی اسے دردِ قطرہ خوں تھا  
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

(۲)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا  
سب کے یاں تم ہوئے کرم فرما اس طرف کو کبھی گزرتا نہ کیا  
دیکھنے کو رہے ترستے ہم نہ کیا جسم تو نے پر نہ کیا  
بتجھ سے ظالم کے پاس میں آیا جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا  
کتے بندوں کو جان سے کھویا کچھ خدا بھی تو نے دُر نہ کیا  
کو نہ دل ہے جس میں خانہ خراب خانہ آباؤ تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد  
بے بہر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۳)

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دُر نہ تھا پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا  
رات مجلس میں تھے جن کے شعلہ کے جلوئے شمع کے منہ پہ چو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا  
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا  
باد جو دیکھ پروبال نہ تھے آدم کے وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی تقدیر نہ تھا  
درد کے طے سے لے یا رہا کیوں مانے اسکو کچھ اور سوا دیر کے منظور نہ تھا

(۴) چمن میں صبح یہ کبھی تھی، ہو کر چشم تر شبنم  
 ہیں تو باغ تجھ بن خانہ ماتم نظر آیا  
 بہلا ٹمک صبح ہونے دو اسے بھی دیکھ لیں  
 نہ پایا جو گیا اس باغ سے ہرگز سراغ اسکا  
 بہار باغ تو یوں ہی رہی لیکن کدھر شبنم  
 ادھر گل بھارتے تھے جیب کی تھی ادھر شبنم  
 کسی عاشق کے رونے سے نہیں رکھتی خبر شبنم  
 نہ پلٹی پھر صبا ادھر نہ پھر آئی نظر شبنم  
 نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادی دُغم کا  
 سحر خنداں ہو کیوں روتی ہو کس کو یاد کر شبنم

(۵)

گر دیکھئے تو منظر آوارہ بقا ہوں  
 کرتا ہوں پس از مرگ بھی حل شکل عالم  
 ممنوں مے فیض کے سب اہل نظر ہیں  
 ہر منظر انوار صفا میری کدورت  
 اور مجھے جوں عکس مجھے محو فنا ہوں  
 بچس ہوں پناہن کی طرح عقدہ کشا ہوں  
 جوں نور ہر ایک چشم کا دیدار نما ہوں  
 ہر چند کہ آہن ہوں پر آئینہ بنا ہوں  
 سمجھا نہیں تا حال پر اپنے میں کیا ہوں  
 ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں  
 آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہر گز نہ

ہوں قافلہ سالار طریق قدما و درو  
 جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

(۶)

آرام سے کبھو بھی نہ کیا بار سو گئے  
 خواب عدم سے چونکے تھے ہم تر کو  
 ایسے ہمارے طالع بیدار سو گئے  
 آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے  
 دیکھو تو کیا بھی یہ گرفتار سو گئے  
 اٹھتی نہیں ہو خانہ زنجیر سے صدا

وہ مرچے جو رونق بزمِ جہان تھے  
اب اُٹھے دردِ دیاں سے کہ سب سے بگڑے

(۷)

واقف نہ یاں کہو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے  
مگر چاہئے تو بیٹے اور چاہئے نہ بیٹے  
ہر چند یہ تمنا درخوہ نہیں ہمارے  
اب ہیں کہاں وہ نالے گشتِ گلی کہ صر ہے  
یعنی کہ آگے ہیں بہکے ہوئے عدم سے  
سب تم سے ہو سکے ہو ممکن نہیں تو ہم سے  
نزدیک تو جو آئے کیا دور ہے کرم سے  
تھیں سب وہ باتیں ثابت میسر ہی عدم سے  
ہو درد پر بھی کچھ تو میری ہی سی نصیب  
گیرے ہو اور ہی غم چھوٹے جو ایک غم سے

(۸)

مرا جی ہو جب تک تری جستجو ہے  
خدا جانے کیا ہو گا انجام اس کا  
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا  
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر  
زباں جب تلک ہو گی گفتگو ہے  
میں بے صبر اتنا ہوں وہ تذخوہ ہے  
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے  
جدھر دیکھتا ہوں وہی رو برو ہے

(۹)

تمہیں چند اپنے ذمے دھر چلے  
کیا ہیں کام ان گلوں سے لے صبا  
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس  
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے  
اک دم آئے ادھر ادھر چلے  
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں چشمِ غم آئے تھے دامنِ تر چلے  
 ہم جہاں میں آئے تھے تنہا دے ساتھ اپنے اب اسے لیکر چلے  
 ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے  
 دَر دِکھ معلوم ہے یہ لوگ سب  
 کس طرف سے آئے تھے کسیدھر چلے

## سید النساء اللہ خاں انشا

### غزلیات

(۱)

فقیرانہ ہے دل مقیم اُس کی رہ کا غرض کیا کہ محتاج ہو یا دشمن کا  
 خرابات کی جب سے لذت پڑی ہے چھٹا بیٹھا مسجد و خانقہ کا  
 صنم خانہ جاتا ہوں تو مجھ کو ناصح نہ بہکا نہ بہکا نہ بہکا  
 تری آشنائی میں کیا ہم نے پایا دیا نقدِ دل اور اپنی گرو کا  
 کبھی تجھ سے انشا نے بوسہ نہ مانگا  
 گنہ گار ہے وہ فقط اک نگہ کا

(۲)

تلک آنکھ ملا تے ہی کیا کام ہمارا تیرے یہ غضب پر جھپٹتے ہونا مہار  
 میں نے جو کہا آئے نہ مجھ پاس بولے کیوں کس لئے کس اسطے کیا کام ہمارا

رکھے ہیں کہیں پانوں تو چرتا ہی کیا  
ساقی تو ذرا ہاتھ تولے تھام ہمارا  
لے باو سحر محفل احباب میں کیوں  
دیکھا ہے جو کچھ حال تیر دام ہمارا  
میتابی دل کے سبب اس شوخ تک انت  
پہونچے ہے بلا واسطہ پیغام ہمارا

(۳)

نگہ جو پڑی تھی سے رشک قمر پر  
گئی پھیل بس چاندنی سارے گھر پر  
مجھے رونا آتا ہے شمع سحر پر  
کہ بچا رہی اب مستعد ہے سفر پر  
کبھی عمر بھر پھر نہ تلوے جلیں گے  
قدم آپ رکھئے دمی چشم تر پر  
مے دودل نے فقیرانہ دھونی  
لگائی ہو جا عرض اعظم کے در پر  
اجی کیوں لاتے ہو مجھ کو تھیں کیا  
ہنیں رحم آتا میری چشم تر پر  
یہی جی میں ہوا اب کہیں بیٹھ رہے  
بس اک بانڈھ تکیہ کسی رہ گز پر  
بڑھا انتشا غزل اور ایک تازہ ایسی  
کہ ہو آفسرین جس کی ہر شعر تر پر

(۴)

دھوم اتنی تھے دیوانے مچا سکتے ہیں  
کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں  
سوچو تو سہی ہٹ دہری نہ کیجئے حساب  
چٹکیوں میں مجھے کب آپ اڑا سکتے ہیں  
حضرت دل تو بگاڑ آئے ہیں سو لیکن  
اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں  
ہر محبت جو تری دل میں وہ ایک طور پر  
ہم گٹھا سکتے ہیں اسکو نہ بڑھا سکتے ہیں  
ایک ڈھب کے جو قوافی ہیں ہم ان میں انتشا  
ایک غزل در بھی چاہیں تو بنا سکتے ہیں

(۵)

کیا لایم کو تیر سی یاری میں ہے اب تک اُمید داری میں  
 دل جو بے خود ہوا صبا لائی کس کی بونگھت بہاری میں  
 ٹمک اودھر دیکھ تو بھلائے چشم فائدہ ایسی اشکباری میں  
 چٹ لگا دیتے ہیں مے آنسو سلاک گوہر کی آبداری میں

بندہ بو تراب ہے انشا

شک نہیں اس کی خاکساری میں

(۶)

کر بانہ صے ہوئے چلنے پہ یاں سب یا بٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بٹھے ہیں  
 نہ چھیڑاے نچھت باد بہاری راہ لگاپنی تجھے اٹھیلیاں سو جھی ہیں ہم بزار بٹھے ہیں  
 بساں نقش پاے رہ روان کوئے تنقائیں نہی اٹھے کی طاعت کیا کریں لاچار بٹھے ہیں  
 یہ اپنی چال ہو افتادگی سے اندوں پر دں نظر آیا جہاں پر سایہ دیو اربٹھے ہیں  
 کہیں ہیں صبر کس کو آہ ننگ و نام کیاتے ہو غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہو کسے انشا

غینمت ہے کہ ہم صورت یہاں ڈھپا رہے ہیں

(۷)

کوئی اس دام محبت میں گرفتار نہ ہو لے خدا یہ تو کسی بندہ کو آزار نہ ہو  
 سیر تو ایک طرف لاکھ غینمت کہہ پا سانس لینے میں کوئی شخص گھنگار نہ ہو  
 جس طرح پھول کی باںسی طاقاں چھی جس سے خاطر کہ کسی شخص کی کچھ بار نہ ہو



آج ہے دھوم اسیرانِ قفس میں کچھ اور  
جا کے دیکھو تو کوئی تنازعہ گرفتار نہ ہو  
بخشت بیدار اگر خواب میں تجھ کو پاس  
تو وہ پھر تازہ قیامت کبھی بیدار نہ ہو  
نہ چلے ایسی ہوا بھی جو بڑی تجھ کو لگے  
پھول ایسا نہ کھلے جو تجھے درکار نہ ہو

نہ ہنسی اور خوشی ہی ہے انشا اللہ  
میرے والی وہ کسی چیز سے لاچار نہ ہو

(۸)

فی اہلِ آئینہ ساں شفات جس کا دل نہ ہو  
دیکھنے والوں کو تسکین کس سے کچھ حاصل نہ ہو  
نورِ حق افرادِ انسانی میں گر شامل نہ ہو  
ہستیِ مویہم کا نقشہ ہی پسرِ باطل نہ ہو  
اک اُداسی کا رداں پر چھپا گئی اور سراں  
ملکِ خبر لیجو کہیں لیلیٰ کی یہ منزل نہ ہو  
عشق کا دریادہ دریا جو کہ غیرِ خضر بھی  
صرف گر ہو جائے تو پیدا کہیں ساحل نہ ہو  
گر تبکِ روحی بھم پہونچی تو نام نہ نسیم  
کو چھ تنگ گل سے گزر یہ مشکل نہ ہو  
دردِ ہوشکامٹ کے نام کا انشا جسے  
کیوں بھلا دونوں جہاں کی اسکی حل مشکل نہ ہو

(۹)

ہو مجھ کو ربطِ بسکہ غزالانِ دم کے ساتھ  
چو کوں ہونوں کچھ سایہ کو اپنے قدم کے ساتھ  
کیا کام ہم کو سجدہ دیر و حرم کے ساتھ  
مستوں کا سر جھکے ہو صراحی کے خم کے ساتھ  
کوئے بتاں سے طوفِ حرم کو چلے تو ہم  
لیکن کمالِ حسرت و حیراں و غم کے ساتھ  
ادجائے والے طرکے ذرا دیکھو ادھر  
مانندِ سایہ ہم بھی ہیں تھے قدم کے ساتھ  
اے رہِ روانِ ملکِ فنا مستعد رہو  
تیار ہو رہے ہیں بہت سے عدم کے ساتھ

اب چھڑ چھاڑ کی غزل انشا اک اور لکھ  
ہیں لاکھ سو خیاں تھے نوکِ قلم کے ساتھ

(۱۰)

کیا کیا آہِ نالواں تو نے      آگ سی پھونک دی یہاں تو نے  
آفریں تجھ کو لے دل بے صبر      اُپھنسا مجھے کہاں تو نے  
ضعفِ پیری مجھے دیا کن نے      اے جواں تو نے لے جواں تو نے  
مہربانی یہ کن نے فرمائی      مہرباں تو نے مہرباں تو نے  
قربِ کن نے دیا یہ انشا کو  
اے میرے یارِ قدرداں تو نے

(۱۱)

بندگی ہم نے توجہ سے اپنے ٹھانی آپ کی      بندہ پر درخیز آگے قدردانی آپ کی  
کیا کہوں مارے خوشی کے حال میرا کیا ہوا      آمد آمد جو ہوئی کل ناگہانی آپ کی  
میرے حق میں اب جو یہ ارشاد فرمایا کہ ہو      خوبیاں نقوشِ خاطر جانفشانی آپ کی  
لیک میں اوڑھوں کچھ اُدس یا لپیٹوں لکیروں      روکھی بھکی ایسی سوکھی مہربانی آپ کی  
دو گلابی لاکے ساتی نے کہا انشا کورات  
زعفرانی میرا حصہ ارغوانی آپ کی

(۱۲)

دو گھڑی دن سے کہا میں نے کہ کیا ارشاد ہو      صن کے بولے اب ہو کیا بات تیری یاد ہو  
خاکِ پرست پھینک لے ساتی ڈیر و نہ لیشن      چاٹ جاؤ نیگے حریف اس کو یہ مے کی گاد ہو

اُس کے یہ اشعار بھی کہتے ہیں یہ اہل شیک کوئی اُس کو کیا کرے یہ تو خدا کی داد ہے  
میں کے دیتا ہوں انشا سے ذرا پچ کھلیو  
وہ بلا ہے قہر ہے آفت ہو اکیسا استاد ہے

(۱۳)

ہو جی میں قفل خانہِ نغمہ توڑیے  
یہ کیا کہ اُن کے دل کو نہ زہار توڑیے  
یوں چاہتے ہیں آج بہر کیف میکشاں  
سایہ میں جس دُخت کے آرام پائیے  
اِس تاک پر یہ اپنی اچھل بھانہ ہو کہ پھر  
شوخی تو دیکھ آج یہی قصد ہے کہ خیر  
یعنی در بہشت کو کیسا توڑیے  
سو بار جا کے جوڑیے سو بار توڑیے  
یعنی کہ قفل خانہِ نغمہ توڑیے  
کیا ظلم ہے کہ اُس کے ہی شمار توڑیے  
دروازہٴ رفقہ گلیز اور توڑیے  
جس ڈھبے ہو دے خاطر دلدار توڑیے  
انشا یہ روٹھ راٹھ ہو اک تاک بجاؤ کی  
اِس توڑ جوڑ کا نہ کبھی تار توڑیے

شیخ غلام ہمدانی مصنفی  
غزلیات  
(۱۴)

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا  
کیا لطف مقام اُن کو جو شتابِ عدم ہیں  
یاں عمر کو وقف ہے چراغِ سحری کا  
دل کو ج میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا  
جو بربیل کو مقصد ورنہ نہیں نامہ بری کا  
کیا بھجوں میں فائدہ کو وہاں کو چوں کہ

یہ کس کی ہے رفتار کہ صفحے پہ زمیں کے  
ہر نقش قدم خاکا ہے تصویر پریری کا  
بندہ ہے تیرا مصحفی خستہ کو یاب  
محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

(۲)

ہوا دشمن جاں اب تو باغباں میرا  
چمن میں رہنے نہ دیگیا یہ آشتیاں میرا  
زمیں پر اسے نیٹے مجھ کو عمر بھر چسکے  
کہاں کا دشمن جاں تھا یہ آسماں میرا  
اٹھا ہوں بسکہ زمانے سے حسرتیں لیکر  
جنازہ دوش آجبا پہ سب گراں میرا  
کل اس کی بزم میں مذکور شعر ہوتا تھا ق  
کچھ اس میں آجو گیا ذکر دریاں میرا  
لگا یہ کہنے کہ ہاں مصحفی کو لاؤ شتاب  
کہ ایک عمر سے ہے وہ تو مدح خواں میرا

(۳)

شب کہ دل درد و الم سے سرسبز رہتا تھا  
ہدیہ شہر کی طرح ہزاراں شور انگیز تھا  
ایک ہی تیشے میں سر فریاد کا دو ہو گیا  
کیا کہے فریاد بچارہ کہ تیشہ تیز تھا  
فصل گل میں کیوں نہ کرتے ہم جی عوائج  
مثل گل چاک گر بیاں ہم کو دستاویز تھا  
کی ذرا آب دم شمشیر قاتل نے کی  
در نہ پہچانے ہماری عمر کا لبریز تھا  
کہتے ہیں اہل محلہ مصحفی کل مر گیا  
کیا موجب اس کا کہ تھا بیمار و بد پریر تھا

(۴)

رباؤ گل سے افزوں نیم تاریخ خزاں مجھ کو  
بنا تا ہی نہ تھا ایسے چمن میں آشتیاں مجھ کو

قیامت کے تو آنے میں نہیں شک یہ تامل ہو  
 میں کچھ زور نہیں کہیں جیتے جی یاد رکھاتے ہیں  
 پڑا ہوں شاخ سے گر کر میں برگ زرد کی صورت  
 رہا کچھ آسرا رستے میں منزل پر پہنچنے کا  
 گلستان جہاں میں نعمت پر دانی کمین ہو نہیں  
 سبک لے مصحفی یاں تک ہو این ضعف پیر سی  
 کہ آخر زلیست اپنی ہو گئی بارگر اں محب کو

(۵)

غم دل کا بیان چھوڑ گئے ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے  
 راہ میں محب کو سب مے ساتھی جان کرنا تو ان چھوڑ گئے  
 سفر اس دل سے کر گئے غم و درد یار سید نامکان چھوڑ گئے  
 لے گئے سب بدن زمیں میں ہم  
 مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

(۶)

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے کوئی شہر میں ہوتا ہے کہ ہر ہوتا ہے  
 نہیں معلوم کہ ماتم ہو خاک پر کس کا روز کیوں چاک گر بیان سحر ہوتا ہے  
 میں بھی یاد دل گم گشتہ میں رہتا ہوں کسی رہد کا جو دنیا سے سفر ہوتا ہے  
 مصحفی ہم ترے ملنے کو کبھی بار آئے  
 یہ تو بتلا تو کسی وقت بھی گھر ہوتا ہے

(۷)

دل محروم نہیو اشاد گلستاں میں کبھی توڑ کر کھول بھی رکھے نہ گریباں میں کبھی  
 کو فت یہ دل نے اٹھائی کہ نہ ٹھہرے آنسو یاد آئی جو تری موسمِ باراں میں کبھی  
 آہ کس کو یہ کیا پہلے پہل تو نے شکار آج تک خوش نہ لگا تھا نئے پکیاں میں کبھی  
 شاید آتا ہو اسیروں میں کوئی تازہ اسیر اس قدر شور نہ تھا خانہ زنداں میں کبھی

مصحفی جب ہے اُس غنچہ دہن سے ہوں جدا  
 آشتی میں نے نہ دیکھی لب و دنداں میں کبھی

(۸)

نچو سحرِ خجل نہ کرے روئے یار سے بس اتنی آرزو ہے شب انتظار سے  
 پیری میں کوئی جاتا ہو عاشق کا منزل کہنہ جو ہو تو جھڑتی ہے آتش چار سے  
 گویا یکیدِ قفلِ طبیعت بھی شاخِ گل دہ تا تو ان ہیں کہ تری راہ گزار میں  
 کیا کیا طلسم ہم پہ کھلے ہیں بہار سے اٹھنے کی مانگ آیتے ہیں طاقتِ غبار سے

خاک اُس کی اُس کے کوچ میں پہنچے لے صبا

بیجا غلش ہے مصحفی خاکسار سے

شیخ امام بخش ناسخ

غزلیات

(۱)

غمِ افلاس کہاں دل ہے تو نگر اپنا زرد چہرہ نہیں فاقوں سے یہ ہی زرا پنا

اتنی مدت کے یوں نہیں ڈالے وحشت میں غراب  
کہ وطن جاؤں تو پاؤں نہ کبھی مگر اپنا  
اشکِ حسرت سوا بادہ گل رنگ سے ہائے  
مثلِ راہ کبھی دامن نہ ہوا تر اپنا  
ذکرِ پرواز تو کیا تنگ ہو ایسا یہ چین  
جھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہر اپنا  
دوبیان اُس کو چے کا ناسخ جو ہر مانہ حسن  
گھر میں ہم رہتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں گھر اپنا

(۲۱)

تیرے پر تو نے کیا گنگا کو دریا نور کا  
جس نے دیکھا نر کو سمجھا وہ شعلہ طور کا  
ہو گئی تھی راہِ عدم کیونکہ کہ جھک کر ضعف ہے  
اُس کے منہ تک ہا تھا لیجانا سفرِ دور کا  
مودیوں پر قہرِ یاربِ نطف سے خالی ہیں  
کیا مراد تیا ہے کُننا خسانہ زبور کا  
سوزش اپنے داغ میں بھی ہو رنگِ فتاب  
چاہے جراحِ مرہمِ صبح کے کا نور کا  
غیر حق آئی نہیں ہرگز زباں پر کوئی بات  
ہو ہی اس دایہ فانی میں نشانِ منصور کا  
تو نہیں ساقی تو مینجائے نیر اکبرِ بیاہو حشر  
مے کے شیشہ میں نظر آتا ہو نقشہِ صور کا  
ہجر میں کیا سیکھنی ناسخ کہ سودا کی طرح  
زخم نے دل کی طرح دیکھا نہ منہ انگو ر کا

(۳۱)

دولتِ کونین جو چاہے کہے تو قیرِ صبح  
بوئے زرد کرتی ہے خورشید کو اکبرِ صبح  
آگئی پیری مگر شاہد پرستی ہے وہی  
آفتاب اپنی بے نل میں بھی ہو مثلِ پیرِ صبح  
چاہے کوئی رہے غافل نہ فیضِ صبح سے  
دیکھ لو مُردوں کو زندہ کرتی ہو تاثیرِ صبح  
دمدمِ ضعفِ بھر لیا ہے بے دیدار دوست  
دن چڑھتے مجھ سے بڑھی جانی نہیں تخریبِ صبح

چھار ہی ہے میرے بختوں کی سیاہی ہر طرف  
کچھ شبِ فرقت میں لے ناسخ نہیں تقصیرِ سچ

(۴)

دولتِ تقدیر کو تدبیر کی حاجت نہیں، معدنِ زرہ جہاں کسیر کی حاجت نہیں  
راستی سے اس قدر وہ کچھ ادا بیگانہ ہو اُس کے ابرو کی کہاں کو تیر کی حاجت نہیں  
حشر تک زیرِ زمیں دور دروازے زمیں جز لحدِ دنیا میں کچھ تعمیر کی حاجت نہیں  
زندگانی ہو ملامتِ مرگ کی لے فافلو اور کچھ اس خواب کو تعبیر کی حاجت نہیں

میں ہی لے ناسخ نہیں کچھ طالبِ یو انِ تمیر  
کون ہو جس کو کلامِ میسر کی حاجت نہیں

(۵)

لوگ دنیا سے جو دن رات سفر کرتے ہیں کو پج کی بے خبروں کو یہ خبر کرتے ہیں  
کس کو وحشت میں ملا ہے یہ طوطا ایسا روزِ زم چاک گرِ بیاں سحر کرتے ہیں  
میرے دیرانے میں رہتے ہیں مقررِ جہاں کشورِ ہوش سے جو لوگ سفر کرتے ہیں  
کامِ جلوت سے نہیں رکھتے ہیں خلوتِ کچھ ہوا کس کی محفل کرتے دل میں گزر کرتے ہیں

قلزمِ اشک سے دھونے ہیں سیاہی ناسخ  
ہم شبِ کور کو رُور و کے سحر کرتے ہیں

(۶)

تاب کیا دیکھوں جو اُس کے لئے آتشِ اک کو کاہ کا رتبہ دباں ہے شعلہِ ادراک کو  
خاک میں پوشیدہ ہو جائیں گے سب اعلیٰ و اف کمرِ قی ہے گردِ زمیں دیکھو سمنانِ فلک کو



تا دمِ مردن نہ بکھی اوج کی حسرت تو کیا لیکنی صرصر فلک تک مجھے مشتِ خاک کو

باغ سے دریا سے صحرا سے فراقِ یار سے  
خوش کروں لے لے ناخِ کیا دلِ غمناک کو

(۷)

گر مرا تابوتِ یاروں کا وبالِ دوش ہے  
غوبِ بزمِ دہریہ کی تشِ زبانی کر پئے  
آجکل اپنا چراغِ زندگی خاموش ہے  
آدمی تو کیا چراغِ گور تک خاموش ہے  
مرگ کے سامان جیسا ہیں قضا کی دیر ہے  
باطرہ والِ تلوار پر ہے یاں اہوکا ہوش ہے

مُثلِ تاسخِ چاہیے بیہوش ہو پیکرِ شراب  
اسِ خراباتِ کہن میں جو کوئی ذی ہوش ہے

(۸)

حبِ ملکِ گردشِ جو اسکی اک جہاں گردشِ پیچ  
کیوں نہ ظالم کی مدد کرتا ہے دورِ فلک  
تیزیِ شمشیر کی خاطر نشانِ گردشِ میں ہے  
آئینہ آٹھوں پہر گردابِ ساں گردشِ میں ہے  
بعدِ مردن بھی غبارِ عاشقاں گردشِ میں ہے  
جو دہنِ لبریزِ نعمت سے زباں گردشِ میں ہے  
سعی سے فارغ نہیں ہر چند ہوں سیرِ لالِ حرص  
یہ نشان ہے تاسخِ سرگشتہ کے دیرانے کا

یہ نشان ہے تاسخِ سرگشتہ کے دیرانے کا  
آسیاں کی طرح سنگِ آستانِ گردشِ میں ہے

کچھ عدم کا بھی خیال ہو دل تجھے یاں چاہیے (۹) گو عزیز مصر ہے پر یاد کنگاں چاہیے  
 دم بدم کنتی ہو میری کشتی عمر رواں مجھ کو آبِ خنجر قاتل کا طوفاں چاہیے  
 عمر گزری ٹٹے روتے ہنس چلیں اب جی پر میرے منہ پر کوئی قاتل زخمِ خنداں چاہیے  
 دردِ مژگاں کی زباں سو ہیں لجاناں کو صفت اشکِ غول کی چشم کو تسبیحِ مرغاں چاہیے

طالبِ دنیا مَوْنُوث ہیں بھلا کیا اُن سے کام

مرد ہے ناسخِ نو عشقِ شاہِ مرداں چاہیے

## خاقانی ہندیشیچ محمد ابراہیم دوق قصیدہ

جہذا ساقیِ فرخِ رخ و غورِ شید جمال  
 بارک اللہ کہ در افشاں ہو تو لے ابرہار  
 لہذا الحمد لبائے عیش سے جام  
 جوشِ روئیدگی سبہ سے ہو جائیگا سبز  
 شرِ تیشہ فرما دے پیدا ہوئے گل  
 جوشِ فوارہ ہو دالِ کثرتِ تارِ بارش  
 کیا عجب رحمتِ باری سے کہ وقتِ بارش  
 معجزِ باد سے مانند عصاے موسیٰ  
 شورِ بکس بھی یہ رکھتا ہو ملک آج کہ گل  
 دیتی ہو طاقتِ پروانہ یہ کیفیت ہے  
 مرجا مطربِ ہاروت فنِ زہر و خصال  
 خیر مقدم کہ خراماں ہو تو لے بادِ شمال  
 شکر اللہ ہے زرِ گل سے چمنِ مالا مال  
 گلِ زمین چمنِ حسن میں تا داندہ خال  
 بل بے جوشِ گل خود و سرِ امانِ جبال  
 سرِ محنوں کے ٹھکے آکودہ جہاں گرد سے بال  
 ابرِ مردہ سے بھی ہو قطرہ فشاںِ بزلال  
 شجرِ خشک بھی ہو جائے تروتازہ نہال  
 بن گیا کثرتِ شبنم سے نمکداں کی مثال  
 اس ہو امیں ہو بطائے کہ ارٹو کچھ پربال

ہویہ وہ دور کہ ہر صوفی کھانی مشرب  
 بے دموں کو کہو جو بے چارہ گر عیسیٰ دم  
 پتلیاں ناجیتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز  
 اللہ اللہ سے سر سبز ہی گلزارِ حباں  
 ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خطِ غبار  
 روزِ جشن آج ہی اس کا کہ جسے کہتی ہو خلق  
 وہ بہادرِ شہِ غازی کہ اگر تیغ اس کی  
 وہ کونوئے نکو رائے مجسمہ منظر  
 وہ سیاحِ دم و یوسفِ تیغ و داؤدِ احوال  
 چمنِ خلق و نسیمِ کرم و ابرِ سخا  
 آسمانِ جاہ و عطاردِ قسم و مہرِ علم  
 خسر و جمِ چشم و دادِ کسریٰ انصاف

یہ حاضریں پڑھوں اُس کی وہ مطلع جس سے

ہم سہری کی نہ رکھے مطلعِ نورِ شیدِ مجال

### مطلع ثانی

ہو تری اک نظرِ فیض سے ناقص کو کمال  
 نیرِ جاہ تیرا وہ جسے تا دورِ فلک  
 آگے بخشش کے تری خرمنِ دریکدانہ  
 ہوٹے جوں چادرِ محتابِ گلیمِ شبِ تار  
 مہر سے گر مہِ کامل ہو دہ ہفتہ میں ہلال  
 نہ کسوف و نہ غروب نہ ہو دن و بال  
 آگے مہمت کے تری کوہِ طلا ایک انتقال  
 رخِ پُر نور جو تو پوچھ کے بھاڑے دہال

دستگیری نے کیا تیری جو گزشتہ کوئی کو سنبھال  
لب دریا پہ جہابوں کی جگہ ہوں تجھال  
فیض جاری سے تری بخل کو مایاں تک نہ روا  
نہ ارسطو کو ہو طاقت نہ فلاطون کو مجال  
اک مقولے میں فقط فعل کے عقل فعال

قطعہ

تیرے گلگون بک سیر کی جائے دنبال  
ادھر پہنچ جائے کہیں سو وہ کہیں مثل خیال  
ہو اڑا ان اسمیں ملک کی تو بشر کی سی خصال  
عہد مستقبل دماضی کا دہاں ہو اک حال  
پھر تاناکا دے میں ہو صورتِ فالوس خیال  
مزرعہ سبز فلک ہو نہ مبادا پامال

قطعہ

سر پہ اندیشے نے لی ہاتھ دستا سنبھال  
نیشکر راہ میں مانگیں اگر اُس سے اطفال  
اُس متک پہ شہا جلوہ نمایوں ہو ڈھال  
کئے اعدا پہ قیامت سرسید ان قتال  
ہی جن اعدا کو سراج شایطین کے مثال  
قطعہ کیا تماشہ ہو کہ ہے آب سے آتش سیال

جام سے قطرہ چڑھکا تو معلق ہی رہا  
مگر تھے قہر کی گرمی تپ حرق بن جائے  
قوتِ ماسکہ مسک کے قوا سے گم ہو  
حکمت آموز تر از علم جہاں ہو تو دہاں  
ہو تری عقل سے عاجز دم بحثِ معقول

دم ہو کیا باد صبا میں کہ دم سیر جہاں  
یوں ہی دو چار قدم خاک اڑا کر رہ جائے  
ہی وہ ہیکل میں اگر دیو تو صورت میں بری  
جلد اتنا کہ جہاں عرصہ جو لاں اُس کا  
زیب تن اُس کی جو مندی کا ہی ہر گل تصویر  
اِس فلک سیر کو جو لاں کرے تو ہی یہ ڈر

تھے ہاتھی کی لمبندی کی طرف کی جنگاہ  
کھنکشاں کو وہ فلک پر سے نہیں پر بھینکے  
جیسے ماسخے یہ بزرگوں کے ہو سجدہ کا نشان  
ہو جو اس فیل کا خرطوم سر اخیل کا صور  
اُس کے دانت اسکے لٹو ہیں بدشیر تیر شہنا  
آباداری میں تری تیغ کی ہو برقی کی موج

تیری شمشیر کو ہی خونِ عدد و روزِ مباح  
 طائرِ روحِ عدد کے لئے صیادِ اجل  
 طاقتِ دمِ زدن اس دُن میں ہو گئی ہی  
 پر ترا ذکر جو آتا ہے زباں پر تو نفس  
 ہو قوی دست اگر زورِ حمایت سے تری  
 تقویت دیوے اگر پاسِ حفاظت تیرا  
 ہے تیرے عہد میں فتنے سے زمانہ خالی

قطعہ

آتشِ و آب میں یہ ربطِ تیرے عدل سے ہے  
 کاکلِ بیجِ دُعاں کے لئے اُس کی دریا  
 خبرِ مجاہدِ عشرت ہے ترا جشنِ سعید  
 ہوتی ہے حیرتِ توصیف سے تیری شاہا  
 بس دُعا ہی پہ فقط ختمِ سخن کرتا ہے

جشنِ ہر سالِ ترا تجھ کو مبارک ہو دے  
 ہی یہ جب تک کہ زمانے میں جاوے سال

غزلیات

(۱)

کسی بکس کو لے بید اگر مارا تو کیا مارا  
 نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا  
 جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا  
 اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

نٹے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا  
ہنسی کے ساتھ یاں روتا ہو مثل قفل مینا  
نہنگ اڑدیا دیشیر نہ مارا تو کیا مارا  
کسی نے تمقہ لے لے بے خبر مارا تو کیا مارا  
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں  
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

دل بدخواہ میں تھا مارنا یا چشم بدہیں میں  
فلک پر ذوق تیر آہ گر مارا تو کیا مارا

(۲)

سم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہسم ونا سمجھے  
وہم ہے خاکساروں کو جب اپنا خاک کا سمجھے  
اوراں ہوتا ہو اُس بتاں سر سے کاوان گل  
حساب ملانہ پوچھے مجھے سی میے دل کو زخم کا  
کرس آہ رسا میری جو سیر عالم بالا  
مجھے آتا ہو رشک اس زندے اُشام پر ساقی  
نہ آیا خاک بھی رستہ میں نقشہ عمر رفتہ کا  
کند کار ہم نے پنچہ رتقہ دیر کو سونپا  
اور اُس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت کو خدا سمجھے  
ہم اپنی خاک ری اپنے حق میں کیا سمجھے  
چٹکنے کو صبا غنچے کی آواز در سمجھے  
حساب دو شاں درد دل اگر وہ دلربا سمجھے  
فلک کو بھی یونہی اک آبلہ سازیر یا سمجھے  
نہ جو دوع مالکہ رجا نے نہ جو خدا حفا سمجھے  
مگر سمجھے تو داغ معصیت کو نقش پا سمجھے  
خرد کے تیز ناخن ناخن انگشت پا سمجھے

سمجھے ہی میں نہیں تھی ہو کوئی بات ذوق اسکی  
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

(۳)

اُس ننگ آستان پہ جبین نیاز ہے  
درد وازہ میکدے کا نہ کر بت مختب  
وہ اپنی جان نماز ہے اور یہ نماز ہے  
ظالم خلا سے ڈر کہ در تو بہ باز ہے

خانہ خرابیاں دلِ حبیبِ غم کی دیکھ  
دہ ہی دو اخاب ہے جو خانہ ساز ہے  
مدحِ خالِ ردے بتاں ہوں مجھے خدا  
بختے تو کیا محب کہ وہ نکتہ لازم ہے  
اے ذوق اپنا سب پر کھلے کیون راز عشق  
بہرِ نالہ اک کلیدِ درِ کج راز ہے

(۴)

نہیں ثباتِ بلند می عز و شاں کے لئے  
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسمان کے لئے  
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے  
عصا ہو پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے  
تپش سے عشق کے یہ حال ہے مرا گویا  
بجائے مغز ہی سیما استخاں کے لئے  
الہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا  
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کاؤں پر سب ان کے لئے  
نہیں ہو خانہ بہ دشوں کو حاجتِ سامان  
اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانہ یا کس  
مثال نے ہو مرا جب تلک کہ دم میں دم  
بلند ہوئے اگر میرا کوئی شغلہ آہ  
چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم  
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیوں کہ ہو

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف  
اور اُس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

# نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب

## تشبیب قصیدہ

صبح دم دروازہ خُدا رکھلا  
 خسرو انجم کے آیا صرث میں  
 ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ  
 سطح گردوں پر پڑا تھارات کو  
 صبح آیا جانب مشرق نظر  
 تھی نظر بند ہی نیا جب رُخِ سحر  
 لاکے ساتی نے صبحی کے لئے  
 بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ  
 تاجِ زرین سرتاباں سے سوا  
 شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے  
 وہ کہ جس کے صورتِ کنون سے  
 روشناسوں کی جہاں فرست ہو  
 لاکھ عقدِ دلیں تھے لیکن ہر ایک  
 تھا دل وابستہ قفلِ بے کلید  
 بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب  
 مہرِ عالم تاب کا منظر رکھلا  
 شب جو تھا گنجینہ گوہر رکھلا  
 دیتے ہیں یہ گوہر کا یہ باز رکھلا  
 موتیوں کا بحرِ طرث زریہ رکھلا  
 اک نگار آتشیں رخسار رکھلا  
 بادِ گلِ بزم کا ساغر رکھلا  
 رکھ دیا تو ایک جامِ زر رکھلا  
 کعبہ امن و امان کا در رکھلا  
 خسرو آفاق کے منہ پر رکھلا  
 رازِ ہستی اُس پر ستر اس رکھلا  
 مقصدِ پیچ و پھت اختر رکھلا  
 واں لکھا ہے چہرہ قیصر رکھلا  
 میری حدِ دمع سے باہر رکھلا  
 کس نے کھولا اکب کھلایو نہ رکھلا  
 اب غلو پایہ منبر رکھلا



شاہ کے آگے دھر ہے آئینہ اب آلی سعی اسکند رکھلا  
 تم کرو صاحب قرانی جب تلک  
 ہو طلسم روز و شب کا در کھلا  
 معذرت

منظور ہو گزارش احوال واقعی  
 نوا پشت سے اسی پیشہ آبا پسوگی  
 آزادہ رد ہوں درم اسلک و صلک  
 استادش سے ہو مجھے پرغاش کا خیال  
 جام جہاں نما ہو شہنشاہ کا ضمیر  
 میں کون اور رنجتہ ہاں اس سے عدا  
 سہرہ لکھا گیا زرد امتثال امر  
 مقطع میں لڑی ہے سخن گسترانہ بات  
 لے لے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ  
 سودا نہیں جنوں نہیں دشت نہیں مجھے  
 جز انساط خاطر خست نہیں مجھے  
 دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے  
 مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے  
 سودا نہیں جنوں نہیں دشت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول پر غالب خدا گواہ  
 کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

لعلی

باز بچہ اطفال ہو دنیا سے آگے  
 اک کھیل ہوا رنگ سیلیاں مے نزدیک  
 ہوتا ہے شب روز تماشا مے آگے  
 اک بات ہو عجاز میجا مے آگے  
 جز وہم نہیں ہستی اشیا مے آگے

ایمان مجھے لوگے ہو تو کھینچے ہو مجھے کفر  
پھر دیکھئے اندازِ گل افشانی رنگتار  
کعبہ مجھے پیچھے ہے کلیسا کے آگے  
رکھ دے کوئی پیمانہ صہبائے آگے  
نفرت کا گماں گزری ہو میں شکست گزرا  
کیونکہ کہوں تو نام نہ ان کا مجھے آگے

ہم پیشہ وہم مشرب دہمرا نہ ہے میرا  
غالب کہ بڑا کیوں کہوا چھامے آگے

### غزلیات

وہر میں نقش وفا و صہ تلی نہ ہوا (۱)  
ہاں یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا  
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں  
وہ ستارے مجھے منے پہ بھی راضی نہ ہوا  
یوں تھے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی  
گوشتِ منت کش گلبارنگِ تلی نہ ہوا  
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے  
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سودہ بھی نہ ہوا

مر گیا حمدِ یک جنبش لب سے غالب  
نا توانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۲)

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا  
میں نہ اچھا ہوا بڑا نہ ہوا  
ہم کہاں قیمتِ آزمانے جائیں  
تو ہی جب خیرِ آزمانہ ہوا  
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی  
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا  
جان بھی دی ہوئی اُس کی محی  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرائے ہوا

(۳)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا  
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ  
در دکا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا  
دل سے ٹٹنا تری انگشتِ خانی کا خیال  
اس قدر دشمنِ ارباب و فنا ہو جانا  
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا  
بے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا  
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا  
نخنے ہے جلوہ گلِ ذوق تماشا غالب  
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں دوا ہو جانا

(۴)

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں  
اصل شہود و شاہدِ مشہود ایک ہے  
شہائے ہجر کو بھی رکھوں کہ حساب میں  
حیراں ہوں پھر شاہدِ ہر کس حساب میں  
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے  
جتنا کہ دیمِ غیر سے ہوں تیجِ دنا میں  
آر ایشِ جمال سے فارغ نہیں ہوں نہ  
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
غالبِ ندیمِ دوستِ آتی جو بولے دوست  
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بو تراب میں

(۵)

منظور تھی یہ شکلِ تجسلی کو نور کی  
اکِ خونِ چکانِ کفن میں کر ڈوں بناؤں  
قسمتِ کھلی تھی قدِ درخ کے ظہور کی  
چڑتی ہو آنکھ تھی شہیدوں پہ حور کی  
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صور کی  
اُڑتی تھی اکِ خبرِ ہوزِ بانیِ طیور کی  
آندہ ہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب  
 آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی  
 گرمی اسی کلام میں لیکن نہ اس قدر  
 کی جس سے بات اُس نے شکایتِ خرد کی  
 غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لچلیں  
 جج کا ثواب نذر کر دے گا حضور کی

(۶)

حُسن نہ گرچہ ہنگامِ کمال اچھا ہے  
 اس سے میرا مہِ خورشیدِ جال اچھا ہے  
 اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا  
 سا غرجم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے  
 بے طلب دیں تو مزا اُس سے سوا ملتا ہی  
 وہ گدا جس کو نہ ہو نوئے سوال اچھا ہے  
 اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہو منہ پر رونق  
 وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کمال اچھا ہے  
 قطرہ دریا میں جو بلجائے تو دریا ہو جائے  
 کام اچھا ہی وہ جس کا کہ آل اچھا ہے  
 ہم سخنِ قیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا  
 جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن  
 دُل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہی

(۷)

نکتہ چین ہو غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے  
 کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے  
 میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اسے جذبہِ دل  
 اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے  
 غیر چھترتا ہے لئے یوں تیرے خط کو کہ اگر  
 کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے  
 کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گرمی کس کی ہے  
 پردہ چھوڑا ہے وہ اسنے کہ اٹھائے نہ بنے  
 عشق پر روزہ نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب  
 کہ نگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(۸)

ابن مریم ہو کرے کوئی میرے دل کی دوا کرے کوئی  
 بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھتا کرے کوئی  
 نہ سنا کرے کوئی نہ سنا کرے کوئی  
 کون ہی جو نہیں ہی حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی  
 جب توقع ہی اٹھ گئی غائب  
 کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

(۹)

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہو مجھ سے جفا میں کر کے اپنی یاد شربت ہے مجھ سے  
 خدا یا جذبہ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے کہ جتنا کھینچتا ہوں دیکھتا جاتا ہے مجھ سے  
 آدم مردہ بدگمانی ہی آدم مرید ناتوانی ہی نہ پوچھا جائے ہو اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے  
 بسٹھنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت کہ دامن خیال پار چھوٹا جائے ہے مجھ سے  
 ہوئے ہیں بالوں ہی پہلے بند و عشق میں زخمی نہ جھاگا جاوے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہو مجھ سے  
 قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا مسافر غائب  
 وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مرزا سلامت علی دبیر  
 رباعیات

حاصل بین نقدِ آرمہ ہوتا ہے (۱) قطرہ دریاے آبرو ہوتا ہے

بھٹکتا ہے جو رو سی بھی تو منہ نکلیں  
 اٹھتے اٹھتے سفید رو ہوتا ہے  
 (۲)

کم مایہ سبک پیش جہاں ہوتا ہے  
 میزان سے بدیہی یہ عیاں ہوتا ہے  
 خور و دوں سے تواضع ہی بزرگی کی دلیل  
 بھٹکتا ہو وہ تپہ جو گراں ہوتا ہے  
 (۳)

جو قصر کرب حرص کو قیصر وہ ہے  
 آئینہ سکندر نے بنایا تو کیسا  
 تکیہ ہو جسے حق پہ تو نگر وہ ہے  
 دل جس کا ہو آئینہ سکندر وہ ہے  
 (۴)

رحمت کا تری امید دار آیا ہوں  
 چلنے نہ دیا بارگاہ نے پیدل  
 منہ ڈھانپنے کفن سے شرمسار آیا ہوں  
 اس واسطے کا نڈھوں پر آکر آیا ہوں  
 (۵)

گھر اپنا اُجاڑ کر بایا تجھ کو  
 لے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش  
 ڈھانپنا جو کفن سے منہ دکھایا تجھ کو  
 جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو  
 (۶)

جو روضہ میں بار بایاب ہو جاتا ہے  
 جلتا ہی جو شب کو قبر حیدر پہ چراغ  
 وہ ادج میں لا بواب ہو جاتا ہے  
 وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے  
 (۷)

خورشید سر شام کہاں جاتا ہے  
 مغرب ہی کی جانب ہو مزار حیدر  
 روشن ہو دبیر پر جہاں جاتا ہے  
 یہ شمع جلانے کو دہاں جاتا ہے

(۸)

ادنیٰ اسے جو سر جھکائے اعلیٰ وہی  
کیا خوب دلیل ہی یہ خوبی کی تدبیر  
جو خلق سے بہرہ دہی دریاہ ہے  
سجھے جو بر آپ کو اچھا وہ ہے

(۹)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے  
ہر رنگ میں جلوہ ہی تری قدرت کا  
بلبل کی زباں یہ گفتگو تیری ہے  
جس بھول کو سو نگھستا ہوں لو تیری ہے

(۱۰)

بندوں پر کرم حضرت باری کا ہے  
دی ہی جو خدا نے سرفرازی مجھ کو  
مقدور کسے شکہ گزاری کا ہے  
شرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

## مناظرہ قدرت

### صبح کا سماں

جب سرنگوں ہوا علم امکانِ شب (۱) خورشید کے نشان نے مثالیانِ شب  
تیر شہا ہے ہوئی خالی کمانِ شب تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سمنانِ شب  
آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے  
شب نے زرہ تاروں کی رکھ دی اتار کے

(۲)

شب تیر مشرقی جو چڑھی چرخِ پرستاب  
تھا بسکہ گرم خنجر بیضاے آفتاب  
پھر تیغِ مغربی نے دکھائی نہ آبِ تاب  
باقی رہا نہ چشمہ نیلو فری میں آب

محتاج ماہتاب ہو آ آب و تاب کا  
بارغ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

(۳)

میکلا جو صید شب کو خود یو جہاں صبح  
سلطان شرق دوش پر کھے نشان صبح  
ناوک شعاع مہر تھی گر دوں کمان صبح  
سبد نیر ابلق قلکی زیر ران صبح  
عالم تھا محو، عالم نیر فردز کا  
تار شعاع دام تھا غنائے روز کا

## رات کا سماں

(۱)

جس وقت پڑا سکہ شب سیم قمر پر  
مریخ کا خنجر جو چلا ترک سحر پر  
پھر کوئی نہ راغب ہوا نگر رشید کے زیر پر  
بن بن کے شفق خون چڑھا برج کے سر پر  
کیوان علم - ایوان فلک در چاند لگیں تھا  
آفاق سیماں کی طرح زیر لگیں تھا

(۲)

شب تھی کہ سیہ بختی کفار ہر اک سو  
کچر و صفت نقش نگیں تھے جو وہ بدو  
چشم یہ قہر تھی، یا ظلم کا گیسو  
آخر کو ہوئے شب کی سیاہی اسے سیہ رو  
روشن ہو سیہ کا روہ سب فوج جفا تھی  
معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی



(۳)

وہ شہنشاہ اندھیرا وہ بیاہاں کی سیاہی گرمی کی وہ پیاسا اور وہ پانی کی مٹاہی  
 آباد وہ گھر اور وہ اکسار تباہی یہ حادثہ اور آلِ نبیؐ شانِ الٰہی!  
 گز فرش پہ سو جاتے تھے روتے ہوئے بچے  
 پھر پیاس سے چونک اٹھتے تھے موتے ہوئے بچے

## گرمی کا سماں

(۱)

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب  
 بے آگِ مریخ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب خطِ غبار سے ہے لپی ابری سحاب  
 چھالاسے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں  
 خود چھپے ہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

(۲)

مستی خراب چنچ پہ ہے برجِ آب کی رنگت ہی برجِ موت میں ابھی کباب کی  
 دریا میں کچھ بٹھیر گئی ہے جباب کی حدت ہے موجِ موج میں تیر شہاب کی  
 فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل ٹپری  
 پانی کی بھی زبان دہن سے نکل ٹپری

(۳)

مثلِ تنور گرم تھا پانی نہیں ہر جباب ہوتی تھیں بسخِ موج پر مرغابیاں کباب  
 گلخنِ صدف تھے۔ دانہ بریاںِ خوش آب آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا  
 دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا  
**گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت**

(۱)

دود و قدم پہ ہوتے ہیں اطفال بچو اس  
 اک پانی پانی آتا ہے اور ایک پیاس پیاس  
 یوں قافلہ ہے گر و علمدار حق شناس  
 جس طرح پیاسے حشر میں کوثر کے آس پاس  
 عباسؑ شان ساقی کوثر دکھاتے ہیں  
 اک دم میں ساری فوج کو پانی پلاتے ہیں

**فوجوں کی ابری وریل چل**

(۱)

یک صفتِ بخت سیہ ڈھالیں تھیں بیکار  
 تھی تن میں زہرہ نامہ عصیاں سے گراں بار  
 برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفار  
 اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سونہار  
 دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند  
 تھا نیزوں کو ریشہ قدم پیر کی مانند

(۲)

بیکار ہر اک دست ہنر تھا دم بیکار  
 شانوں کی طرح خشک ہوئے پنجہ رکفار  
 تھا مثل رکابوں کے تھی قالبِ اسوار  
 اور سہم سے تھے ناوکِ خود رفتہ کماندار

دہشت سے سپر کرتے تھے شمشیر سے پہلے  
ہاتھوں سے کہاں چھوٹتی تھی تیر سے پہلے

(۳)

ترکش میں عدد دھویدھتے تھے نیزوں کی ہر باب زہ کرتے تھے نیزوں کی ناز میں تنگوار  
مانند سپر روکتے تھے چہرے پہ تلوار تیغوں کی جگہ نہ دیا روکنا اپنے تھے کعبہ دار  
اک نہر زہ پوشوں کے خوں کی جو بھی تھی  
موجوں کی طرح آپ زہ کانپ رہی تھی

## تلوار کی تعریف

(۱)

جس مورچے میں لیلیٰ تیغ دوسر گئی چنگ بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی  
ہر صدف میں خاک اڑا کے ادھر سدا دھری پر یہ نہانا کے ابو میں نکھد گئی  
عالم نہ پوچھو قطرہ فشانے کے حسن کا  
جو بن چٹیک رہا تھا جوانی کے حسن کا

(۲)

آگے کبھی بڑھی - کبھی پیچھے کو پھر بڑھی سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پر گر بڑھی  
تجویز جو لعینوں نے کی وہ مضر بڑھی افتاد ان سے پوچھے یہ جن کے سر بڑھی  
اٹھی - گری - بلند ہوئی - پست ہو گئی  
پی پی کے میکشوں کا بو مست ہو گئی

# تلوار کی کاٹ

(۱)

جس صف پہ گری صاف صفائی نظر آئی جس غول پہ چمکی تو ہوا غل کدھر آئی  
 جھپٹی جو پر سے پر تو ہو میں یہ بھر آئی اک اک کو خبر بھی نہ رہی اپنی پرانی  
 لہرا کے جو بیٹھی - تو جبکہ کاٹ کے اٹھی  
 ناگن کی طرح شبنم خوں چاٹ کے اٹھی

## ایضاً

(۱)

چھل بل تھی پھلا وہ تھی طلسمات تھی اسرار چالاک شہسار - طرمدار - نمودار  
 نیزہ کہیں - خنجر تھا کہیں اور کہیں تلوار بجلی تھی کسی جا تو کہیں نور کہیں نار  
 سیاب تھی سیلاب تھی - طوفان تھی ہوا تھی  
 شعلہ تھی - شرارہ تھی - قیامت تھی - بلا تھی

## رزمیہ

(۱)

یہ جان لو جس وقت کھچے گی مر تی لووار تیغوں میں نہ دم ہو نگے نہ سر ہو نگے نہ شرار

اک گلے میں کروں گا پرے فوج کے بیکار  
جز گردنہ پیدل نظر آئیں گے نہ اسوار  
سہ کوئی افواجِ بد اعمال کروں گا  
چیونٹی کی طرح مورچے پا مال کروں گا

(۲)

انسان تو کیا جن بھی نہیں ہم سے کرے ہیں  
سر کے نہیں جن پہ قدم رن میں گرے ہیں  
نام اپنی دلیری کے دلیروں میں بڑے ہیں  
اس نعرے کے سکتے عربتاں میں بڑے ہیں  
کس کس پہ چلی تیغ ظفر ناک ہمارے  
ہر شہر میں ہر ملک میں ہو دھاک ہمارے

(۳)

مکرور ہیں رستم سے پہلو اں مے آگے  
مجبور ہیں سہراب و زربیاں مے آگے  
نابود ہے فرعون کا ساں مے آگے  
رکھے نہیں کچھ جان نبی جاں مے آگے  
بیہوش ہو جس صاحبِ شمشیر کو ٹوکوں  
روباہ بنے ڈر کے اگر شیر کو ٹوکوں

## گھوڑے کی تعریف

(۱)

اللہ سے نزاکت فرسِ غنچہ دہن کی  
آتی ہیں نظر صاف رگیں گلِ سودن کی  
سیرت ہو اگر شیر کی صورت ہمارن کی  
راؤں میں ٹھہرتا نہیں بدبو گھ کے رن کی

دھن ہے کہ گزر جائے حدِ چرخِ بریں سے  
ہر جہت میں یہ قصد کہ اُڑ جاؤں نے سے

(۲)

چلنے میں یہ شمشیر ہے پلہ میں یہ ہے تیر لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں یہ تدبیر  
جانے میں رسولوں کی دُعا آنے میں تاثیر چھپنے میں یہ ہو خواب عیاں ہونے میں تعبیر

مضمون ہیں بہت پر کوئی دُکھ پ نہیں دے  
اسرار ہے اعجاز ہے یہ اس پ نہیں دے

## میر بر علی انیس

### رُباعیات

(۱)

فرصت کوئی ساعت نہ زمانے سے ملی بیگانے سے راحت نہ یگانے سے ملی  
حقا کہ پلک نواز ہے ذات تیری جنت اُنھیں شکوں کے بہانے سے ملی

(۲)

بتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو اُنہیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نہ رہے تو  
ہو قربِ رگِ جاں سے اور اُس پر یہ بعد اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

(۳)

گلشن میں بھروسہ کہ سیر صحرا دیکھوں یا معدن و کوہِ دُشت و دریا دیکھوں

ہر جاتری قدرت کے ہیں ٹاکھوں جلے حیراں ہوں کس دوتا نکھوں سے کیا کیا دکھوں

(۴)

آغوشِ لحد میں جبکہ سونا ہوگا جز خاک نہ تکیہ نہ بچھنا ہوگا  
تنہائی میں آدکون ہو دیگا انیس ہم ہو دینے آد سبر کا کونا ہوگا

(۵)

جو شے ہے فنا سے بچا سچا ہے جو چیز ہے کم سے سو اچھا ہے  
جو بحرِ حباں میں عمر مانند حباب غافل اس زندگی کو کیا سچا ہے

(۶)

ہاں جو شِ غم سیدِ عالمی ہو جائے چہروں پر ان آنکھوں کو بجائی ہو جائے  
یوں سختِ عکبر چشم سے چلیں ہم بہر شاخِ خرہ پھولوں کی ڈالی ہو جائے

(۷)

مردم کے مسافر نے بسایا ہو تجھے منج سب پھر کے منہ دکھایا ہو تجھے  
کیونکہ نہ لپٹ کو تجھے سوؤں و قبر میں نے بھی تو جان بیچے پایا ہو تجھے

(۸)

چہرے کونی کب جو ہر ذاتی کا ہو ہر گل کو گلہ کم انتفاقی کا ہے  
شبنم سے جو وہ گریہ پوچھی تو کہا رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

(۹)

ماں باپ بھی سو ابے شہنشاہِ تیری انزوں ہے تیسے غلبے رحمتِ تیری  
حضرتِ انعام کر کہہ دو ترخ میں چلا وہ رحم ترا ہے یہ عند اللہ تیری

(۱۰)

ادبار کا کھڑکا چشم جاہ میں ہی جاگ جاگو کہ خوف اس راہ میں ہی  
اٹھو اٹھو یہ خواب غفلت کینک دیکھو دیکھو اجل کمینگاہ میں ہی

## سرایا

(۱)

کمتا ہے کوئی چشم کو زنگس کوئی آہو اُس کے تو بصارت نہیں اُس کے نہیں آبرو  
پہرے کو کما کر گلِ مہتاب ہے یہ رو اس میں نہ یہ سبز نہ یہ سُرخ نہ یہ خوشبو  
بے بوس ہے وہ اک پھول یہاں باغ لگا ہے  
ہر چسبہ میں بس ایک نہ اک داغ لگا ہے

(۲)

مضمون دہن کے شعراء رہتے ہیں جو یا پوچھے کوئی کوثر سے زباؤں کو بھی دھویا  
غنج جو کما لطف سخن اور بھی کھویا اسرارِ الٰہی سے بھی واقف ہوئے گویا  
ہیں عقدہ کثامتہ سے جو بولیں تو کھلے گا  
اس عقدے کو یہ آپ ہی کھولیں تو کھلے گا

(۳)

دانستوں کو گھر مرثیہ گو کہتے ہیں سارے بتلاؤ گھر خوب ہیں یا عرش کے تارے  
یہ درِ نجف وہ ہیں علی رضا کو جو ہیں پیارے تاروں کو بھی صدتے فلک ان پر سوارے  
کیا وصف کریں اُن کا سواصل علی کے  
گو ہر نہیں قطرے ہیں یہ سب نور خدا



لب کہ جو کما لعل بیضمون ہو بیزنگ (۴) اس وجہ کے قابل نہیں ہو یہ دہن تنگ  
 بولوب جان بخش کا ہوتا ہے بھی ڈھنگ عجیب میٹھا کا دکھائے تو کوئی سنگ

قدرت نہیں اُن ہونٹوں کے اوصاف کی ہمیں  
 یہ وہ ہیں کہ مُردہ کو جیلا دیتے ہیں دم میں

## تلوار کی تعریف

دہ غیظ وہ لہر وہ چمکتی ہوئی تلوار (۱) گویا تھا مجسم غضب حضرت قتار  
 اتنا تو پکارے کہ خبر دار خبردار ڈھالیں نہ اُٹھی تھیں کہ گرمی برق شراب  
 گرمی سے ہوا میں شرر اُڑتے نظر آئے  
 جھونکا تھا غضب کا کہ سر اُڑتے نظر آئے

اُٹھ کر کبھی ٹھہری کبھی پھسکی کبھی چمکی (۲) سر گرے گردن جدھر اُس تیغ نے غم کی  
 سیدھی صفِ دشمن کو ملی راہ عدم کی سیفی تھی کہ گویا دم شمشیر پہ دم سکی  
 دم بھر میں صغیر صاف تھیں بیدا گردن کی  
 تھی بیخود کی طرح خاک پہ بوجھار سروں کی

پیری کبھی کہ خون میں نہا کر نکل آئی (۳) ٹھہری کبھی غوطہ کبھی کھاکر نکل آئی  
 کاٹی جو زرہ موج میں جا کر نکل آئی منیہا سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی  
 کیا ڈرے طوفان کا جو چالاک ہو گیا جب باڑھ پہ دریا ہو تو پیراک ہو گیا

(۴)

غصہ میں گئی اور غضبناک پھر آئی      افلاک پہ چکی تو سوئے خاک پھر آئی  
 بیخوف سروں سے گئی بیاک پھر آئی      غل بیتا، تھا بھاگو دہ سفاک پھر آئی  
 خالق کا غضب خلق میں کہتے ہیں اسی کو  
 یہ مرگ مفاجات نہ چھوڑے گی کسی کو

(۵)

سرکش تھے جو اس فوج تلوار میں تہکار      اک دار میں کرتی تھی دوخت ان کچھ دلوں  
 جل جل کے وہ احقر کی طرح ہوتے تھے فی النار      ترکیب عناصر میں خلل پڑتا تھا ہر بار  
 دوچار ہو اساتذہ جو خیرہ سر آیا  
 ہر مصرع قد اس کا رباعی نظر آیا  
 ایضاً

(۱)

کیوں صفت مگر نہ کی صفائی نہ گئی      کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی  
 کاٹ چھانٹا اور وہ لگا وٹ بکھائی نہ گئی      سیکڑوں خون کئے اور کہیں سیئی نہ گئی  
 شور تھا برق پے جلوہ گری نکلی ہے  
 جان لینے کا بل بن کے پری نکلی ہے

(۲)

جنگ میں تیغ کو دعویٰ تھا کہ کیا ہونیں      سر اٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ غصا ہونیں  
 چرخ کتنا تھا کہ یارب نہ وبالا ہوں میں      برق کہتی تھی کہ تلوار ہو یا ہوں میں

کس میں ہے یہ جو تڑپ زیرِ فلک میری ہے  
 تیغ کرتی تھی اُسا رہ یہ چمک میری ہے  
 ایضاً

آفت تھی قیامت تھی چھدا وہ تھی بنا تھی (۱) بجلی تھی کڑی تھی قردلی تھی قضا تھی  
 روکے کوئی کیا با جڑ نہ تھی سیل فنا تھی پشتہ تھا وہ ظالم کہ موجس کی غذا تھی  
 بجلی کو بھی تڑپا دیا تھا جلوہ گری نے  
 تاب اس کی نہ تھی مانگ نکالی تھی پیو نے

ایضاً

بسل ہوا جس کو لچک اس کی نظر آئی بجلی سی جو چکی تو کیجیوں میں در آئی  
 چورنگ کیا اس کو سے آٹھ کر آئی اٹھ کیلیاں کرتی ادھر آئی ادھر آئی  
 حوروں میں یہ گرمی نہ لگا ڈٹ یہ پرمی میں  
 بیہم کیا لاکھوں کو اسی عشوہ گرمی میں

(۲)

نواد کی دُھا لوں پہ وہ تلوار نہ ٹھہری اک دم بھی میانِ صفت کفار نہ ٹھہری  
 سرسیرکڑوں کاٹے کین نہزار نہ ٹھہری خون اتنے کئے اور گنہگار نہ ٹھہری  
 مجرم رہی سرکش رہی بیباک رہی وہ  
 دُھبا نہ لگا خون سے بھی پاک رہی وہ  
 ایضاً

نے دُھا لے پہ نے سر پہ نہ گردن پُک کی وہ سینے پہ نہ بکتر پہ نہ جوشن پہ رُک کی وہ

نے سنگ نہ اشجار نہ آہن پہ رُکی وہ      نے زین پہ نہ پا کھر پہ نہ تو سن پہ رُکی وہ

یہ چاشنی خونِ عدو بھبھائی اس کو

بھلی کی طرح جس پہ گری کھا گئی اس کو

سینے پہ در آئی تو نئی چال سے نکلی      (۲) پہونچے کو قلم کرتی ہوئی ڈھال سے نکلی

ڈوبی جوزرہ میں تو عجب حال سے نکلی      مچھلی سی تڑپتی ہوئی اک جال سے نکلی

چار آئینہ کو آٹھ کیا کاٹ نے اُس کے

بٹھلا دی ہر اک کشتی تن گھاٹ نے اُس کے

ایضاً

پہونچی جو چمک کر کسی ظالم کی سپر تک      بجلی سی سپر سے وہ گئی کا سہ سر تک

اللہ ری صفائی نہ ہوئی اس کو خبر تک      یہ سر سے گئی سینے پہ سینے سے مکر تک

کاٹی کمر اس طرح سے دو کر کے زرہ کو

جس طرح کوئی کھول لے ناخن سے گرہ کو

میر ہمدی حسین مجروح

(تشبیبِ قصیدہ)

خاکِ ہوں کو جگرِ دولِ مگرے ضبطِ فغاں      دیکھنا آتشِ خس پوش سے گٹھے نہ دھوں

ہمسری اُس دہنِ تنگ سے کس طرح کرے      غنچہِ ظاہر میں تو خوشبو ہی پڑے بات کہاں

میں جو کتا ہوں تجھے قتل ہی میرا منظور      کس صفائی سے وہ بسیا ختم کتا ہو کہاں

پردہ ہی بیا رکا بہتر ہی کہ جوں شبنم دھیر      وہ اگر سانسے آیا تو یہ بے تاب کہاں

جد لازم ہے ہر اک کام میں گر غور کرو نہ تو مشکل کوئی مشکل ہے نہ آساں آساں  
یاد رہتی ہو فقط نام سے دیکھ عثقا کو نام رہنے کے لئے اسے مٹایا ہو نشان

خوش دلی بہم اسباب کا ہونا معلوم  
دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں  
تشبیہ قصیدہ

کچھ نئے رنگ سے اس فصل میں ہے خوش بہار باغباں کی نہیں کچھ سعی گلوں کو درکار  
اس قدر بارغ میں ہو غنچہ و گل کی کثرت کہ ہوا باد صبا کا بھی گزرنہ نادشوار  
سبز عالم کو کیا اہم و ہوائے ایسا آشیاں بننے کو بلبل کے نہیں ہیں خس و خوار  
اہلئے محو کے جزو کہ ورت یں تک ہو گیا صاف اگر تھا اکبریل نکھوں میں غبار

معتدل فیض ہوا سے ہے یہ طبع عالم  
کوئی نرگس کی صفت میں نہیں لکھتا ہمار

### غزلیات

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا را، سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا  
کچھ عرض تنہا میں شکوہ نہ ستم کا تھا میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا  
اک عمر کا دکھ پائے سوتے ہیں فرغانے لے غلغلہ محشر ہسم کو نہ جنگا جانا

مجرور ہوئے مائل کس آفت دوراں پر  
لے حضرت دل تم نے بھی دل نہ لگا جانا

شجر پر برق کا کھٹکا زمیں پر سیل کا ڈر (۲) ہم آشیاں نہ بنائیں بھلا کہاں صیاد  
نہ سو جھتی ہے رہائی نہ موت آتی ہے نہ مہربان ہے قسمت نہ مہرباں صیاد

تمام عمر ہا قید اب نہ ہا کیسا ہوں مجھے تو یاد نہیں اپنا آشتیاں صیاد  
 کبھی نہ دانہ پہ کرتے نہ دام میں پھنستے  
 کہیں میں اپنی نہ ہوتا اگر نہاں صیاد  
 (۳)

حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز  
 تم بھی چوری کو یقین ہو نہ کہو گے اچھا  
 ذکر بر باد دی دہلی کا سنا کہ ہمد  
 میں ہوا کی مجمع احباب کا بچھا گلچیں  
 دار فانی میں نہ کر فکر قیام اسے ناداں  
 جن کے ایوان تھے ہم پلہ قصر قصہ  
 با تھ بیداد ستم سے نہ اٹھانا ہرگز  
 اب ہمیں دیکھ کے آنکھیں نہ چرانا ہرگز  
 نیشتر زخم کمن پر نہ لگانا ہرگز  
 مجھ کو گلہ ستہ رنگیں نہ دکھانا ہرگز  
 گزریں ہریاں گھر نہ بنانا ہرگز  
 اُن کی ملتا نہیں قبروں کا ٹھکانا ہرگز  
 قصر حالی کے حوالی میں ذرا تم مجھ روح  
 اپنی ڈیڑھ انیٹ کی سجدہ نہ بنانا ہرگز

(۴)

دل کی بے چنیاں گئیں نہ کہیں  
 اتنا مردود ہوں کہ ڈر ہے مجھے  
 میں تو سمجھا ہوں عشق غیر غلط  
 اُس کا ملنا تو ہے بہت دشوار  
 اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں  
 قبر سے پھینک دے زمیں نہ کہیں  
 اُن کو ہو جائے پر نقیب نہ کہیں  
 گم ہوں اس راہ میں نہیں کہیں  
 بزم مے کب ہیں چھوڑنے والے  
 ہوں گے مجروح یاں کہیں نہ کہیں

(۵) میں خنم ہوں تو سو رہا ماس دیدہ ہوں  
 میں اک کتاب خوب ہوں آپاب دیدہ ہوں  
 میں قبر میں مسافر منزل رسیدہ ہوں  
 میں دستِ روزگار میں تیغ کشیدہ ہوں  
 اس خاکہ ان سے طبع کو ہوتا نہیں لگاؤ

کس جو ہر لطیف سے میں آفریدہ ہوں

(۶) سدا عروج پہ مانند حسن یار ہوں میں  
 مفید ہونے میں گوہرِ خجستہ کا ہوں میں  
 شبِ فراق کی بے چینیاں معاذ اللہ  
 فروغِ بخشِ نظر ہوں نہ زیب کا شانہ  
 نظروں چھپ کے بھی ڈالی ہر جہنم میگوں پر  
 خزاں کو دخل نہیں جس میں بہار ہوں میں  
 مگر مزاج میں عالم کے ناگوار ہوں میں  
 کہ ایک آن میں مریزا ہزار بار ہوں میں  
 فضا کے دہریں شمعِ سہرِ مزار ہوں میں  
 نگاہِ ناز یہ کمتی ہو شہباز ہوں میں

ہے اُس کے دیدہ خو نبار کا یہی ایسا

کہ لالہ رو ہو اگر تم تو لالہ کار ہوں میں

(۷)

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں  
 وہ نہیں ہیں تو درد کو اُن کے  
 یہ بھی کچھ جی میں آگئی ہوگی  
 لا اُبا لی خرام ہے مجھ روح  
 لا کھفتے اٹھائے بیٹھے ہیں  
 سینہ سے ہم لگائے بیٹھے ہیں  
 کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں  
 وضع کیسی بنائے بیٹھے ہیں  
 آج رندوں میں آئے بیٹھے ہیں  
 ق

غم کے چھٹ جانے کی حکمت ہی سہی <sup>(۸)</sup> جان دنیا اسے رشوت ہی سہی  
 کچھ تو ہے تلخیِ غم کی تدبیر لب شیریں کی حکایت ہی سہی  
 کوئی لے جائے مجھے قاتل تک غلبہ شوقِ شہادت ہی سہی  
 ہاں شبِ غم تو بسر ہو مجسروح  
 صبح کو روزِ قیامت ہی سہی

(۹)

یہ جوابِ لطفِ زبانی اور ہے کچھ مری اُلفت بڑھانی اور ہے  
 جانیشیں ہیں اُس کے پیچیدہ مٹ طرزِ جویرِ آسمانی اور ہے  
 ہو گئے نابود۔ پر باقی ابھی اک نشانِ بے نشانی اور ہے  
 کیا مرہ جب اور واقف ہو گئے لذتِ دردِ نہانی اور ہے  
 یوں تو ہیں مجروح سب شاعر فصیح  
 میر کی پر خوش بیانی اور ہے

(۱۰)

وہ کہاں جلوہ جہاں بخش بتانِ دہلی کیوں کہ جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی  
 ان کا بے وجہ نہیں ٹوٹ کے ہونا برباد ٹھونڈھیں ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی  
 ہر۔ زرخاک کو کرتا ہی۔ یہ سچ ہو لیکن اس سے کچھ بڑھ کے ہیں صاحبِ نظر ان دہلی  
 وہ ستم و بچہ چکے تھے کہ رہے آسودہ فتنہ و حشر میں آفتِ زوگانِ دہلی  
 کرمت و غربت و تنہائیِ شبہائے دراز  
 اور مجسروح دل افکار۔ بیانِ دہلی



# منشی امیر احمد امیر مینائی مَر حُوم

## غزلیت

(۱)

کچھ ٹھکانہ ہے ناتوانی کا      نہ اٹھا بوجھ زندگانی کا  
مرگ جس کو جہاں میں کہتے ہیں      نام ہے میری زندگانی کا  
مثل شبنم ہمارے قسمت میں      ایک دانہ ہے وہ بھی پانی کا  
بہر نام سکندر آئینہ      چشمہ ہے آبِ زندگانی کا  
نہ اٹھا مفلسی میں دستِ سوال      ہے یہ احسان ناتوانی کا  
منتظرِ حشر میں ہے دامنِ تر      مہرِ محشر کی مسہ بانی کا  
زیست کا اعتبار کیا ہے امیر      آدمی بلبکہ ہو پانی کا

(۲)

عمرِ برقِ دُشوار ہے دنیا      کتنی بے اعتبار ہے دنیا  
نشہِ عیش یاں نصیب کسے      کہ سراپا خمار ہے دنیا  
آنے جانے پر سانس کے ہمدار      سخت ناپائیدار ہے دنیا  
ایک جھونکے میں ہو ادھر سے ادھر      چار دن کی بہار ہے دنیا

بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیر

دیکھنے کو بہار ہے دنیا

(۳)

جی ہی لیگا غمِ جانان میرا  
ملکِ المیت جسے کہتے ہیں  
چار آنسو جو نہ امت سے ہے  
ضعف سے ہوں صفتِ تارِ نظر  
مچھ کو کھا جائیگا مہمان میرا  
زندگی بھر ہے نگہباں میرا  
دھو گیا نامہ عصیاں میرا  
کیا کرے گی صفتِ مڑگاں میرا  
میں حزیں، زخم ہے خنداں میرا

(۴)

موقوفِ جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا  
ابے برقِ حسنِ یاریہ اچھا ظہور تھا  
بانٹا تمام خلق کو اللہ نے وہی  
عجزِ دنیا نہ ادھر تو ادھر تھا غرورِ دنا  
میرے عمل تو قابلِ دوزخ ہی تھے مگر  
کیا بات امیرِ جوشِ نشاطِ ثباب کی  
اللہ سے لاغری کہ تری جلوہ گاہ میں  
بترے جلال میں بھی مزہ ہو جمال کا  
قالب کو بھی قیام نہیں روح کی طرح  
ہم ہیں سیاہ کار تو رحمت ہی پردہ پوش

(۵)  
پس پس گیا ہوں دیکھیں گردِ نگاہ میں  
چشمِ کرم چھپی ہے غضب کی نگاہ میں  
منزل چلی ہی ساتھِ مسافر کی راہ میں  
مے پیئے ہیں تو سایہ ابر سیاہ میں

سودا و میر دو لوت تھے کامل مگر امیر

ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

(۶)

کتابے کون آہیں اپنی اثر نہیں  
ہم بقیارہ لوستے ہیں کب سے خاک پر  
خُفّیل میں شمع، بَخ میں شبنم، تلک برابر  
افسردگی دہی ہے ہماری پلس فنا  
دیتا ہے طرفہ میکدہ بے خودی امیر

ہاں دل دکھے کسی کا یہ مَدِ نظر نہیں  
آسودگانِ خاک تھیں کچھ خبر نہیں  
کس کی ہی آنکھ جو مرے ماتم میں تر نہیں  
سنگِ حزارہ میں بھی ہمارے شر نہیں  
سبست میں کسی کو کسی کی خبر نہیں

(۷)

حسرت نہیں وطن کی تباہی میں رہ گئی  
صد شکرِ عفو میرے گنہِ حشر میں ہوئے  
دُپ بے ہوئے نصیب نہ اچھلے کسی طرح  
اللہ لے انقلاب محل ہے نہ قصر ہے  
صد شکرِ حق نے میری تواضع قبول کی  
غنی زار کوئے یار میں کیا جالی اپنی خاک  
پر دے سے اسکی ذات کو کیا کام تھا امیر

کچھ گردِ خُحی کہ دامنِ راہی میں رہ گئی  
حرمت گدا کی مجلسِ شاہی میں رہ گئی  
کشتی اُبھر اُبھر کے تباہی میں رہ گئی  
ترت فقط عمارتِ شاہی میں رہ گئی  
اچھی غنی شے خزانہ شاہی میں رہ گئی  
انہی غنی کم کہ اڑکے ہواہی میں رہ گئی  
چھپ کر صفاتِ نامتناہی میں رہ گئی

(۸)

دل میں جو داغ ہیں ندامت کے  
سو لکھے جب پھول میری تربت کے  
دل مرا اور آرزو تیری  
تیری صِدِّیتِ بنا کے بیٹھ رہے

بھول ہیں سب یہ باغِ حِبت کے  
دوڑے سقے سیلابِ حِبت کے  
جانِ صِدِّیتِ ہو ایسی حسرت کے  
کارکنِ کارِ کا ہنست کے

اس کا نقشہ کھچے تو لے نقاش  
کیوں نہ ہو رنگ آنسوؤں کی سیاہ  
جتنے تیکے میں سور ہے ہیں امیر  
رنگ بھرنا میری طبیعت کے  
ہیں عزا دار دل کی حسرت کے  
یا رہیں سب ہماری صحبت کے

(۹)

دھلا کے اک جھلک جو وہ روپوش ہو گئے  
میں ہوں وہ عندلیب ہوا جب ترانہ سنج  
سب ذوق شوق ساتھ جوانی کے چلے  
کبتک بغل میں پائے ہوئے دل کو روئے  
افسردہ دلغہ دل ہوئے پیری میں کیا امیر  
کیا کیا خیال خواب فراموش ہو گئے  
جتنے کھلے تھے گل بہت تن گوش ہو گئے  
دو چار دن وہ دلوں وہ جوش ہو گئے  
خالی پونہیں ہزاروں کے آغوش ہو گئے  
گو با چراغ صبح کو خاموش ہو گئے

(۱۰)

ہوئے نامور بے نشان کیسے کیسے  
نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے  
سناروں کی دیکھو بہار آنکھ اٹھا کر  
خزاں لوٹ ہی لینگئی بلغ سارا  
بنا کر دکھائے مرے درد دل نے  
رہ عشق میں پھرتے ہیں مارے مارے  
بندھے تار اشکوں کے غربت میں کیا  
جگر میں تڑپ دل میں درد آنکھوں میں دم  
امیر اب دینے کو تو بھی رواں ہو  
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے  
ہوئے بلغ نذر خزاں کیسے کیسے  
کھلاتا ہوا بھول آسماں کیسے کیسے  
ترپتے رہے باغیاں کیسے کیسے  
تہ آسماں آسماں کیسے کیسے  
تباہی زدہ کارواں کیسے کیسے  
ملے خاک میں کارواں کیسے کیسے  
ملے ہیں ہمیں مہماں کیسے کیسے  
چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے

# فیض الملک الواب زخاں داغ دہلوی مرحوم

## غزلیات

(۱)

جلوہ اس کا نظر نہیں آتا	نہیں آتا نظر نہیں آتا
آنکھ کھلتی ہی خواب غفلت سے	ہائے کیا کیا نظر نہیں آتا
ہم تو کہنے کو حال دل کہدیں	سننے والا نظر نہیں آتا
ڈھونڈھتی ہیں جسے مری آنکھیں	وہ تماشا نظر نہیں آتا
تو نے جس دن سے کی سیحالی	کوئی اچھا نظر نہیں آتا
لے چلے مج کو رہ روانِ عدم	یاں ٹھکانا نظر نہیں آتا
ہمیں اے داغ کو رہا وطن ہیں	درہ وہ کیا نظر نہیں آتا

(۲)

شبِ فراق جو دستِ دعا بلند ہوا	ندائیں آئیں کہ بابِ قبولِ مست ہوا
تھاری لطف و عنایت کا داہ کیا کہنا	کہ جس کا درد کیا وہ ہی دردِ مست ہوا
دورِ عجز پہ سو سیخِ سرورِ محکو ہوئے	بڑا ہی ناز ہوا جب نیا زمیں ہوا
وہ دل ہی جو ترے تلوؤں تلے ہوا پال	وہ سر پہ بوتیرے نیزے پہ طرب ہوا

علک نشہ الفت کا داغ ہو نہ سکا  
گھڑی گھڑی میں دو بالا ہوا دو چپ ہوا

(۳)

مزاج اچھا اگر پایا تو سب کچھ اُسے بھریا  
یہ پوچھو تو مسافر تو نے کیا لطف سفر پایا  
بند صاحبِ خیم کا انگور اُسے کیا نثر پایا  
نہ پایا تھا کبھی آزارِ الفت میں مٹے پایا  
کہیں کیا داغ ہم آرام بہنے کس قدر پایا

(۴)

بشر نے خاک پایا لعل پایا یا گسر پایا  
نفس کے آنے جانے پر بشر کی زندگی ٹھہری  
جراحت کا مزا ہو چارہ گرنا سورا ہو جائے  
دکھا یا تھا کبھی خونِ جگر ہم نے مکھڑکھا یا  
رکسِ مصطفیٰ آبا کے نوکر ہوئے جسے

پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا  
سامنے مہمان کے جو تھا مسٹر رکھ دیا  
اُس نے میرا فیصلہ موقوف مجھ پر رکھ دیا  
دل جو ہم نے لالہ دگل میں لاکر رکھ دیا  
قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھ دیا  
روزِ نر دیوار میں ظالم نے پتھر رکھ دیا  
حالِ دلِ کجبت نے سب اُنکے منہ پر رکھ دیا

(۵)

ہم نے اُن کے سامنے آدل تو خنجر رکھ دیا  
قطرہ خونِ جگر سے کی تو اضعِ عشق کی  
منصفی ہو تو غضبِ نامنصفی ہو تو ستم  
کہتے ہیں بڑے دغا آئی ہو ان پھوٹیں آج  
زندگی میں پاس سے دم بھرنے ہوئے تھے جلد  
دیکھیے اب ٹھوکریں کھاتی ہو کس کی نگاہ  
داغ کی شامت جو آئی اضطرابِ شوق میں

کیا میں نہ تھا ان گاہ میں عینِ کو طویر تھا  
اِس کا نہ بخشہ ناتری رحمت سے درد تھا  
مر جاؤں میں تو یہ نہ کہیں بے شعور تھا  
قربان اِس نگاہ کے بس میں غرور تھا

یاں متحانِ برقِ تجلے اضرور تھا  
کیوں نا اُمیدِ عقیقہ ہوں کیا یہ سنیگا وہ  
ہو خوش نما خراشِ دل اے نیچے بنوں  
کیوں تو نے چشمِ لطف سے دیکھا عجب کیا

میں کیا کہوں کہ عرش بریں کتنی دور تھا  
تقصیر وار تھا ہی جبے قصور تھا  
یہ سب سہی مگر تھیں جینا قہر تھا

(۶)

مانند آبلہ ہمہ تن آبدیدہ ہوں  
تسلیم و راستی کے لئے آفسریدہ ہوں  
لے خیر میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں  
میں پلے شوق و دوست متناہریدہ ہوں  
وہ کون ہو وہ میں ہی تو آفت سیدہ ہوں

(۷)

کہ نالے تیر بن بن کر کلیجے میں ترستے ہیں  
کہ رنگ گریہ کہتا ہی جگر کے زخم بھرتے ہیں  
خدا پر خوب روشن ہو کر جس طرح کرتے ہیں  
کہ جدم ہوش آتا ہو تو پیروں فکر کرتے ہیں  
اب اس میں حسرت یا سن متناہیر کرتے ہیں  
مری بیوشیوں سے ہوش ساقی کے بھرتے ہیں  
یہ آنکھیں جلتی ہیں خوب ہونقشے کرتے ہیں

(۸)

پر کیا کریں کہ تو ہے ہمساری نگاہ میں

پس وہ سے رہ گئی فریاد کچھ ادھر  
دیکھا سلف سے آج کل انصاف عش کا  
اے داغ صد مہ غم بھراں بجا درست

سوز و گداز عشق کا نذرت چسپیدہ ہوں  
سرو سہی ہوں اور نہ شلخ خمیدہ ہوں  
تاؤں مزا جیوں نے مجھے تجھ سا کر دیا  
لے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھڑ چھاڑ  
اے داغ جس کے واسطے روز جزا بسا

الہی کیا کریں خدیوہ محبت ہم تو مرتے ہیں  
نہ کرنا منفصل لے ناخن غم تیغ قاتل سے  
نہ پوچھو کچھ مکتوبت درد مندان محبت کی  
ہم اس غفلت کے صحنے کوئی دم چھوڑتے ہیں  
کبھی یہ دل تاشا گاہ تھا عیش و مسرت کا  
کبھی جھکتا ہوں شیشے پر کبھی گرتا ہوں ساغر پر  
نہ پوچھو داغ ہم سے انتظارِ یار کی صورت

آنکھیں بچھائیں ہمتو عدد کی بھی راہ میں

دل میں سنا گئی ہیں قیامت کی شوخیاں  
آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار  
کیسا نظارہ کس کا اشارہ کہاں کی بات  
مشاق اس صدا کے بہت در و مندر تھے  
دو چار دن رہا تھک کسی کی نگاہ میں  
کتنا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں  
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں پہنچی نگاہ میں  
لے داغ تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

(۹)

تیری صورت کو دیکھتا ہوں میں  
وہ مصیبت سنی نہیں جاتی  
دیکھنے آئے ہیں جو میری بغض  
موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے  
دور بیٹھا ہوا سرِ مفضل  
حشر میں داغ کوئی دست نہیں  
اُس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں  
جس مصیبت کو دیکھتا ہوں میں  
اُن کی صورت کو دیکھتا ہوں میں  
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں  
رنگِ صحبت کو دیکھتا ہوں میں  
ساری خلقت کو دیکھتا ہوں میں

(۱۰)

اشکِ خوں رنگ لائے جاتا ہے  
کتنا با وضع ہے خیال اُس کا  
نا اُمید ری مٹائے جاتی ہے  
غم نے اُس کے گھلا دیا دیکھو  
اُس کا آنا تو درکنار لے داغ  
دل بھی قابو سے ہائے جاتا ہے  
داغ اپنی جائے جاتا ہے  
بیکسی میں بھی آئے جاتا ہے  
شوقِ نقشبہ جائے جاتا ہے  
مجھ کو مہمان کھائے جاتا ہے  
دل بھی قابو سے ہائے جاتا ہے

(۱۱)

دشمنوں سے دوستی غیروں سے یاری پائے  
خاک کے پٹنے بنے تو خاک ساری پائے



دردہ تو کر لو زباں سے پھر وفا کرنا نہ تم  
لے نفلک ٹٹکری کچھ بھجائیں ہم انجام کار  
دل پہ گرتا بونہیں لے داغ تو جو ملے ٹٹکر  
نما امیدوں کے لئے اُمید داری چاہیے  
اس موقع میں کوئی صورت ہماری چاہیے  
عاشقوں کیوئے سٹے بے اختیاری چاہیے

(۱۲)

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے  
ہم سمجھے ہوئے زمانے کے  
کچھ تعلق رہا نہ دنیا سے  
کس خوشی کی خبر سنا کے مجھے  
لاکھ دینے کا ایک دنیا ہے  
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے  
بے طلب جو ملا بلا مجھ کو  
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی  
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب  
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا

دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے  
کام ایسا سکھا دیا تو نے  
شغل ایسا بتا دیا تو نے  
غم کا پستلا بنا دیا تو نے  
دل بے مدعا دیا تو نے  
کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے  
بے غرض جو دیا دیا تو نے  
اُس سے مجھ کو سوا دیا تو نے  
نقشہ اپنا جسا دیا تو نے  
تو جہنم کو کیا دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا  
جو دیا اسے خدا دیا تو نے

# شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم

## (مفت الہی)

آواز اذیٹھے کیا ہوش  
 کیا چمے کچھ غم میں ہو بے گاہ  
 لطف صحبت ہم غنیمت ہے  
 چل کے دیکھو ذرا چین کی سیر  
 گرچہ بہر عوام کا لالہ عام  
 پر کر دہل میں تم جو اپنے غور  
 نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط  
 سینکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں  
 گل و سنبھل سے تا خر و خاشاک  
 رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی  
 ہر درق ہے شجر پہ بہر حساب  
 گوشِ عبرت نہیں تو کھوتا ہے  
 ہر زباں برگ - گوشِ دل گل ہے  
 ایک دن دل جو میرا گھبرا یا  
 دل تھا پڑ مرده غنچہ دار مرا  
 فصل گل آئی ہجرت و خروش  
 گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار  
 میاں زاد دم غنیمت ہے  
 گل و گلزار دیا سمن کی سیر  
 لطف گلشن ہو گیا بدنام  
 ہے ہر اک امر کا عسلحہ طور  
 قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط  
 کہ بری خلق کے گمان میں ہیں  
 خاک سے تا بہ گلشن افلاک  
 نہیں عبرت سے کوئی شے خالی  
 بکھرتا دشتِ موعظت کی کتاب  
 در نہ ہر برگ یاں کا بولتا ہے  
 تو ہی دہوش نشہ مل ہے  
 کلبہ غم سے میں نکل آیا  
 ہوا گلزار میں گزرا ہر مرا

پھرتے پھرتے جودل میں کچھ آیا  
 بیٹھا میں برگسار آب رواں  
 کی جو بکیرا آنکھ اٹھا کے نظر  
 اُترا اوپر سے جوں پیام سر دشن  
 گرچہ گویا نہ تھی زبانِ متکل  
 کہ اگر تھک کو چشمِ بینا ہے  
 نہیں مجھ میں ہے یہ رگِ دریشہ  
 صانعِ غیب کا ہے کارِ بدیع  
 روئے ہستی پہ تھا نہ نامِ مرا  
 فیضِ آبِ اور باد کی نرمی  
 مادی خاک سے ہوئے دوچار  
 منہ کو گردِ عدم سے صاف کیا  
 سبز کو نیل تھا جب کلاسر  
 کھائی میں نے جو اس چمن کی ہوا  
 میرا چمنِ قدم یہ آیا اس  
 زرد برگِ شجر ہوا مجھ سے  
 بارِ مجھ میں نہ زینسار آتا  
 تاجِ سر میں پے نہال ہوا  
 سب کے سر پہ تھا نخل کا سایا  
 پاکے ایک جادوخت کا سایا  
 کہ ہو تر رواں حسابِ رواں  
 برگِ اک ٹوٹ کر ز شاخِ شجر  
 ادھر ہوا میری زینتِ آغوش  
 پردہ کہنا تھا۔ فی لسانِ لُحال  
 تو یہ قدرت کی لوحِ مینا ہے  
 دیکھ ان کو بہ چشمِ اندیشہ  
 کھک صنعت کا ہے نگارِ بدیع  
 تھا رگِ شاخ میں مقامِ مرا  
 اُس کی نرمی دھس کی گرمی  
 روحِ جنبش میں آگئی یکبار  
 سینہ شاخ کو شکاف کیسا  
 پردہ کو نیل تھی غیرتِ گلِ تر  
 دیا شاخ و شجر کو برگ و لوزا  
 ہو گیا ہر درختِ حقیر لباس  
 گل کا آباد گھر ہوا مجھ سے  
 پہلے برگ آتا چھپے بار آتا  
 مجھ سے سارا چمن نہال ہوا  
 میرا سایا تھا نخل پر چھپا یا

جس سے سایہ جہاں کو راحت تھی  
شاخ گل تھی ہری بھری مجھ سے  
تھے رفاقت سے میری سرور آزاد  
چشم نرگس چین کا جو بن تھی  
ساری ذات و صفات ہی مجھ میں  
کون سی بات مجھ سے چھوٹی ہے  
مرا ہم زخم جہاں و خاطر ریش  
ہر خزان کو بہار لازم ہے  
اُد لو العزمی کے لئے کوئی شے سدا راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میدان چلے چلو  
باغ مراد ہے ثمرات چلے چلو  
دریا ہو بیچ میں کہ سیاہاں چلے چلو  
ہمت یہ کہ رہی ہو کمرایاں چلے چلو  
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ چھو لا پھلا چین  
دامن میں ہیں ہرے ہوئے نسرین لسترین  
نہریں ادھر ادھر ہر امید و نکی موج زن  
اس دشت میں نہ دوڑ سکیں گے گرہن  
کلب درمی کی طرح خسرماں چلے چلو

اُد کہ کھیلے اپنے نشانِ ننگ نام نے  
باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شاد کام نے  
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھانے  
دیوارِ بلخ وہ نظر آتی ہے سامنے  
سر در سہی کے سرہنِ خسایاں چلے چلو

بار و چلو چلو نہ کرو انتظار تم  
کرتے ہو کیا امیدِ یمینِ لیار تم

میدانِ عزم و ہزم کے ہوشیار تم      بڑھ جاؤ گے گرد گے اگر مار مار تم  
 چلا رہی ہے ہمت مرداں چلے چلو  
 ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائینگے      دشمنِ فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے  
 طوفانِ بلبلیوں کی طرح بیٹھ جائیں گے      نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائینگے  
 بیٹھ نہ تم مگر کسی عنوان چلے چلو  
 آئینہ دل کا اگر سفر سے اُجال دو      پوچھے کوئی ارادہ کہ صبر ہی تو طال دو  
 شیطان جو شبہ ڈالے تو دل بیکال دو      بخون کا خیال تو زردل پٹال دو  
 اور آپ بن کے شیر نیاں چلے چلو  
 آگے بڑھو کہ اب نہیں تاب قرار ہے      کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے  
 جو کچھ کہہ کر تھا لیا تم نے مار ہے      ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے  
 فتح و ظفر نے لے لیا میدان چلے چلو  
 بکھو رفاہِ عام پہ اپنا دار تم      اور ہر کبھی صلہ کے نہ امید دار تم  
 عزتِ خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم      دور رخ کو آبِ فخر سے رنگ بہا رہا تم  
 گلشن میں ہو کے باد بہاراں چلے چلو  
 آدھریہ فیہ کا فیصل حساب ہے      چمکایا چہر صبح نے با آب و تاب ہے  
 ظلمت پہ نور ہونے لگا فحیاب ہے      اور شب کے پیچھے تیغ بکھ آفتاب ہے  
 تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو  
 نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے      اب خاتموں پہ آگئے ہیں نیکے فیصلے  
 قسمت کا یہ نوشتہ نہیں جو نہ مٹ سکے      وہ گونجا طبلِ فتح کہ میدان لے لئے  
 آکر نہ ناسے جنگ کی اگلاں چلے چلو

# شمس العلماء و خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم

رباعی

(۱)

لے عقل کی فہم کی رسائی سے دور اور جھل، تو نظر سے مستور  
یہ حسرت دید دل میں قائم رکھو بس یہ سائنی خدمت میں یہی ہر اک نور

(۲)

کاٹا ہی ہر اک جگر میں اٹھا تیرا حلقہ ہی ہر اک گوش میں لٹکا تیرا  
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہو ٹھٹکا تیرا

(۳)

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لئے طاعت میں ہو تیری آبر و سب کے لئے  
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور سب اپنے لئے ہیں اور تو سب کے لئے

(۴)

زہاد کو تو نے محوِ تجبیر کیا عشاق کو مستِ لذت دید کیا  
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی توحید کو تو نے اپنے آپ کے توحید کیا

(۵)

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر انجام کی رکھی نہ جو الیٰ میں بسر  
کیفیتِ شب اٹھا چکے اب حالی مجلسِ کرد و برخاست ہوا وقتِ سحر

(۶) پیری نہیں منزلِ فناء ہے گویا  
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کا فور  
اب کوچ کا وقت آ لگا ہے گویا  
اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

(۷) رکھے نہیں وودھِ وشنہ کی پردہ  
ان گالیوں کا جو جن کو چسکا حاکمی  
جو کہ غبارِ خلق سے سنستے ہیں بڑا  
آتا نہیں ان کو کچھ دعاؤں میں مزا

(۸) جیسا نظر آتا ہوں نہ الیا ہوں تیر  
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے  
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں  
بس تجھ کو ہی معلوم ہو جیسا ہوں میں

(۹) ہو عیب کی خواہ کہ ہنس کی عادت  
پھٹتے ہی چھٹے گا اُس گلی میں جانا  
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت  
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

### ”دولت اور وقت کا مناظرہ“

ایک دن وقت نے دولت سے کہا  
تو ہے سرمایہ عزت یا میں  
ہے زمانہ میں بڑی بات تری  
وقت سے سنکے یہ دولت نے کہا  
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا  
تو ہے انسان کی دولت یا میں  
دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری  
تجھ کو لے وقت نہیں عقل ذرا  
اُس کی تو خوبیوں میں شک جانے  
ہے عجب جس کو حشر الٰہی مانے

سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے  
 نامِ اقبال ہے آنے کا مرے  
 مجھ سے پاتے ہیں ہنر انشودن  
 لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال  
 خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر  
 چند روز آگئی ہیں جس کے کام  
 جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا  
 مرنے ذرا جس کو لگا لیتی ہوں  
 چاہتے ہیں مجھے سب خرد و کلاں  
 گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو  
 کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا  
 ہیں رکائی سے مری سب لڑاں  
 جس سے دنیا میں نہ ہیں راہ کروں  
 الغرض ہے وہ میری شانِ عظیم  
 جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ سے کو  
 تو بہتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا  
 وقت نے سن کے کہا اے دولت  
 ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر  
 تو جو اپنے پر ہے نازاں اتنی

لیتے ہیں تو شہِ عجب مجھ سے  
 لقبِ ادبا رہے جانے کا مرے  
 علم بھی ایک طفیلی ہے مرا  
 لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال  
 میں ہوں۔ تو نہیں کچھ تدبیر بشر  
 زندہ تاحشر رہا اس کا نام  
 وہ سدا خوار و دنگوں سا رہا  
 اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں  
 پھرتے ہیں دہن میں مری پروجاں  
 کسی آغزا کا انجام نہ ہو  
 درمیاں گر نہ قدم ہو میسر  
 میرے اغراض سے ڈرتا ہے جہاں  
 ہو اگر شیر تو رو باہ کروں  
 کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم  
 میری عظمت نہیں باور تجھ کو  
 جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا  
 شک نہیں اس میں ذرا اے دولت  
 اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر  
 اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی



کچھ فرض تھے مگر چشمہ  
 میں ہوں یا تو ہے اس امکان؟  
 تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں  
 ہے قرا بہ ترا اگر عطر آگیاں  
 ہے عبت تجھ کو تفوق کا خیال  
 جن کے قبضے میں ہوں میراے دولت  
 لاکھ بار انسان سے گر بھاگے تو  
 اُن کی سٹی میں ہو تو لے دولت  
 نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود  
 کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر  
 ایک بل میری اگر دیکھے گنوا  
 تو اگر اپنی لٹا دے ثروت  
 ہیں اسی واسطے جو اہل تمیز  
 میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس  
 جانتے ہیں حکماء و عرفاء  
 دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں  
 نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام  
 نہ انھیں دین کی دولت ہاتھ آئے  
 نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوة

تو ہوں اُس چشمہ کا میں سر چشمہ  
 پہلے دریا رہے کہ کچھ صلی ناداں  
 تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں  
 میں ہوں اُس عطر کی دالند زمیں  
 تو ہے گر مال تو میں اس المال  
 تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت  
 بڑھ کے جاسکتی نہیں آگے تو  
 طائر رشتہ بہا کی صورت  
 جس کا نایاب ہے عالم میں وجود  
 جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر  
 لیجے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اٹھا  
 پل وہ ملتی نہیں پھر لے دولت  
 میری ایک ایک پل اُن کو ہے عزیز  
 ہے مرا جاگتے سوتے انھیں پاس  
 مجھ کو سرمایہ دین و دنیا  
 اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دین  
 نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام  
 اور نہ دنیا کبھی اُن سے پیاسے  
 نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ

نہ دد آن سے کچھ اپنی کی جائے  
گن نہیں مجھ میں بہت لے دولت  
بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو  
اس میں ہے میرا سراسر نقصان  
نہ خبر آن سے کسی نی لی جائے  
ہو مگر تنگ بحال فرصت  
بخت کی اب نہیں طماننت مجھ کو  
کہ ہے انوارِ حیرت ایک اک آن

## غزلیات

(۱)

کال ہو جو ازل سے وہ ہو کمال تیرا  
ای عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ  
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹلے تر ہی ہیں  
پھنڈے سے پتے کیونکر جائے نکل کے کوئی  
آن کی نظر میں شوکت جیتی نہیں کسی کی  
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھے  
بیگانگی میں حاکمی - یہ رنگِ ہشتائی

باقی ہو جو ابد تک وہ ہو حبلِ دل تیرا  
ہر دل پہ چھا رہا ہو رعبِ جمال تیرا  
لیکن ٹلانا ہرگز دل سے خیال تیرا  
پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا  
آنکھوں میں بس رہا ہو جن کے جلال تیرا  
دل ہو سو چیز تیری جاں ہو سو مال تیرا  
سن سن کے سرِ دھنیں گے قالِ اہلِ حال تیرا

(۲)

ریج اور رنج بھی تنہائی کا  
عمر شاید نہ کرے آج دفا  
ایک دن براہ پہ جا پونچے ہم  
سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی کچھ

وقت پہونچا مری رسوائی کا  
کانٹا ہے شبِ تنہائی کا  
شوق تھا بادیہ پیمانی کا  
حوصلہ کیا ہے تماشا نی کا

دہلیاں بچے نظر ہے جب تک  
کچھ تو ہے تیرا تماشا کی  
یہی انجام تھا اے فصل خزاں!  
میرا ہے جذبہ توفیق کہ یاں  
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ  
ہم کو دعویٰ نہیں بسنا کی  
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا  
گل و بلبل کی شناسائی کا  
ہو چکا کام تو انائی کا  
گھر اچھی دور ہے رسوائی کا

(۳)

داں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا  
دل میں باقی ہو وہی حرص گناہ  
اُداس کو لیس ہیں جا کر مٹنا  
جاننا دنیا کو ہے اک کھیل تو  
عمر کی منزل تو ہوں توڑ کٹ گئی  
دل کو سب باتوں کی جو ناصح خبر  
ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن  
منہ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا  
پھر کئے سے اپنے ہم چھپائیں کیا  
اس کی بے پردائیوں پر جائیں کیا  
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا  
مرحلے اب دیکھئے پیش آئیں کیا  
تجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا  
انگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

(۴)

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز  
داستان گل کی خزاں میں نہ سالے بلبل  
صحبتیں اگلی مہدی ہمیں یاد آئیں گی  
موجزن دلیں ہیں یاں خون کے دریائے چشم  
مٹ گئی تیرے مٹانیکے نشاں بھی اترو  
دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز  
بنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ مڑلانا ہرگز  
کوئی دھچپ مرقع نہ دکھانا ہرگز  
دیکھنا اب سے آنکھیں نہ چراتا ہرگز  
لے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

ایسا بلا ہے نہ بد سے گزرنا ہرگز  
 نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز  
 ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہسنا ہرگز  
 اُن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز  
 نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز  
 نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز  
 اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز  
 یاں مناسب نہیں رد و کے رانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی اُنھیں بھول گئے  
 جس کو زخموں سے حوادث کے چھوٹے تھیں  
 ہم کو گرتے زلایا تو رلا یالے چرخ  
 یا خود روئیں گے کیا اُن پہ جہاں روتا ہی  
 بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دوزخ  
 یاں سو نصرت ہو سویرے کہیں لے عیش نشاط  
 رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر  
 بزم ماتم تو نہیں۔ بزم سخن ہے حال کی

(۵)

پہر اک خوبی میں داغ اک عیب پاتے ہیں ہم  
 گو کہ دل میں متصل خوف خدا پاتے ہیں ہم  
 پر گئے چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم  
 پر اسے آلودہ حرم ہوا پاتے ہیں ہم  
 جرم سے گو آپ کو نادام سدا پاتے ہیں ہم  
 پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم  
 اک جہاں سی آپ کو لیکن خفا پاتے ہیں ہم  
 درد خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم  
 داغ و رسوائی کے کچھ زیر و ادا پاتے ہیں ہم  
 دیکھئے کیا طھونڈتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم  
 خوف کا کوئی نشان ظاہر نہیں فعال میں  
 کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں غائب نہیں  
 دلیں درد عشق نے مدت کر رکھا ہو گھر  
 ہو کے نادام جرم سے بھر جرم کرتے ہیں وہی  
 ہیں نہ اُن دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا  
 گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا  
 ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر کے ہیں صبر  
 ہو ردائے نیک نامی دوش پر اپنے مگر  
 راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہر قدم

نیز کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اسے قحالی مگر رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم

(۶)

بڑھاد نہ آپس میں ملت زیادہ  
 محکم علاستے بیگہ بنگی کی  
 کرود دستو پہلے آپ اپنی عزت  
 کرود علم سے اکتساب شرافت  
 فراغت سے مونیانیں م بھرنہ بیٹھو  
 جہاں رام ہوتا ہو میٹھی زباں سو  
 مصیبت کا ایک ایک سوا حال کتنا  
 کہیں دوست تم کو نہو جائیں بدن  
 جو چاہو فقیری میں عزت سو نہنا  
 وہ افلاس پنا چھپاتے ہیں گویا  
 ہو الفت بھی دشت بھی نیا سوا لازم  
 فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا  
 غزل میں وہ رنگت کہیں تیری حالی  
 بڑی اور بھلی سب گذر جائیگی (۷)  
 ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پست  
 رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا  
 نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں  
 نہیں گے نہ قحالی کی کب تک صدا  
 مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ  
 نہ ڈالو تحلف کی عادت زیادہ  
 جو چاہو کہیں لوگ عزت زیادہ  
 نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ  
 اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ  
 نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ  
 مصیبت ہے یہ مصیبت زیادہ  
 جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ  
 نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ  
 جو دولت سے کرتے نفرت زیادہ  
 یہ الفت زیادہ نہ دشت زیادہ  
 مگر اسمیں پڑی ہو محنت زیادہ  
 الاپیں نہ بس آب نہ ہرپت زیادہ  
 یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی  
 ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائیگی  
 کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی  
 بوخسین عمر ساری گزر جائے گی  
 یہی ایک دن کام کر جائے گی

# شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم

## غزل

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا  
کی ذرا دست جنوں نے کو تھی  
قتل ہو کر بھی سبکدہشتی کہاں  
دوسروں پر کیا کھلے راز دہن  
جذبہ دل کا ذرا دیکھو اثر  
جامہ ہستی بھی اب تن پر نہیں  
نصف مٹنے بھی نہیں دیتا مجھے  
اے جنوں! تجھ سے سمجھ لو گا۔ اگر  
لوگ پہنچے منزل مقصود تک  
ہم تو پہنچے بزم جانان تک مگر  
جاؤں دل سینہ میں نہاں رہ گیا  
چاک آکر تا بہ اماں رہ گیا  
تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا  
جبکہ خود صانع سے نہاں رہ گیا  
تیز نکلا بھی تو پریکاں رہ گیا  
دیکھ وحشی تیرا عریاں رہ گیا  
میں اجل سے بھی تو چہنماں رہ گیا  
ایک بھی تار گریباں رہ گیا  
میں جس کی طرح نالاں رہ گیا  
شکوہ بیدار دریاں رہ گیا

یاد رکھنا۔ دوستو اس بزم میں  
اس کے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا

# غزلیت

(۱)

دشمنانی نے تیری قندیل کو درن کر دیا  
خود نہ تھے جو راہ پر اور نہ گئے ہادی تھے  
محبوبی صانع کا نشان رکھا ہے یہ  
سے اک دل کو خوش کرنے پر قادر نہیں  
بکے سب ہر تھکے، دہم و خرد ہوش و تیز  
ہو غلب کامل تو بس نعمت اسی کا نام جو  
دین سے اتنی الگ۔ حد فنا ہے یوں قریب  
سے عرض ہو کر منے سے زندگی کئے لگی  
نس نے یہ سب کچھ کیا اکبر میں تم سو کیا کیوں

دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا  
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو میسا کر دیا  
ورنہ کیا تھا جس نے نہیں درہ بدر کر دیا  
ایک سن سحر و جہاں کو جس نے پیدا کر دیا  
خاندان میں تم آؤ ہم نے پروا کر دیا  
بھوکے نے نازین جویں کی تن و سلوی کر دیا  
اس تہ رہ چپ پھر کیوں رنگ دیا کر دیا  
ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا  
اس نے محلو کیا کیا دل کو مے کیسا کر دیا

(۲)

دشمنانہ ہوں جو ہر مہم کو سحر حل سمجھا  
موت آپ نے ایسا مجھے غافل سمجھا  
یہ وہ کلمہ ہے جسے میں بھی بے مشکل سمجھا  
تیرے دیوانے کو عاقل نے بھی کامل سمجھا

دشمنانہ ہوں جو ہر مہم کو سحر حل سمجھا  
موت آپ نے ایسا مجھے غافل سمجھا  
یہ وہ کلمہ ہے جسے میں بھی بے مشکل سمجھا  
تیرے دیوانے کو عاقل نے بھی کامل سمجھا

نہ کیا یار نے اکبر کے جنوں کو تسلیم  
مل گئی آنکھ تو کچھ سوچ کے عاقل سمجھا

(۳)

نورِ عرفانِ عقل کے پردے میں نہاں ہو گیا  
 اُن کی صورت دیکھ کر آنے لگی یا خُصدا  
 ترکِ دنیا سے ہوئی جمعیتِ خاطرِ نصیب  
 باعثِ تسکین نہ تھا باغِ جہاں کا کوئی رنگ  
 صورتِ ظاہر میں دل ایک نظر ہر خونِ حق  
 کہہ دیا اہلِ بھیرت فیضِ ساقی نے مجھے  
 کی ترقی چشمِ بد و ور ایسی اپنے رنگ میں

ہوش میں آنا حجابِ دُئے جاناں ہو گیا  
 نورِ رخِ اُن کا چراغِ راہِ عرفاں ہو گیا  
 حالِ میرا گو نہ ظاہر میں پریشاں ہو گیا  
 جس دُش پر میں چلا آخر پریشاں ہو گیا  
 آگیا جب جوش میں معنی کا طوفاں ہو گیا  
 ساغرِ مے آفتابِ ادجِ عرفاں ہو گیا  
 اکبر ابسند نشینِ زم زمِ رنداں ہو گیا

(۴)

بہار آئی ہو اک آئینہ معنی نشاں ہو کر  
 بنو گئے خسروِ فکیم دل شیریں زباں ہو کر  
 زمیں کی طرح جس نے عاجزی و عاکری کی  
 مجالِ گفتگو کس کو فنا کا جب پیام آیا  
 جو راہِ معرفت میں کاروانِ دل قدم رکھے  
 ننگین بے بہا تھا دلِ ضرورتِ تھی حفاظت کی  
 اسی سے آشکارا ہو بلند تیروایوں کی  
 کیا اچھا جھنوں نے دارِ بر منصور کو کھینچا

چمن میں بوئے گل پھیلی ہو تیری اتناں ہو کر  
 جہانگیر کی کر لگی یہ ادا تو رہاں ہو کر  
 خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانکا آسماں ہو کر  
 ہوئی خاموشی آخر شمع بھی آتش زباں ہو کر  
 تو ساری کائنات اُرجائے گردِ کارِ اُن ہو کر  
 ترا نقشِ قصور اس میں بیٹھا پاسباں ہو کر  
 چڑھو آسماں بھی ترے در پر اتناں ہو کر  
 کہ خود منصوب کو مشکل تھا جینا رازِ اداں ہو کر

ضعیفی زور پر آئی ہوئے بے دست و پا اکبر  
 کیا بچوں سے بدتر ہم کو پیری نے جواں ہو کر



(۵)

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں      یہ نہ سمجھیں کہ آہ کہتا ہوں  
 بھر ہستی میں ہوں مثالِ حباب      مٹ ہی جاتا ہوں جب ابھرتا ہوں  
 اتنی آزادی بھی غنیمت ہے      سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں  
 یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر      دلیں جو آئے کہ گزرتا ہوں

(۶)

عیادت کو آئے شفا ہو گئی      علالت ہمارے دوا ہو گئی  
 مری روح تن سے جدا ہو گئی      کسی نے نہ جانا کہ کیا ہو گئی  
 طبیعت کی گرمی بھی کیا چیز ہے      طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی  
 انھیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں      ہوا خوب انھیں پر فدا ہو گئی  
 کتابِ حقیقت کرے کون ختم      کہ ہر اک خبر مبتدا ہو گئی  
 پھنسی جسمِ خاکی میں روحِ لطیف      اسیرِ کُند ہو ا ہو گئی  
 دوا کیا کہ وقتِ دعا بھی نہیں      تری حالت اکبر یہ کیا ہو گئی

(۷)

سیرِ غربت کوئی جلسہ جو دکھا دیتی ہو      یادِ احبابِ طنِ مجھ کو ملا دیتی ہو  
 بیخودی پر وہ کثرتِ جو اٹھا دیتی ہو      ہر طرف جلوہ کو جمید دکھا دیتی ہو  
 پوچھتا ہوں میں جو عبرتِ سوا کی مستی      راستہ کو رُغریاں کا بتا دیتی ہو  
 نظر آتا جو نہیں نزع میں بالیں پر کوئی      بیکسی ان کے تغافل کو دے دیتی ہو  
 موت کوئی نہ گھبراے اگر یہ سمجھے      کہ یہ گونیا کے بکھڑوں سے چھڑا دیتی ہو

برسلیو کی تری لاتی ہو خرابی مجھ پر  
میری تقدیر کو الزام لگا رہتی ہو  
فکر اکبر عمل مضمون کا دشا کر جلوہ  
مخمل شعریں رنگ اپنا جا رہتی ہو

(۸)

فلک جو روزِ نیا داغ اک کھلاتا ہو  
وہ بات ہوں کہ جولانی ہو جوش میں کہ  
وہ دہی باغ میں سمجھے کہ آہ زدنکلی  
خدا پناہ میں رکھے کشاکش غم سے  
فنا کا خوف کچھ اہل حیات ہی کو نہیں  
مقام شکر ہو غافل مصیبت و دنیا  
خدا کے واسطے یادِ خدا کرے اکبر (۹)  
عقل ہو ایمان ہو دل ہو جان ہو  
خوبی نہ مہب دمِ آخر کھلی  
ہل کے یاروں سے ہوا شوق گناہ  
کیا مجھے کرتے ہو زندوں میں شمار  
دل جسے سمجھا ہے سالانہ وقار

(۱۰)

لباک میں محکو ذلیل دغوار رہنے دیجئے  
چشم بد دور آپ کی نظریں میں خود میں شراب  
تجھے اپنی نگاہِ فتنہ انرا کا علاج  
آپ اپنی عزت دربار رہنے دیجئے  
بس مجھے بے پے سرشار رہنے دیجئے  
نرگس بیمار کو بمبار رہنے دیجئے

کس طاقت سے کماؤ سحر کہ کھینے میں شوق  
 یہ دعا کو قابلِ اظہار رہنے دیجئے  
 کیجئے ثبات خوش اخلاقی سوسپنی خوبیاں  
 یہ نیکو جذبہ دوستی رہنے دیجئے  
 کھل گیا مجھ پر بہت جی تو پیر سے خیر خواہ  
 خیر چندہ کیجئے طو مار رہنے دیجئے  
 بل کے باہم کیجئے اغیار سے بحثِ بدال  
 بے نتیجہ باہمی تکرار رہنے دیجئے  
 ہمنہ راوس بحرِ خوبی سے نہ ہونگے اکبرِ آپ  
 ایسے منصوبے سمندر پار رہنے دیجئے

(۱۱)

گل کو خداں بلبوں کو نو صہ گر دیکھنا کئے  
 بارغِ عالم کی دورنگی عمر بھر دیکھا کئے  
 دیکھے اب کیا دکھائے قسمتِ بد بیدار گ  
 بچ و اندوہ و غم درج دیکھا کئے  
 خوابِ غفلت سے نہ چونکے بل عالم پر غضب  
 گو بہت نیرنگی شام و سحر دیکھا کئے  
 حسرت و حرمان و اندوہ و غم درج و عالم  
 جو دکھایا آسماں نے عمر بھر دیکھا کئے



# پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی

جلوہ صبح

جب رنگ شب آئینہ ہستی سے ہوا دور  
ہنگام سحر کون و مکان ہو گئے پر نور  
بتدیل ہوئی صورت کوہِ شب و بجور  
چمکا وہ بجلی سحر سے صفتِ طور

بجلی کی طرح چرخ پہ نور سحر آیا

آنکھوں کو نہ پھر خرمین آنجس نظر آیا

تھی نور میں تفریح تو نور ارضِ ہمایں  
سرگرمی بشر میں تھی بشر یا د خدا میں  
تھی تازگی خنکی میں تو خنکی تھی ہوا میں  
شادابی تھی نگہت میں تو نگہت تھی ضیاء میں

خورشید منور کا دم جلوئی گری تھا

نورِ صبحِ مہتاب چراغِ سحر ہی تھا

دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم  
چکر میں تھا گردابِ صفتِ نیرِ اعظم  
اُٹھتی تھیں شعاعوں کی چو موجیں ہر لہر  
سیارے حبابوں کی طرح ٹٹے تھے بہیم

تھی شورِ طوفانِ سحرِ غربت تا شرق

آخر کو سفینہ مہ گمہ دوں کا ہوا غرق

یہ اشمس تھا کندہ شاہِ خاوری کی نگیں پہ  
والیل کا باقی تھا نشان بھی نہ کہیں پہ  
تھی مہر کی پھیلی جو ضیا چرخِ بریں پہ  
ہلے لگا رہ رہ کے وہ ہی نور زیں پہ

ذروں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا

پیمانہ خورشید چمکتا نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم      مرغان ہو انغمہ زنی کرتے تھے باہم  
 ہنگام سحر باد سحر چلتی تھی پیہم      آرام میں سبزہ تھا تہ چادرِ شبنم  
 ہر سمت بندھی نعرہ بلبلی کی ہو اٹھی  
 غنچوں کی نسیم سحری عقدہ کشا تھی  
 جو نخل تھا گلشن میں بر بند کھڑا تھا      دایان سحر میں گلِ خورشید پڑا تھا  
 کیا خوب مقدس چنستان کا لڑا تھا      ہر گل پہ گھر قطرہ شبنم کا ہبڑا تھا  
 بلبلی کہیں طائوس کہیں گھوم رہے تھے  
 مسدوں کی طرح نخل چمن جھوم رہے تھے  
 مرغان چمن عالم مستی میں سحر دم      وصف چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم  
 شاخیں بھٹکیں کہیں گردن تسلیم صفت نم      تسبیح خدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم  
 غنچوں کو بھی تھی دردِ زباں حمد خدا کی  
 آتی تھی چٹکنے میں صد اصل علی کی  
 تھا پیش نظر دایا امین کا تماشا      ہر شاخ و شجر میں شجرِ طور کا نقشہ  
 تھا آتشِ گل میں اتر برقِ تجلی      مدہوش تھے مرغان ہو احوالِ موسیٰ  
 شکلِ بد بھینا تھی ہر اک شاخِ نظر میں  
 اعجاز کا کل تھا کفِ گلچین سحر میں  
 رونقِ یہ دم صبح تھا خمنانہ عالم      تھم تھم کے ہو اچلتی تھی سرسری بھی تھی کم  
 پیمانہ مہتاب تھا لبریز سحر دم      تھا جامِ صبرِ حسی کا لئے نیتِ اعظم  
 گروں پر شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی      بینائے فلک میں تھکنا نہ بھری تھی

## بہارستان کشمیری کی یاد

ہاں نورِ ازل جلوہ گھارا دکھا دے      ہاں شمعِ زباں مطلعِ انوار دکھا دے  
ہاں طبعِ رداں قلزمِ ذخار دکھا دے      ہاں رنگِ سخن گلشنِ بے خار دکھا دے

گلزارِ معانی کا مہکتا نظر آئے

طوطی چمنستان میں چمکتا نظر آئے

ہو محسنِ بیاں میں چمنستان کا تجھل      ہر نکتہ نگینِ نظر آئے صدفِ گل  
ہر معنی پیچیدہ بنے طرہٴ سبیل      عاشقِ ہوں سخنِ پر جوئیں صورتِ لبس

جو شعر ہو طوطی کا وہ ثانی نظر آئے

کوثر کی طبیعت میں روائی نظر آئے

ہاں طبعِ رسا خاطرِ احباب ہے منظور      بس شرمِ کابرِ قریحِ معنی سے ہوا بے دور  
دکھلائے سربِ نرمِ تجلی اسرطور      غشِ صورتِ موسیٰ ہوں جوئیں پائینِ نیکو

اسنکر جو ہیں فرعوں صفتِ اعجازِ سخن کے

ہوں کج وہ قائل مے اندازِ سخن کے

ہاں طعنہ و تشنیع کی پردا نہیں مجھ کو      تحسینِ ستائش کی تمنا نہیں مجھ کو  
نیرنگیِ افلاک کا شکوہ نہیں مجھ کو      کچھ فکر ہو شہرت کی یہ سودا نہیں مجھ کو

ڈو باہوا ہوں مثلِ سخنِ رنگِ سخن میں

گل ہو کے میں رہتا ہوں لطافتِ چمن میں

بس وقت کا اب ہوش بھی پورا نہیں نہا      سرست مجھے رکھتی تو جب سےئے اشعار

لیکن نہ رہا مجھ کو نقلی سے سر و کار  
ہو میری نحوشی پہ فدا عالم گفتار

اس نے کچھ ایسا مجھے نہ ہوش کیا ہے

خود اپنے تئیں میں نے فراموش کیا ہے

عالم سے جدا ہے مری تقریر کا عالم  
بدبینوں پر حیرت سے ہے تصویر کا عالم

زنجبیل سخی سے ہے یہ تحریر کا عالم  
برصغیر پہ ہو گلشن کشمیر کا عالم

کیفیت گمنانِ آسمانی ہے نظر میں

اس خطہ کو بخش کا ہو سودا کے سر میں

پانی میں ہو چشموں کے اثر آبِ بقا کا  
ہر نخل پہ عالم خضر سبزِ قبا کا

جو پھول ہو گلشن میں وہ ہو نورِ خدا کا  
سائے میں شجر کے ہے اثرِ ظلِ ہما کا

مہرِ اکریم عام کی ہر جگہ رواں ہے

سرِ چشمہ فیضِ جن آراے کہاں ہے

وہ موج ہو اکا حرکت ابر کو دینا  
چشموں سے پہاڑوں کے ڈھاتا ہوا بھینا

گاتے ہوئے ملاحوں کا وہ گشتیاں بھینا  
ڈل کا وہ سرِ شامِ ادھر کر ڈٹیں لینا

وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آتا

پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آتا

ہر لالہ کُسا ہے شکلِ گلِ راحت  
دلِ آس کے ہیں خالِ رخِ حور کے مرست

کیا سبزہ خوش رنگ ہو سرمایہ عشرت  
دل کے لئے ٹھنڈک ہو جگر کے لئے فرحت

ایسا نہیں قدرت نے کیا فرشِ کمیں پر

اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں ہے زمیں پر

وہ صبح کو کسار کے چھوٹوں کا مہکنا      وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا جھکنا  
گر دوں پہ شفق کو وہ پہ لائے کا لہکنا      مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا جھکنا

ہر پھول کی جنبش سے عیاں نازِ پری کا  
چلنا وہ دے پاؤں نسیمِ سحرِ فی کا

وہ طائر کسار لبِ چشمہ کسار      وہ سرد ہوا دہ کرم ابرِ گہر بار  
وہ میوہ خوش رنگ و سرسبز چمن ناز      اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار

یہ باغِ دُکن روکش گلزارِ جنات ہے

سرمایہ نازِ چمن آرائے جہاں ہے

ہر شاخ و شجر پر سحرِ طور کا عالم      ہر شاخ و شجر پر سحرِ طور کا عالم  
پروین پہ جو خوشہ انگور کا عالم      پروین پہ جو خوشہ انگور کا عالم  
نکلے نہ صدا ایسی مُغنی کے گلو سے

آتی ہے جو آوازِ ترنم لبِ جو سے

میوے سے گرا نبار وہ اشجار کے ڈالے      بکھرے ہوئے وہ دامن کسار پہ لالے  
اُڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے چھالے      دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے نگالے

وہ ابر کے لکڑے کا تماشا شجرِ دہلی ہے

بھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے درخیں

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گذرا ہو زمانا      تازہ ہو مگر اس کی محبت کا فانا

عالم نے شرفِ جن کی بزرگی کا ہونا      اُٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا

نہ جن کا ہی پیوند اب اس پاک میں کا      رگِ لک میں ہماری ہر داغ و خدائیں کا



ہاں میں بھی ہوں بلبل اسی شاداب چمن کا  
 اس طرح نہ سر سبز ہو گلزار سخن کا  
 ہر چشمہ فردوس یہ عالم ہو دہن کا  
 ہر رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا  
 تازے ہیں مضامین بھی طبیعت بھی ہری ہے  
 ہاں گلشن قومی کی ہوا سہریں بھری ہے

## سیر دیرہ دون

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شاگون  
 بھگاہ شوق نے کیا کیسے کیا سماں دیکھا  
 سنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فزا ہوی  
 ازل میں تھی جو فضا اُس کا یادگار ہو یہ  
 کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے  
 سیر دابر کے ہے انتظام پانی کا  
 تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی  
 لباس پہنے ہیں کل خشتِ سنگ سبزہ کا  
 اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں  
 گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمین شاداب  
 کی کبھی نہیں شادابیوں کے سماں میں  
 طلسم حسن کا ہر بیج میں یہ گلدستہ  
 یہاں جو آ کے مسافر مقام کرتے ہیں  
 عجیب خطہ دلکش ہر شہر دیرہ دون  
 نئی زمین نیا رنگ آ سماں دیکھا  
 اگر پہاڑ میں جنت تو راستہ ہے یہی  
 نشیب کوہ میں گوارہ بہار ہے یہ  
 یہ سبزہ زار سجایا ہر دستِ قدرت نے  
 ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا  
 جدھر نگاہ اُٹھی اس طرف ہو ہریالی  
 بجائے خاک کے اُڑتا ہو رنگ سبزہ کا  
 پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دہن میں  
 لطیف و سرد ہوا پاک صاف چشمہ آب  
 ٹھہر گئی ہو بہار آگے اس گلستاں میں  
 کھڑے ہیں کوہ و شجر ہلکے و نیچے صفت  
 یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دُور جائیے بستی سے اور یہی ہو سانس  
 بشر پر رُعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا  
 بلند یوں سے جو ہو مائل نشیب نظر  
 نگہ کو دُور سے پانی جو ہے نظر آتا  
 قریب ہوتا ہے آخر یہ دور کا عالم  
 فضا کے کوہ میں ایسی ہو اسمانی ہو  
 بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے  
 اثر دکھاتا ہے قدرت کا لغمہ دنگہ  
 یہ راگ وہ ہو جو مضراب کا اسیر نہیں  
 وہی سنے گا اُسے دل گداز ہو جس کا  
 یہ راگ بُھ میں سمایا سرور سے ہو کر  
 حرم خاص میں قدرت کی باریابی تھی  
 نشست سنگ نہ تھی سایہ شجر کے تلے  
 شربِ کمال تھی وضع قدیم قدرت کی  
 شربِ انس حقیقی سو تھا ہر اک سرشار  
 درخت و کوہ میں کیا ذاتِ پاکِ نساں کیا  
 بیوج ہستی بیدار کے عناصر ہیں  
 یہ دل کے تکرر سے ہیں قدرت کے نہیں نہیں  
 انھیں سے لغمہ قدرت ہر اوج بستی میں

یہ سوچتا ہی پہاڑوں کو دیکھ کر انسان  
 یہ بل زمین کی تیوری میں آگیا کیسا  
 فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر  
 سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل نکلتا  
 نگاہ دیکھتی ہے پھر سرد در کا عالم  
 بشر کی روح کو راحت کی منید آتی ہو  
 نہ شور و شر ہو نہ دنیا کی آہ و زاری ہو  
 شجرِ جبر سے پٹہ پٹی ہے راگ کی تاثیر  
 یہ صرف کان کے پردوں میں گونہ گونہ نہیں  
 ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہو جس کا  
 ہو جس تھی رُوح کو لمبا کسے اس میں سے ہو کر  
 نگاہ شوق میں اک شان بے حجابی تھی  
 رداں تھا چشمہ آبِ خنک نظر کے تلے  
 عیاں تھی سنگِ شجر سے کششِ محبت کی  
 شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا بہشت غبار  
 طیور کیا ہیں ہو کیا ہے ابر باراں کیا  
 سب ایک قافلہ شوق کے مسافر ہیں  
 سب ایک گود کے پاسے ہیں کوئی غیر نہیں  
 سب ایک ساز کے پر سے ہیں نرم ہستی میں

جب کسی سے بھی ہستی کا اسکے راز نہیں  
 جو روح ہم میں ہو اسیں وہی روانی ہو  
 کچھ آفتاب میں دھم میں قیسا ز نہیں  
 کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اس پر نثار  
 اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار  
 کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے  
 دل اپنے رنگ میں بے تاب تھا اس راز سے  
 اہل جو آئے تو اس کو ہمارے نیچے  
 غرض کہ روح کی آنکھوں سے یہاں دیکھا  
 نیا سرور مستی ہوا سفر کر کے  
 مگر نہ سیر حرم کر سکے نظر بھر کے

## مذہب

سوداے محبت میں اُنھیں کے نہیں خامی  
 خود بینی سے خالی نہیں مذہب بھی خامی  
 عرفاں کی خبر لاتی ہو گو طبع گرامی  
 ہونفس کی منظور حقیقت میں غلامی  
 کچھ قوم کی بردا ہو نہ فکر کہ وہ ہے  
 ہو جائے نجات اپنی تمنا ہو تو یہ ہے  
 عالم کے دکھانے کے لئے خاک نہیں ہیں  
 دعویٰ ہو کہ ہم مالک فردوس بریں ہیں  
 دنیا کی ترقی پہ سدا چیں یہ حبیب ہیں  
 گویا کہ یہی راز الہی کے امیں ہیں  
 جو ادھر ہیں وہ معرفت حق سے جدا ہیں  
 بس ایک ہی بندہ مقبول خدا ہیں  
 ہمدردی قومی سے اُنھیں آئے نہ کیوں عالم  
 انساں کی محبت کو سمجھتے ہیں یہ آزار  
 رہتے ہیں سدا فکر میں عقبے کی گرفتار  
 دنیا کے فرایض سے نہیں ان کو سروکار

یوں جادہ تسلیم و رضا میں نہیں سکتا  
اُن میں وہ خودی ہو کہ خدا میں نہیں سکتا

## قوم لہ کے سوراؤں کی الوداع

ساحل ہند سے جزائر وطن جاتے ہیں      کچھ نئی شان سے جانبا ز کُن جاتے ہیں  
رن میں باندھ ہو دشمنیہ کفن جاتے ہیں      تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

ساتنے ان کے ظفر بہہ پتا چلتی ہے

ان کی تلوار کے سایہ میں تضا چلتی ہے

انکی رگ رگ میں ہیں پیوستہ شجاع کے چلن      رن کا میدان ہو ان کیلئے ماں کا دامن  
عرصہ جنگ کی موت اُن کو ہوا ک شب کی ہون      مر کے تلوار سے جاہل ہو تو خلعت ہو کفن

جوش ان میں جو ہو اس جوش کا اب دور نہیں

ساتھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہاں دلیران وطن دھاک بٹھا کر آنا      طنطنہ جرمن خود میں کا مٹا کر آنا

قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا      ندیاں خون کی بھریں میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہو سپاہی کے نہانے کے لئے

ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

۱۰ یہ یقین اس زمانے میں تصنیف کی گئی تھی جبکہ ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ

کی جانب سے یورپ کی جنگ عظیم میں حصہ لینے کے لئے روانہ کی گئی تھی ۱۲

۱۱ جرمن کا دار السلطنت ۱۲

جاں نثار آج تھا بسا زناہ میں نہیں ہاں دکھا دو کہ ہوتا جنت میں نہیں  
 دوست کیا چیز ہیں دشمن ہونے کو تحسین ہر سان جد کرے ہاں گئے رن کی نہیں  
 یوں تو رٹنے کو بہت شہ کے ہمک خواہ رہے  
 اور جی شان سے لیکن یہ وفا دار رہے  
 جس گھر دی معرکہ جنگ میں ہوتا تیغِ علم سور مارے تھے ہیں اس طرح بچا رہے ہاں  
 دل ہوا رجن کہ جگر بھیم کہ اگدہ کا دم موت کے وقت نظر میں ہر شب یہ بھیشم  
 جس کا قافلو نہ ہٹا موت کی تہ بیروں پر  
 سایہ تیغ میں آرام کیا تیروں پر  
 ہو وہ یورش کہ ہوشیہ زندہ اعدا ہر دم اک اُمنڈتے ہوئے دریا کا ہو پیدا عالم  
 جو کسی سے نہ جھکا وہ سر مغرور ہو خشم پہلے برتن میں جو ہو بونچے وہ تھا را ہو قدم  
 دوا کر پڑکھ کے بڑھو خون کے مخفر کھل جائیں  
 پھر ہر جی سنگہ کی تلوار کے جو ہر کھل جائیں  
 تم کو اعزاز ملا ہے یہ وطن کا اعزاز دیکھنا اب ہے سچا عمت کا کھاری انداز

۱۵ ارجن پانہوں میں ایک مشہور بہادر تیر انداز تھے ۱۶ بھیم ارجن کے بھائی اور بہادری میں  
 مشہور ہیں ۱۷ اگدہ رام چندر جی کے اہلچی بکر راون کے دربار میں گئے تھے وہاں قوت کی  
 آزمائش پر ان کا پاؤں کوئی ہٹانہ سکا ۱۸ بھیشم پتا مر جنگ مہا بھارت میں کورون کے سپہ سالار  
 تھے دوران جنگ میں ان کو تیر لگا تھا۔ یہ اپنی ثابت قدمی اور اطمینان کے لئے مشہور ہیں۔  
 ۱۹ سکھوں کا غزوہ ۱۷ مہاراجہ رنجیت سنگہ کا سپہ سالار ۱۲

خاک یورپ پہ دیر سی ہو اپنی ممتاز تیغ ہندی کی اصالت پہ زمانہ کو ہونا نہ  
 قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو  
 روح پر تاب لے کی جنت میں نہ شرم ہو  
 یا ظفر یا بٹھیں دیکھ کے دل ہوں ناش اسے یا سوئے وطن خون میں ڈبی ہوئی لاش  
 سرحد اتن سے ہو یا ہو تن بسمل صد پاش گوشتہ امن اماں کی نہ ہو ہم سمجھوں کو تلاش  
 موت معراج ہے اس دشت کے راہی کیلئے  
 آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کے لئے  
 گو کہ دنیا سے مٹے شوکتِ قیصر کا سراغ شعلہ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ  
 گل نہ ہو دل کے شوالے میں حسرت کا چراغ بیگناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں دغ  
 راستہ بولی قوموں کی تباہی کے لئے  
 خون معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کے لئے  
 مادِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام خطہ ہند کا اس جنگ میں روشن ہو نام  
 تیغ خونریز نے جس شان سے چھوڑا ہوا پیام اپنے مسکن میں اسی شان سے پائے آرام  
 شاعر گوشہ نشین شکر خدا کرتا ہے  
 جنگ ہر دم کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

# خاکِ ہند

لے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گمان ہو      دریائے نیل قدرت تھے لے رواں ہو  
تیری جہیں سے نورِ حسن ازل عیاں ہو      اللہ کے زیب ذریت کیا اوجِ عرشاں ہو  
ہر صبح ہو یہ خدمتِ نورِ شید پر ضیا کی      کر نوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ لاشیں سے چستے ہوئے وہ جاری      چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری  
سارے جہاں پہ جب تھا دشت کا اُجڑا رہا      چشمِ نہ چراغِ عالم تھی سہریں ہماری  
شمعِ ادب نہ تھی جب یونان کی انجمن میں      تاباں تھا مہرِ دانش اس ادبی کمن میں

گو تم نے آبرودہی اس معبدِ کمن کو      سرمد نے اس زمیں پر صدمے کیا وطن کو  
اگر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو      سینچا لہو سے اپنے راتھانے اس چمن کو  
سب سو رہا اپنے اس خاکِ میں نہاں ہیں      ٹوٹے ہوئے کھنڈ رہیں بیاں کی اٹھیاں ہیں

دیوارِ دوسے اہنگ ان کا اثر عیاں ہو      اپنی رگوں میں اہنگ ان کا لہو رواں ہو  
اہنگ اثر میں ڈوبی نائقوس کی فغاں ہو      فردوسِ گوشِ اہنگ کیفیتِ ازاں ہو  
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگِ اہنگ      شوکت سے بہہ رہا ہے دریاؤں گنگِ اہنگ

اگلی سی تازگی کی چھوٹیوں میں اور پھلوں میں کرتے ہیں رقص اب تک طائر اس جنگلوں میں  
 اب تک ہی کرا رہی ہے بجلی کی بادلوں میں پستی سی آگئی ہے پردل کے حوصلوں میں  
 گل شمع انجمن کی گونج انجمن دہی ہے  
 حُب وطن نہیں ہے خاک وطن دہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا دُنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشان ہمارا  
 کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا ایک لاش بے کفن ہی ہندوستان ہمارا  
 علم و کمال دایاں بر باد ہو رہے ہیں  
 عیش و طرب کے بندے غفلت میں رہ رہے ہیں

سے صورتِ توہمی اس خوابِ جگاٹے بھولا ہوا فسانہ کالوں کو پھر سناٹے  
 مردہ طبیعتوں کی انسر دگی مٹا دے اٹھتے ہوئے شراب اس اکھ سو دکھائے  
 حُب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر

سرمیں خار ہو کر دل میں سرور ہو کر  
 شیدائے یستناں کو سرور چمن مبارک زنجبیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک  
 بے گل کو گلِ مبارک گل کو چمن مبارک ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک  
 غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے  
 اس خاک سے اٹھتے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہاں جوئے شیر ہم کو نورِ تحسینِ وطن کا آنکھوں کی روشنی ہو جلوہ اس انجمن کا  
 ہو رشکِ ہر ذرہ اس منزلِ امن کا تکتا ہو برگ گل سے کاٹتا بھی اس چمن کا  
 گرد و غبارِ بیاں کا خلعت ہو اپنے تن کو مرکز بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو



## قومی ترانہ

فدا کا ہوش اتنا زندگی کا دردِ سر جان  
 عزیزانِ وطن کو غنچہ کو برگِ دشر جان  
 کرشمہ یہ بھی ہے اسے بچرِ اندس قومی کا  
 اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا  
 چمنِ زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی  
 سدھار سے منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی ہو  
 حل کیا ہے خمِ بارِ دہ ہستی ام تر جان  
 خدا کو باغبانِ دقوّم کو ہم نے شجرِ جان  
 تلاشِ رزق میں اہلِ ہنر کا دربدِ جانا  
 تو پھر بیکر ہو تنگ آگے اس نیا سے مرجان  
 کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا شجرِ جان  
 تنِ خاکی کو شاید روح سے گر دشرِ جان

## غزل

اگر دردِ محبت سے نہ انسانِ آشنا ہوتا  
 رُلا یا اہلِ محفل کو نگا دیاس نے میری  
 خدا کو جھول کر انسان کے دل کا یہ عالم ہو  
 اگر دم بھر بھی مٹ جاتی غلشِ خارِ تنہا کی  
 ہوس جینے کی ہی یوں عمر کے بیکار کٹے پر  
 نہ مرنے کا ستم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا  
 قیامت تھی جو اک قطرہ ان آنکھوں سے جلاتا ہوتا  
 یہ آئینہ اگر صورتِ نما ہوتا تو کیا ہوتا  
 دلِ حسرتِ طلب کو اپنی ہستی سے گلاتا ہوتا  
 جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا  
 زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل  
 وطن میں ایک دل ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

(۲)

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ دردِ غم میرا  
 سلامت میری گردن پر رہے بارِ عالم میرا

بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب مت م میرا  
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا  
ابھی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا صدم میرا  
تو اس دنیا میں کس لے آیا قدم میرا  
شہید یا سون نکلا ہو کس مشکل سے دم میرا  
اسی پر ختم ہے افسانہ درد و الم میرا

بہار آئی تھی پوچھو سو دادم نہ دم میرا  
لکھا یہ داور محشر نے میری فرو عصیاں پر  
کشاکش ہو امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہو  
اگر کوئی دم کمال کی شہدہ تھا اس کی قدرت کا  
کھڑی تھیں راستہ لٹکے ہوئے لاکھوں تنائیں  
رہی ہو ایک ترک آرزو کی آرزو باقی

## ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ترانہ

ہم بلبلیں ہیں اُس کی دہ گستاں ہمارا  
سمجھو ہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا  
وہ سنتری ہمارا اڑہ پاسباں ہمارا  
گلشن ہو جن کے دم سے رشکِ خیال ہمارا  
اُتر اترے کنارے جب کار وں ہمارا  
ہندی ہیں ہم وطن ہو ہندوستان ہمارا  
اب تک مگر ہو باقی نام و نشان ہمارا  
صدیوں رہا ہو دشمن دورِ زمان ہمارا

سائے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا  
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہو وطن میں  
پرست وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسمان کا  
گو دی میں کھیلتی ہیں اُسکی ہزاروں نیاں  
اے آپ رو دو گنگا وہ دن ہو یاد تجھ کو  
نہ مہم نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا  
ایو نہان و منحصر و ماسب مٹ گئی جہاں سے  
کچھ بات ہو کہ ہستی ملتی نہیں ہماری

اقبال کو بی محرم اپنا نہیں جہاں میں  
معلوم کیا کسی کو دردِ مہناں ہمارا



## ستار

قمر کا خوف کہ ہے خطرہ سحر تجھ کو      آل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو  
 متاع نور کے لٹ جائیگا ہو ڈر تجھ کو      ہو کیا ہر اس فنا صورت شر تجھ کو  
 زمیں سے دور دیا آسمان نے گھر تجھ کو      مثال ماہ اڑھائی قباے زر تجھ کو  
 غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے  
 تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

پچکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہو      جو اوج ایک کا ہو دوسر کی بستی ہو  
 اجل ہو لاکھوں ستاروں کی اک لادیت      فنا کی نیندے زندگی کی مستی ہو  
 وداع غنچہ میں ہو راز آفرینش گل      عدم عدم ہو کہ آئینہ دار ہستی ہو  
 سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں  
 ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

راز نگاہ و بخت

## پیغام اقبال

ہمنشیں افسانہ بیدارے جمہور چھپرے      قصہ خواب در اسکندر و جم کب ملک  
 توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام      دور یسے جنت سے رونی چشم آدم کب ملک  
 آفتاب تازہ پیدا الطن گینی سے ہوا      آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا لہر کب ملک  
 باغبان چارہ فرما سے یہ ہستی ہے ہزار      زخم گل کیو اسطے تدبیر مرہم کب ملک  
 ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول      غنچہ ساں غافل تمے دامن میں شہم کب ملک  
 کر ملک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو         
 اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو         
 راز کشان لاہوری

# جلیل القہ جاب حفظ جلیل حسن جلیل ناک لپی

حمد

(۱)

ہو لاکھ لاکھ شکر خدائے جلیل کا  
اللہ تک پہنچ کا ذریعہ یقین ہے  
خود فرشتہ خاک پر ہی نظر عرش پاک پر  
کس کی مجال ہو ترے اوصاف لکھ سکے  
یارب قبول عام لے اس کلام کو  
جس نے دُرسن سے بھرا منہ جلیل کا  
حجت کو دخل جو نہ گذرے دلیل کا  
اللہ سے حوصلہ ترے عبد ذلیل کا  
یاں ہو قلم شکستہ پر جبریل کا  
دل کی جگہ بغل میں ہو دیواں جلیل کا

غزلیت

(۱)

پردہ نہ تھا نہ صرف نظر کا تصویر تھا  
پردہ اٹھانے کو جو کہا تھی مری خطا  
آئینہ امن کے سامنے رکھ لوں تو یہ کہوں  
روزِ ازل بیا تھا جو جام نے است  
اس کے کرم نے بھرے جنت میں بے حساب  
رحمت نے کی وہ آد بھگت حشر میں جلیل  
دیکھا تو ذرے ذرے میں ان کا جلوہ تھا  
آنکھوں میں پھر رہے تھے یہ کس کا تصویر تھا  
انصاف سے کہو کہ مرا کیا تصویر تھا  
آنکھوں میں مٹے مٹے اُسی کا سرور تھا  
سو تھے قصور وار تو اک بے قصور تھا  
مجھ کو ہوا گمان کہ میں بے قصور تھا

(۳)

بڑا کما جو دلِ نا صبور میں نے کیا  
بڑی خطا ہوئی مجھ سے قصور میں نے کیا

سجائے کے لئے نقرہ یہ سوچ رکھا ہے  
سزائیں دو مجھے اُلفت کی یا معاف کر دو  
وہ قتل عام کو نکلے اس کی تماشہ  
جلیں جب سے سمجھے نو پڑی جسوجی کی

غفور جان کے تجھ کو قصور میں نے کیا  
قصور رواہ ہوں بیشک قصور میں نے کیا  
ہر ایک سوچ میں ہی کیا قصور میں نے کیا  
وظیفہ سحری یا غفور میں نے کیا

(۳)

میں وہ مظلوم بڑوں نے تھے ہوا سماں مجھ کو  
یہ ممکن ہوئے دوست یہ ممکن ہوئے راحت  
کہ ہر دھوڑوں میں راہ عافیت بچ کر کدھر جاؤ  
چلا جاتا نہیں لیکن بھلا ہو جو شش گریہ کا  
بزرگ پسے گل نقدیر میں برباد ہونا تھا  
چمن میں رہ کے ساری عمر مشغفتی کی  
جلیں آزاد ہوں میں بڑی گل کی طرح گلشن میں

دیں گردن جھکا کی خوف سے دیکھا جہاں مجھ کو  
بتا توئے جوانی پھر لے گی تو کہاں مجھ کو  
بلا میں چار سو گھرے کھڑا ہے آسمان مجھ کو  
لے جاتا ہوا اپنے ساتھ ساتھ اشک لے لے مجھ کو  
نکلے آشیاں سے پھر نہ سوچا آشیاں مجھ کو  
قص میں تے آتے آگئی طرزِ فغاں مجھ کو  
نہ ہے صیاد کی پردا نہ خوفِ بانعساں مجھ کو

(۴)

چاہیے دنیا نہ عجب چاہیے  
زندگی کیا جو بسر ہو چمن سے  
مجھ کو بے وسعت وہ فرشِ زمیں  
رات بھر میں شمعِ محفل جل بھی

جو تجھے چاہے اُسے کیا چاہیے  
دل میں تھوڑی سے تنہا چاہیے  
بیٹھ رہنے کو ٹھکانا چاہیے  
چاہیے اس کو تو ایسا چاہیے

وہ بہت دیدہ آشنا ہے لے جلیں  
آشنائی کو زمانا چاہیے

(۵)

مے والے خوب چھوٹے گردش آیام سے  
ہم مسافر تھے اگر قاتل کی مرضی دیکھتے  
آفتیں ساری جھٹی تک عقین کہ تھی تم سو امید  
بے نشان تجھ کو سمجھ کر صبر آ جانا مجھے  
کیا خدا کی شان ہو جن کا وظیفہ تھا جلیل  
سورہ ہے ہیں پاؤں پھیلاتے ہوئے آرام سے  
تین کے سایہ میں دم بھر بیٹھتے آرام سے  
اب ہماری بھی گزرتی ہے بڑے آرام سے  
پر یہ مشکل ہے کہ میں واقف ہوں تیرے نام سے  
آج وہ کہتے ہیں ہم واقف نہیں اس نام سے

(۶)

قابل دربار غم ہم ہو چکے  
صبح محشر چار سو ہے یہ پنگار  
اب ہو آنکلی گردش چشم اور ہم  
دل میں کیا ہو جس کا لایح ہو جلیل  
رو چکے منہ آنسوؤں سے دہو چکے  
رات گوری سونے والے سو چکے  
جام جم کے دور دور سے ہو چکے  
دیتے ہو دے ڈالو جھگڑا تو چکے

(۷)

کرم کے جو کرم کا ظہور ہوتا ہے  
وہ چھپ کے آئے ہیں اس طرح شب کے پڑی ہیں  
ہزار صلح ہو لیکن جہاں سے دو دل  
جز اسرا کا تجھے اختیار ہے یا رب  
خطا سے پہلے ہی غفور قصور ہوتا ہے  
کہ جیسے آنکھ کی پتلی میں نور ہوتا ہے  
نیاز و ناز میں جھگڑا ضرور ہوتا ہے  
غفور جان کے تجھ کو قصور ہوتا ہے  
جلیل شان کرم جس نے دیکھ لی اکبار  
وہ جان و دل سے فدا کئے حضور ہوتا ہے

# مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

حمد

(۱)

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزوئے سپاس کا  
عشق میں تیرے دل ہوا ایک جہان بخودی  
جسکے صفات یار میں دخل نہوقیاس کا  
جان خزانہ بن گئی حیرت بے قیاس کا  
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ تری لباس کا  
قلب گناہگار میں نام نہیں ہراس کا  
جان امید دار کا حسرت بخویاس کا  
طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ

## غزلیات

حُسن بے پردہ کو خود بین و خود آرا کر دیا  
پڑھ کے تیرا خط مے دہلی عجبات ہوئی  
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمست کر دیا  
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا  
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بحب کر دیا  
مہرِ ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا  
شمع جب روشن ہوئی گھر میں جا لا کر دیا  
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا  
سب غلط کہتے تھے لطف یار کو دہ سکون

دردِ دل اُس نے تو حسرت اور دُنا کر دیا

(۲)

باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا  
یہ تیرے انتفات نے آخر کیا ہے کیا  
میں بھول جاؤں گا کہ مرا دعا کی کیا  
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا  
یہ دیکھئے مناسبتانِ عطا ہے کیا  
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہو کیا  
آمین اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا سے کیا  
مجھ کو خبر نہیں کہ مرا مرتبہ ہے کیا  
گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی  
چل بھی گئے وہ چھین کے صبر و قرار  
میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر  
ہم کیا کریں اگر نہ تیری آرزو کریں  
حسرت جفا سے یا رکو سمجھا جو تو دنا

(۳)

ہو پیشِ نظر ہر دمِ حسنِ نمکیں تیرا  
کس گوشہِ معبرت میں تو تہا ہے مکین تیرا  
ہم پر نہ چلا جا دولے چینِ جبیں تیرا  
مولنس نہ ہوا کوئی لے جانِ حزیں تیرا  
اقرار ہے در پردہ انکار نہیں تیرا  
دامنِ جان میں وہ لے لیجے سارے آنسو  
سرخ نکلے ہل سی رنگ کے مارے آنسو  
یا رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو  
بن گئے ہیں فلکِ حسن کے تارے آنسو  
چشمِ جاناں میں یہ کرتے ہیں شارے آنسو

(۴)

مٹتا ہے مٹا سے اب شوق کہیں تیرا  
لے قصرِ امارت کی دیرانی و بربادی  
آنکھوں کے تہمت نے سب کھول دیا پردہ  
جز کثرتِ محرومی جز غایتِ دلگیری  
ہم خوب سمجھتے ہیں حسرت سے تیری باتیں  
اثرِ عشق سے نمکیں جو مٹھا رہے آنسو  
جلوہِ حسن سے رنگیں ہیں جو آنکھیں ان کی  
عالمِ حسن میں ہیں نور کی لہریں جاری  
گریہِ شوق سے تریں جو مٹھاری آنکھیں  
ہی محبت سے سرور کار ہمیں بھی حسرت



(۵)

وہ تجو دی وہ محرمی بے خلل گئی  
کیا تیری یاد بھی مے دل سے نکل گئی  
کیوں اس حیم عیش میں یوں بے محل گئی  
حسرت ہی وہ نہیں ہے جو دل سے نکل گئی  
تشویش زندہ گائی و فکر اجل گئی  
میری نگاہ شوق جہاں سر کے بھل گئی  
اب ہم سے قدر دانی علم و عمل گئی

دل کی جو ترک عشق سے حالت بدل گئی  
مجھ کو فلک نے تجھ سے چھڑایا تو کیا ہوا  
اے اس سے نامہ سابی جو رہتی تو خوب تھا  
سو داہی وہ نہیں ہو جو سر سے چلا گیا  
اب دل ہے اور فراغ محبت کی ریتیں  
زنگینوں کی جان ہو وہ پائے ناز نہیں  
حسرت یہ دور جہل ہو دولت کو ہر فرغ

(۶)

گدا ز غم اگر چاہئے تو مجھ کو باخدا کرے  
نہیں تو پھر مجھی کو بے نیاز مدعا کرے  
جو اس بے مہر کو بھی ناز غم سے آتشا کرے  
نگاہ شوق اس مفہوم زنگیں کو ادا کرے  
کہیں ایسا نہ ہو یہ عشق کو بھی خود نما کرے

دل مایوس کو سر چشمہ صدق و صفا کر دے  
عطا ہو اس وفا دشمن کو تو فین کرم یارب  
اے ایسا کہاں سے لادوں یارب نامہ دل میں  
گراں گزر گیا حرف آرزو اس طبع نازک پر  
غورِ حسن کی تاثیر سے ڈرے مجھے حسرت

(۷)

اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں  
جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں  
اہل شوق اب کہو کہ صبر جائیں  
جو تری یاد میں گزر جائیں

عشق میں جان سے گذر جائیں  
جامہ زیبی نہ پوچھے اُن کی  
اُن کو مد نظر ہوا پر دا  
شب ہی شبے دن دہی دن ہیں

اُن تک اب نالہ سحر جاییں  
سُنتے ہی دل میں جو اُتر جاییں

گر یہ شام سے تو کچھ نہ ہوا  
شعر دراصل ہیں وہی حسرت

(۸)

وہ اپنی خوبی قسمت پر کیوں نہ تاز کرے  
تھے جنوں کا خُدا سلسلہ دراز کرے  
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے  
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے  
وہ اُن کے دردِ محبت سے ساز باز کرے  
تیری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے  
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے  
دلوں کو فکر و دو عالم سے کر دیا آزاد  
خرد کا نام جنوں پر لگایا جنوں کا خرد  
تھے ستم سیمیں خوش بہن کہ غالباً یوں بھی  
غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش  
امید واد میں ہر سمت عاشقوں کے گردہ  
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت

(۹)

بندہ پروردِ جاییں اچھا خفا ہو جاییں  
بلکہ پہلے سے بھی ٹہرہ کر کج ادا ہو جاییں  
در پے ایدائے جان مبتلا ہو جاییں  
دیکھ لیجئے اور تغافلِ آشنا ہو جاییں  
یعنی آخر بے نیاز مدعا ہو جاییں  
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جاییں

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جاییں  
میرے غدرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے انتہات  
خاطرِ محرم کو کر دیجئے محوِ الم  
میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجئے کچھ جواب  
ایک بھی ارمان نہ رہ جائے دلِ اپوس میں  
ہائے رمی بے اختیار یہ تو سب کچھ پیچیدہ

کشمش ہائے الم سے اب یہ حسرت جمی میں ہو  
چھٹکے ان جھگڑوں سے مہمانِ خفا ہو جاییں

# مولانا سید علی حمید رنظم طباطبائی

## غزلیت

(۱)

نظر آتا ہے ابرسا گزنا کو ہزاروں کا  
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت  
نہ شریخی لے صبا کر۔ وضع میل بفرق ناہو  
بہت جندی کی تو نے کوس ملتے جانے میں  
کملادیتی ہو کیا سرمہ نگار و شرمگین تیرا  
منہم بھی ہے کیا لے نظم ہم فرقت نصیبو نہیں  
یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا

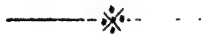
(۲)

آستینیں تو چڑھائی ہیں مری تغزیر پر  
جذب بکھیتی جو عجب دکھتے ہوئے دل کی صدا  
حسن صورت پر مصور کے یہ حیرت ہے اسے  
سعی لا حاصل کے جانے میل ک لذت تو ہو  
خاک کی چٹکی ہے کافی خاکساروں کیلئے  
گو کہ ہم ہیں سپیکر بیجاں، مگر ہیں تو سہی  
کچھ بتاؤ تو سہی۔ آخر یہ کس تقصیر پر  
دور تاہی شور محشر نہالہ شگبگیر پر  
ایک خاموشی سی ہو چھائی ہو لی تقصیر پر  
ہنسنے دو تقدیر ہنستی ہے اگر تدبیر پر  
کیا دو اہر درد کی موقوف ہو اکسیر پر  
کچھ تو آؤ ب رنگ باقی ہے ابھی تصویر پر

تن کی عزائی ہے خوب آوارگان دشت کو  
نظم مجھ کو ناز ہے اس خلعت و جاگیر پر

(۳)

نفس جب تک ہوا نکھیں نہ دے وادیاں کہاں کریں  
ضعیفی میں نہیں ہم کو شکایت فدا کو بھلنے کی  
بندھا ہوا یہ جتیک تماشا تپتیاں کر لیں  
خبر اس کی نہیں تھی دام زیر کاہ پہناں ہو  
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آسیاں کر لیں  
ہمارے ضبط کی گر بردہ داری نہ کھنچا چاہی  
تو آئے برقی تجھ کو آسیاں میں ہم نہاں کر لیں  
خزاں کے خوف میں گھٹنے سے یہ نظم بہتر ہے  
تماشا کے گل و رسیاں دباغ و بوستاں کر لیں



# ہر کسینسی ہمارے کرشن شاد شادی سی آئی ای

## غزلت

(۱)

شخص ہی یا عکس ہی صورت مری آنکھوں میں ہو  
دیکھ کر حیران ہو کیوں عالم تجھ میں مجھے  
پتلیاں اسواسٹے روتی ہیں میری دمدم  
دولت عام میں نظر آتی ہو اپنی ہی بہار  
کوئی آئینہ ہی یا حیرت مری آنکھوں میں ہو  
جلوہ دیدار کی حسرت مری آنکھوں میں ہو  
دیکھ لوں پھر اسکو یہ حسرت مری آنکھوں میں ہو  
کیا بہار گلشن قدہ رت مری آنکھوں میں ہو  
کیوں نہ سجدہ میں کر دل بجانبا جمیر شاد  
خواجہ اجمیر کی صورت مری آنکھوں میں ہے

(۲)

درد و فراق سے نہو دل کی تسلی نہ سہی  
کوزہ دجام ہنسانے کی تو تھی خاک مری  
قابل جلوہ گمہ یار تو دل ہو لے قیس  
معرفتِ علم لاتی ہو کہوں کیا تجھ سے  
گر نہیں لیتے خبر تم میرے دل کی نہ سہی  
اس کے بھی کام کی گریہ نہیں سٹی نہ سہی  
گر نہیں اس میں بھی جلوہ لیلیٰ نہ سہی  
داعضا اگر تو سمجھتا نہیں معنی نہ سہی  
اس میں بھی شک ہی تھیں کیا کہ نہیں بندوب  
خیر کافر ہی سہی شاد جو صوفی نہ سہی



# سَوَاحِجُ عُمرِیَّانَ





# مشہور اہل قلم کی سوانح عمری

اور

## اُن کی خصوصیات کمالات پر ایک نظر

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آبدی مولوی

(۱)

پیدائش ۱۸۳۱ء وفات ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء  
شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ۱۸۳۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے آپ کے  
والد ماجد مولوی محمد باقر مذہب امامیہ میں اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے ۱۸۵۸ء میں مولوی  
محمود قزلباش نے پہلا اردو اخبار اپنی ادارت میں دہلی سے شائع کیا تھا۔ مولانا آزاد صاحب نے  
اور نیٹل کالج دہلی میں عربی و فارسی کی تکمیل کی اور طالب علمی کے زمانہ میں جواب مضمون  
لکھنے میں اور غلبہ سے اول رہتے تھے۔ سخن گوئی کا شوق طالب علمی ہی کے زمانے سے تھا۔

اپنے فن شعر گوئی کی تمجیہ کے لئے حضرت فوق مرحوم کے سامنے زانوئے ادب کیا  
 غدر شمع کے بعد جب مسٹر ٹیکر پریس دہلی کالج کے قتل پر آپ کے والد مارے گئے تو  
 آپ نے اپنے قیدی وطن کو خیر آباد کہا اور حیدر آباد دکن چلے گئے کچھ دنوں بعد لاہور آئے اور  
 مولوی رحمت علی صاحب میرمنشی نے پندت من پھول صاحب میرمنشی سے جو اس وقت اس عہدہ  
 پر مامور تھے آپ کی سفارش کی اور سچر فلیہ صاحب ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم کے دفتر میں پندرہ روپے  
 ماہانہ کی جگہ پر مامور کرادیا۔ میجر فلیہ صاحب کے بعد کرنل ہارلڈ صاحب ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم  
 کی جگہ پر رونق افروز ہوئے تو انھوں نے پنجاب روپے ماہانہ پر آپ کو سرکاری اخبار کا سسٹنٹ  
 ایڈیٹر مقرر کیا۔ ۱۸۹۹ء میں پنجاب گورنمنٹ کے میرمنشی پنڈت من پھول کی رفاقت میں  
 کابل اور بدخشان گئے۔ وہاں سے واپس آنے پر سرکاری کالج لاہور کے عربی پروفیسر ہو گئے  
 اور ایک سو ساٹھ روپے ماہانہ آپ کے مقرر ہو گئے ۱۸۸۶ء میں آپ ایران گئے ۱۸۸۷ء میں  
 ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جولائی پر آپ کو گورنمنٹ برطانیہ نے شمس العلماء کا خطاب عطا کیا چونکہ آپ کی  
 والدہ ایک ایرانی خاتون تھیں اور خاندان منٹل سے تھیں اس لئے فارسی آپ کی مادری  
 زبان تھی اور اس پر پورا پورا عبور تھا۔ بھاشا اور علم مغربی پر بھی کافی دستگاہ تھی۔  
 ۱۸۸۹ء میں آپ کا دماغ معطل ہو گیا اور کچھ جنون کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔  
 ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم ۱۳۲۸ھ کو آپ نے رحلت کی اور لاہور میں دفن کئے گئے  
 نظم و نثر میں آپ کا طرزِ جہد اگانہ ہے کسی خاص رنگ کا پابند نہیں، نثر میں آپ کی کتابیں دو  
 قسموں پر منقسم تھیں، ایک وہ جو آپ نے سرشتہ تعلیم پنجاب کے لئے لکھیں مثلاً اردو کا فائدہ  
 اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتاب، قصص ہند فارسی کی پہلی۔ دوسری کتاب  
 جامع القواعد وغیرہ۔ دوم جو آپ نے شوق سے تصنیف کی ہیں وہ سب ذیل ہیں:-

آپ حیات اور دربار اکبری، ستمدان پارس - تیرنگ خیال - قند پاری نصیحت کونچل  
 وغیرہ۔ آپ حیات کا طرز بیان، سلاست زبان، محاورت کی دل آویزی، لطافت کی چاشنی  
 اور روشن خیالی کا بہترین نمونہ ہے۔ تیرنگ خیال میں انگریزی روش کا نتیجہ کیا ہے۔  
 نشر میں آپ کی قادر الکلامی سلم جو مناظر قدرت کا فوٹو اور دارحات قلبی کی تصویر آپ  
 کا حصہ تھی جو نظمیں شب قدر، موسم زمیں، صبح امید اور جنت وطن کے عنوان سے آپ  
 نے کہی ہیں اور جس خوبی سے ایشیائی رنگ کو اپنے رنگ میں رنگا ہے اُس کی جدت کا سہرا  
 آپ ہی کے سر رہا گو آپ کے بعد حضرت حالی مرحوم نے اس رنگ کو چار چاند لگا دیئے مگر  
 جو مقبولیت آپ کو ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ نے نشر میں وہ کمال دکھایا ہے جو  
 آج تک کسی مصنف کو مسیہ نہیں ہوا۔ جس رنگ میں - جس لب و لہجہ میں جانا اپنا کمال  
 دکھا کر اہل فن کو مسح کر لیا۔ آپ حیات اور تیرنگ خیال نے اہل قلم کو محو حیرت بنا دیا ہے  
 آپ کے قلم میں فصیح و بلیغ - دقیق و سلیس غرض کہ ہر قسم کی نشر لکھنے کی قوت و قدرت  
 تھی۔ ایشیائی مذاق اور مبالغہ آمیز خیالات کو قدرتی مناظر اور پینچل شاعری کے  
 سانچے میں ڈھالنا اور اس طرز کو مقبول عام بنانا آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ نے زبان اردو  
 پر جس قدر احسانات کئے ہیں اسکی نظیر قطعی ناممکن ہے۔

# آنر بیل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب

(۲)

پیدائش ۱۸ اکتوبر ۱۸۱۷ء وفات ۲۸ مارچ ۱۸۹۷ء

آنر بیل ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم ۱۸ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ عظیم شرفی فارسی و عربی کی تعلیم کے بعد ۲۲ سال کی عمر میں عدالت صدر امینی دہلی کے سرشتہ دار مقرر ہوئے کچھ دنوں بعد کشری آگرہ کے نائب نشی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۴۷ء میں یقین پوری کے منصف ہو گئے اور وہاں سے بدل کر فچور سیکری اور اُس کے بعد دہلی آئے۔

۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ نے جو آؤ الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین بنا کر مجبور بھیجے گئے۔ ۱۸۵۵ء میں مراد آباد کی سب ججی پر ہمت از لئے گئے اور غازی پور۔ علی گڑھ۔ بنارس۔ سب ججی کی خدمات انجام دینے کے لئے بھیجے گئے۔ یکم اپریل ۱۸۶۶ء کو بنارس چھوڑا اور ولایت کا سفر کیا۔ ۶ اگست ۱۸۶۹ء کو کونست (مکینیزی) سے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور منغہ عطا ہوا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہندوستان واپس آئے اور ۲۴ مئی ۱۸۷۷ء کو مدرسہ العلوم علی گڑھ کی بنیاد ڈالی ۱۸۷۷ء میں نہایت نیک نامی اور عزت کے ساتھ آپ نے پنشن لی اور اپنے آپ کو قومی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔ اخبار النسی ٹیوٹ گزٹ اور رسالہ تہذیب الاخلاق

دو نون آپ کی آوارت سے شائع ہوتے تھے۔ غدر شمس کے بعد آردو زبان میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی شریک پر کا جو پر تو اس پر پڑا وہ سرسید مرحوم کی جدت طبع اور سعی تبلیغ کا نتیجہ تھا۔ اسی لئے جدید علم ادب کا سہرا آپ کے سر رہا۔ آپ کے مضامین میں تشبیہات، استعارات، تمثیلات، تلمیحیں نہایت لطیف و نادر ہیں۔ زبان کا لوح نہایت مزاد دیتا ہے جو کہتے تھے وہ لکھتے تھے اور اس پر ایہ سے نفس مطلب ادا کرتے تھے کہ سبحان اللہ۔

بسا اوقات آپ کا صحیح جذبہ اتنا اثر ڈالتا تھا کہ لفظ نقض ہو جاتا تھا اور جوابات منہ سے نکلتی تھی تا ثیر کے ساتھ دست و گریباں ہو کر نکلتی تھی۔ آردو شریک کو جو بدلت طبع طرح کی امداد پہونچائی ہو اس لحاظ سے آپ کو فائدہ آتا آردو کما جاتا ہو اگرچہ آپ کے طرز تحریر کی بعض ہم عصروں نے بھی تقلید کی مگر نقل میں اصل کا جلوہ کماں مضمون نگاری کی گرم بازاری آپ ہی کی ذات سے ہوئی جو آپ پہونچ ہوتی تھی وہ اس قدر مؤثر اور دلچسپ ہوتی تھی کہ پھر کسی سامع کا دل کسی اور طرف مائل نہ ہوتا تھا آپ کی بہت سی تصنیفات و تالیفات ہیں جن میں تفسیر القرآن سب سے زیادہ مشہور ہو یہ تفسیر چھ جلدوں میں ختم ہوئی۔ اس کے علاوہ سلسلۃ الملوک، انار القنادید، اسباب لغات، ہندو لکچر، دل کا مجبور بھی نامہ ناز ہیں مگر تفسیر اس روانی اور خوبی کے ساتھ لکھی ہو جس کی داد کے لئے الفاظ مستیر نہیں آتے۔ سرسید مرحوم نے مدرستہ العلوم علی گڑھ کی بنیاد سے ملک اور قوم کو جو فائدہ پہونچایا ہو اس کے احسانات سے آئندہ نسلیں سبک دوش نہیں ہو سکتیں اور اس نصف صدی میں قوم نے جو ترقی کی ہو وہ اظہر من الشمس ہو۔ حق تو یہ ہے کہ لے سرا پانفیس لے سرسید عالی خیال (حمید) وصف ہوں سے رقم کیا میری طاقت کیا مجال

آخر عمر میں آپ نے ستول لٹری سر دس میں ہندوستانیوں کو مغز عہد سے دیئے  
 جانے کی بابت بہت کوشش کی اور اس خیال کو کامیاب دیکھنے کی فکر میں ہر وقت  
 مصروف رہے۔ مگر قوم اور ملک کی بے نصیبی سے اکیاسی برس کی عمر میں سرسید مرحوم نے  
 ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء بمقام علی گڑھ رحلت فرمائی اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ (کالج) کی  
 مسجد کے بیرونی حصہ میں دفن ہوئے اور قوم کی کشتی کو جو کس پر سی اور ذلت کے  
 سمندر میں غوطے کھا رہی تھی پار کرنے کے لئے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی ملاحی  
 بطور یادگار چھوڑ گئے۔



# شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی

(۳)

پیدائش ۱۸۳۷ء وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۱۷ء

آپ کا سلسلہ نسب خواجہ ملک علی صاحب لٹا ہے۔ جو ہرات سے ہندوستان آکر پانی پت ضلع کرنال میں مقیم ہوئے تھے۔ بادشاہ وقت نے ازراہِ قدرت دانی پانی پت اور اُس کا ملحقہ علاقہ بطور الطاف شاہانہ اُن کو مرحمت کیا اور منصب قضاات پر مامور فرمایا۔ آپ کی ولادت ۱۸۳۷ء کے قریب پانی پت محلہ انصاریہ میں ہوئی۔ آپ لکھنؤ انصاری اور لٹنا سید تھے۔ آپ کو تحصیل علم کا فطری شوق تھا۔ میرمنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی سے آپ نے فارسی اور مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی کی تعلیم پائی۔ ۷ سال کی عمر میں ایک خوش حال گھرانے میں شادی ہوئی۔ آپ دہلی تشریف لائے۔ اور وہیں علوم منطق و فلسفہ اور صرف و نحو وغیرہ کی تحصیل انتہائی درجہ تک پہنچائی ۱۸۵۵ء تک مطالعہ کا سلسلہ برابر جاری رہا آپ نے ابتدائے نواب مقصطفی خان شفیقہ سے مشورہ سخن کیا اور پھر مرزا غالب مرحوم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد گوڈونٹ پنجاب کے دارالکتاب (بک ڈپو) لاہور میں چرائی کتابوں کا لٹریچر موجودہ زمانہ کے مطابق درست کرنے پر مامور ہوئے۔ اس زمانہ میں کرنل ہالمر ایڈٹڈ ڈائریکٹری تعلیمات نے لاہور میں ایک بزمِ مشاعرہ قائم کی تھی جس میں بجائے مصرح طرح کے خاص خاص عنوان پر شعرا کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ مولانا موصوف نے

اپنی فصاحت و بلاغت کے وہ جوہر دکھائے جس نے اُن کی شہرت کمود بالا کر دیا۔ چنانچہ  
 برکھارت، انشائے امید، مناظرہ، رجم و انصاف، حُبِ وطن وغیرہ اُسی بزم کی یادگار نقوش  
 ہیں۔ ۳۴ سال بعد اننگلو عربک اسکول، دہلی کی مدرسہ پر مقرر ہو کر آپ لاہور سے  
 واپس آئے۔ اسی اثناء میں نواب آسمان جاہ مرحوم علی گڑھ کا لُج کامعائنہ کرنے کے  
 لئے تشریف لائے۔ اور آپ کو خوش قسمتی سے باریابی کا موقع مل گیا اور ازراہِ  
 قدر دانی پچھتر روپے ماہانہ کا امدادی وظیفہ و کُن سے مقرر ہو گیا۔ ستر سالہ میں  
 دو علی گڑھ ڈپوٹیشن کے ساتھ آپ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ اُس وقت سر آسمان جاہ  
 مدارالہمام تھے آپ نے کئی نظمیں پیش کیں تو آپ کا وظیفہ بجائے پچھتر روپے ماہانہ کے  
 سو روپے ماہانہ ہو گیا کچھ عرصہ بعد آپ نے تریاقِ مسموم اور تعلیم نسواں پر دو کتابیں  
 اور تصنیف کیں جو اس وقت کم یاب ہیں۔ ان کتابوں کے سلسلہ میں دو اقلیمی دربار دہلی  
 کے موقع پر لارڈ ڈیرک نے چار سو روپیہ انعام عطا کیا اور یہ کتاب احاطہ پنجاب کے  
 کورس میں داخل ہو گئی۔ آپ نے ایک فرانسیسی کتاب طبقات الارض کے عربی ترجمہ  
 کا مطالعہ کیا اور اپنی مادری زبان میں اس کی مشکلات کو حل کیا۔ اس کے بعد حیات  
 سعدی، مدرس حالی، دیوان حالی، شکوہ ہند، یادگار غالب اور حیاتِ ساد و یدر ملنا  
 کی منتقل تصانیف کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ حیاتِ سعدی، یادگار غالب اور حیاتِ جاوید میں  
 بالترتیب شیخ سعدی، حمزہ غالب اور سر سید احمد خاں مرحوم کی مشرح اور مبسوط لایف  
 ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں آپ کا ایک دیوان شائع ہوا جو فصاحت و اخلاق سے چرچہ ہے عرصہ  
 ہوا کہ آپ کی رباعیات کا ترجمہ یورپ میں بڑا نامور و انگریزی ہو چکا ہے اور حضور نظام  
 میر محبوب علی خاں مرحوم مغفور کی جو کئی جہل سالہ کے موقع پر آپ کو حیدر آباد بلا گیا



اس موقع پر آپ نے اپنی متین اور مؤثر آواز میں اپنی نظم کا پہلا ہی شعر پڑھا تھا کہ حاضرین  
 کی چیز نے زمین کو آسمان پر اٹھالیا اور مودی طغر علی خاں - مزارعہ بزم جوم، مودی  
 عبدالحق اور مہاراجہ مدرالہمام نے نظام دکن سے درخواست کی کہ یہ نظم مداح اس سواں  
 کے انصاف میں داخل کی جائے۔ مسئلہ میں گورنمنٹ مالیہ نے اس کو انٹنس انعام  
 کا خطاب عطا کیا۔ آپ اپنے طرز کے موجد اور نصائح و پند کے یکتا ادیب تھے حقیقت  
 میں قول و فعل کی جودل پسند مطابقت میلانا حالی کی ذات بابرکات سے پائی جاتی ہے۔  
 وہ اور کسی میں نہیں۔ محقر یہ کہ آپ کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ آخر ۳۱ دسمبر  
 ۱۹۱۱ء کو آپ نے داغ مفارقت دیا اور ہمیشہ کے لئے جلد بریں کو اپنا مسکن بنایا۔



# شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد صبادہوی

(۴)

پیدائش ۱۸ ستمبر ۱۸۳۶ء وفات ۲۸ اپریل ۱۹۱۲ء

شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد دہلوی مولوی سعادت علی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ ۶۔ ستمبر ۱۸۳۶ء کو نواح نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ سن بلوغ کو پہنچتے ہی آپ اپنے اپنا قدیمی وطن ترک کیا اور دہلی کی مستقل سکونت اختیار کی اپنے والد ماجد سے کتب فارسی کی تعلیم پائی اور عربی کی ابتدائی کتب مولوی نصر اللہ خاں سے پڑھیں اور مولوی عبدالحق صاحب سے پوری پوری تکمیل کی۔ سنوری ۱۸۵۷ء میں آپ دہلی کالج میں داخل ہوئے اور یہیں سے فارغ التحصیل ہو کر ابتدائے ضلع کجرات کے ایک اسکول میں چالیس روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ دو سال تک اس خدمت کو قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ ۱۸۵۸ء میں آپ کا پور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ آپ تنگنی زبان بھی اچھی جانتے تھے۔ آخر میں آپ نے دہلی رہ کر سنسکرت زبان پر پورا پورا عبور حاصل کیا۔ حسب ایما گورنمنٹ عالیہ آپ نے انکم ٹیکس اور تعزیرات ہند کا نہایت سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ جس کے صلہ میں آپ ۱۸۶۱ء میں تحصیلداری کے عہدے پر فائز ہوئے کچھ عرصہ کے بعد آپ نے ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کا انگریزی سے اردو ترجمہ اپنی ٹکسالی زبان میں کیا جو گورنمنٹ کی نگاہ میں خصوصاً اور قانون

اس طبقہ میں عموماً مقبول ہوا۔ اس نمایاں خدمت کے صلہ میں ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے  
 عہدے پر مامور ہوئے اور اس عہدہ جلیلہ کے فرائض کو اپنی ذہانت سے بخوبی انجام  
 دیتے رہے۔ ۱۸۷۸ء میں نواب حماد الملک مولوی سید حسن بلگرامی کی تحریک سے  
 سرسار جنگ مدار الملہام نے آپ کو حیدرآباد بلا کر ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ  
 کی جگہ پر متاثر فرمایا۔ آپ نے فرائض منصبی کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا آخر کچھ  
 عرصہ کے بعد اس عہدہ سے پنشن پائی اور تازلیت دہلی ہی میں مقیم رہے۔ آپ نے  
 اردو میں وہی مرتبہ حاصل کیا جو فارسی میں آلو الفضل فیضی نے حاصل کیا تھا۔ آج تک  
 ایسی صاف ستھری نشر دہلی اور لکھنؤ کے معاصرین کو لکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پنڈت  
 رتن ناتھ سرشار لکھنؤی کے بعد آپ نے اردو ناول نویسی کو مہذب مگر مہذب رنگ  
 میں لکھ کر اہل قلم کو دکھا دیا کہ اگر حسن و عشق کے مضامین چھوڑ کر کیسی مقبول عام تصنیف  
 ہو سکتی ہے تو وہ مولانا موصوف کی نشر ہے۔ ان کی کتب عشق و حسن کی روایات سے  
 بالکل خالی ہیں مگر اخلاقی جذبات اور دلپذیر فصاحت کے موجزن دریا ہیں جو  
 اہل ہند کے دلوں کو تروتازہ کرتے ہیں۔ آپ کی مقبول کتاب مرآۃ العروس ایک  
 عرصہ تک گورنمنٹ انگریزی کے ایماء سے مدارس میں جاری رہی اور فی زمانہ کوئی  
 مہذب گھر اس سے خالی نہیں۔ اس تصنیف کے صلہ میں آپ کو ایک ہزار روپے  
 گورنمنٹ نے عطا فرمائے۔ نبات النعش میں تعلیم نسواں کے مطالب کو صاف و شستہ  
 زبان میں بطور مکالمہ کے حل فرمایا۔ توبۃ النصوح آپ کی اخلاقی کتاب ہے جو قابل  
 دیکھنے اور عمل کرنے کے ہے۔ ان دو آخر الذکر کتابوں پر گورنمنٹ نے بڑا انعام  
 عطا کیا ہے۔ منتخب الحکایات۔ آہن الوقت۔ رویائے صادقہ۔ الحقوق الفریض

مؤطر حسنہ۔ ترجمہ القرآن اور بہت سی بے بہا تصانیف ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر نہایت مرغوب و کار آمد اور قابلِ صامتائش ہیں۔ آپ کی طبیعت میں مہذب مذاقی تھا۔ جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ کلامِ مجید کا ترجمہ بھی ایسا سلیس کیا جو کہ اس کی نظر نہیں ملتی۔ آپ کی زبان بہت صاف ہے اور آپ کی طرزِ ادا سے دہلی کا رنگ جھلکتا ہے۔ مولانا موصوف نے ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو ملک و قوم دونوں کے لئے مایہ ناز ہیں۔ آخر آپ نے مرضِ فلج میں ۱۸ مارچ ۱۹۱۷ء کو جمعہ کے دن صبح کے وقت اس جہانِ فانی سے بہقامِ دہلی انتقال فرمایا۔



# شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

وفات ۱۹۱۲ء

(۵)

پیدائش ۱۸۵۶ء

آپ شمس العلماء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک معزز خانہ ان میں پیدا ہوئے۔ منطق، فلسفہ، ادب، مولانا محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی مشہور ادیب سے فقہ مولوی ارشاد حسین صاحب سے تفسیر اور قدس علم ادب مولوی فیض الحسن صاحب سے اور حدیث شریف مولوی حافظ احمد علی صاحب محدث سہارن پوری سے صرف ۱۸ برس کے قلیل زمانہ میں حاصل کیے۔ حصول تعلیم کے کچھ دنوں بعد آپ دیوانی عدالت کے امین رہے اس ملازمت سے دل برداشتہ ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ اور سمیع اللہ خاں صاحب کی سفارش سے سرسید مرحوم نے آپ کو کالج کی پروفیسری پر فائز کیا۔ سولہ سال تک کالج کی خدمت نہایت خوبی سے انجام دی اور علمی دنیا میں ایسی شہرت و عظمت حاصل کی جو فی زمانہ قابل رشک ہے۔ دوران پروفیسری میں آئرن لڈ پروفیسر سے آپ نے فرینچ زبان سیکھی اور اسی زمانہ میں آپ بلا و اسلامہ قسطنطنیہ مصر وغیرہ کتاب انظار و ق کا مواد جمع ہو بچانے کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں کے مشہور مدارس کے حالات اپنے سفر نامہ مصر و روم میں قلم بند کئے ۱۸۹۲ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ سے عطا ہوا اُس وقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ عرصہ تک آلہ آباد یونیورسٹی کے فیلو رہے۔

سرسید کی رحلت کے بعد ۱۸۹۵ء میں آپ کالج سے سبک دوش ہو کر حیدرآباد سلسلہ آصفیہ میں دوسو روپیہ ماہوار وظیفہ پرنسپل کے شعبہ میں مقرر ہوئے

کچھ عرصہ بعد تین سو روپے ماہوار مقرر ہو گئے ایک عرصہ کے بعد آب و دانہ کی کٹش دکن سے لکھنؤ بھیج لائی اور وہاں قیام پذیر ہو کر ندوۃ العلماء کی دینی خدمات میں مصروف ہوئے۔ آخری عمر میں تمام سلسلوں سے قطع تعلق کر کے سیرۃ نبوی کی تالیف و تصنیف میں مشغول ہوئے۔ انیسویں ہے کہ زندگی نے وفات کی اور سیرت ناتمام رہ گئی ورنہ دنیا میں اس کی مثال نہ ملتی۔ ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو مرض اسہال میں مبتلا ہو کر اپنے قدیمی وطن میں رحلت فرمائی قدرت نے آپ کو ابتدا ہی سے دین و دین میں اور تسلیم الطبع بنایا تھا۔ تاریخ و فلسفہ سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ علیم مشرقی میں کامل استعداد ہم پہنچائی تھی طرز بیان آپ کا اگرچہ نہایت سادہ تھا مگر دلائل قومی اور تحریری فلسفیانہ اور محققانہ تھی جس میں تاریخی واقعات ہوتے تھے۔ عربی نظم و نثر کے ادیب مانے جاتے تھے فارسی خوب لکھتے تھے۔ اردو میں ایسا پاکیزہ اور دلکش بیان تھا کہ بقول سرسید اہل مدنی اس پر رشک کرتے تھے۔

ہر چند کہ تصنیفات آپ کی کثیر ہیں مگر ہم آپ کی مشہور کتب پر اکتفاء کرتے ہیں جو زیادہ مشہور اور متعدد مرتبہ چھپ چھپ کر مقبول خلائق ہو چکی ہیں سیرت نامہ مسطور دوم و شام الفاروق۔ الغزالی۔ النعمان۔ المأمون۔ الکلام۔ التجزیر۔ تاریخ الاسلام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آدراگ زیب۔ موازنہ انیس و دہیر۔ شعراجم پانچ جلدوں پر منقسم جو آپ کی آخر اور بہترین تصنیف سیرۃ النبی ہے جس کو ناتمام چھوڑا جس قدر لکھی گئی ہے وہ قابل دیدار و خراج تحسین سے برتر و بالا ہے اس کو چار جلد میں تمام کر لے کا ارادہ تھا جو پورا نہ کر سکے اب اس کی تکمیل مولوی سلیمان ندوی کر رہے ہیں جو ایک ممتاز اور متبحر عالم ہیں۔

# شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ صبادہلوی

(۶)

وفات ، نومبر ۱۹۱۷ء

پیدائش ۱۸۳۳ء

آپ ۱۸۳۳ء میں دہلی کوچہ بھائی بیگم میں پیدا ہوئے بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج کے ڈرینٹیل ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو کر ۶ سال تک تعلیم پاتے رہے اس زمانہ میں آپ نے کئی وظائف اور ہائی پروفیشن کے دوست بھی حاصل کیے ۱۸۵۷ء میں دہلی کالج میں ریاضی کے مدرس مقرر ہوئے۔ اگرچہ کالج میں بھی کچھ عرصہ معلم رہے اور وقت سالہ درس و تدریس کے مشغلہ کے بعد ۱۸۵۷ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کا عہدہ حاصل کیا۔ ۱۱ سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ ۱۸۶۹ء میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور تین سال تک اس پر مامور رہ کر آدرینٹیل کالج کے پرنسپل مقرر کئے گئے چند دنوں کے بعد میونسٹرل کالج آہ آباد میں ورنیکولر سائنس اینڈ ٹریچر کے پروفیسر بنائے گئے۔ یہاں آسٹریس سے لیکر ایم۔ اے کلاس تک عربی۔ فارسی کا درس دیتے رہے اور ۱۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۴ء میں اپنی خوشی سے پشٹن لیکچر فیلوشپ ہو گئے ۲۴ سال تک آپ نے صوبہ پنجاب و ضلع مغربی و شمالی کے سرستہ تعلیم میں اپنی خدمات با حق الوجود انجام دیں۔ نومبر ۱۹۱۷ء کو اسی برس کی عمر میں اس جہانِ ناپائدار سے رحلت کی۔

۱۹ برس کی عمر سے مرحوم کو تراجم، تالیفات، تصنیفات اور مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا جو آخر وقت تک جاری رہا۔ علوم ریاضیہ و طبیعیات میں آپ کو خاص دستگاہ حاصل

تھی۔ علم حساب، الجبر، سیات، الکلیات، و علم مثلث مستوی، و گردنی علم ہندسہ اقلیدس  
 علم ساحت، علم ہندسہ بالجبر و تراشہائے مخروطی، علم جبر و مقامہ، علم حساب وغیرہ آپ کا  
 مجموعہ تصانیف ۲۱ کی تعداد تک پہنچتا ہے۔ یہ کتب کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔  
 نیچرل سائنس یعنی علوم طبیعیات میں ۱۲ علم جغرافیہ میں ۳ علم تاریخ میں ایک مکمل تاریخ  
 ہندوستان کی ہے جس کی دس جلدیں ہیں۔ ایک مکمل تاریخ ہندو انگلشیہ کی ہے جو پانچ  
 جلدوں پر منقسم ہے۔ عمدہ ہندو کی تاریخ صرف ایک جلد میں ختم کی ہے۔ علم اخلاق و اردو  
 علم ادب میں ۲۲ کتابیں لکھی ہیں۔ غرضیکہ مطبوعہ کتب کی تعداد ۱۶۰ ہوں کتابوں کی  
 ضخامت ساٹھ ہزار صفحات سے زائد ہوگی کتب ریاضی کے حصہ میں پندرہ سو روپے  
 انعام اور خان بہادر اور شمس العلماء کے دو خطاب گورنمنٹ عالیہ سے عطا ہوئے  
 لارڈ لٹارٹھ برڈک کے عہد میں گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ: ”اگر مولانا صاحب مثل ریاضی  
 کے دیگر علوم میں بھی اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھیں تو ان کو انعامات و خطابات  
 عطا کئے جائیں“ آپ نے اردو زبان پر بڑا احسان کیا ہے اردو کی تاریخ میں مولانا کا  
 نام سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ طرز تحریر نہایت سادہ و فصاحت ہو۔



# مولوی عبدالحکیم صاحب تشریفاتی لکھنؤی

پیدائش ۱۸۶۰ء

(۷)

وفات دسمبر ۱۹۲۶ء

آپ ۱۸۶۰ء میں دارالاسنٹ لکھنؤ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد حکیم تفضل حسین صاحب عربی و فارسی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اور داتا گلی شاہ کے یہاں ایک ممتاز خدمت پر مامور تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ کو اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے اور حافظہ الہی بخش صاحب سے قرآن مجید ختم کرایا اور کچھ ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ ملا باقر صاحب سے صرف و نحو سیکھا اور مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی سے منطق و فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور اسی زمانہ میں علم مغربی کی بھی تعلیم پائی۔ حکیم محمد مسیح صاحب سے طب پڑھی اور چندے مطلب بھی کیا اس کے بعد مولوی محمد یحییٰ صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب سے متوسطات معقول پڑھیں ۱۸۷۵ء میں آپ لکھنؤ آئے اور مولانا عبدالحی صاحب سے کتب درسیہ کی تکمیل کی اور مفتی میر تقیاس صاحب سے عربی علم ادب پڑھا۔ ۱۸۹۹ء میں آپ دہلی آئے اور مولوی نذیر حسین صاحب سے صحاح ستہ اور موطا امام مالک اور تفسیر جلالین تمام کر کے لکھنؤ آئے اور نظم طباطبائی صاحب سے شاعری میں شرف تلمذ حاصل کیا ۱۸۷۵ء میں آپ آدھ اخبار کے اسسٹنٹ ادیٹر مقرر ہوئے اور اپنی ادارت سے ایک ہفتہ وار رسالہ محشر نکالا۔ آدھ اخبار سے قطع تعلقی کر کے آپ نے ایک مادل لکھا جو مقبول عام ہوا۔ جنوری ۱۸۷۵ء میں آپ نے دلگداز جاری کیا جو آپ کے مرتے دم تک جاری رہا۔ ۱۸۷۵ء میں آپ دکن تشریف لے گئے۔ نواب وقار الامراء بہادر معین المہام مال نے اپنی ریاست سے دو سو روپیہ ماموار کا وظیفہ مقرر کیا۔ آپ نے

دکن کے قیام میں تاریخ سندھ لکھی جس پر پانچ ہزار روپے نواب وقار الامرا بہادر  
 نے ازراہ قدر دانی عطا کئے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نواب وقار الامرا کے صاحبزادے  
 نواب ولی الدین خاں بہادر کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے اور انگلستان ڈیڑھ  
 سال مقیم رہے۔ اس دوران قیام میں آپ نے فرانسیسی زبان سیکھی اور اس پر اتنا عبور  
 حاصل کیا کہ فرینچ زبان کی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔ انگلستان کی واپسی کے چھ ماہ بعد  
 آپ دکن سے پھر لکھنؤ آئے اور آتے ہی ادبی خدمات میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء  
 میں آپ پھر دکن تشریف لے گئے اور وہاں اسٹنٹ ڈائریکٹر تعلیمات کے عہدہ  
 پر مامور کئے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور مولوی ظفر علی خاں ضا  
 بی۔ اے کے ہمراہ آپ بھی اپنی خدمات سے نیگ نامی کے ساتھ جبک دوش ہوئے اور  
 پھر لکھنؤ چلے آئے۔ نثر میں شاعرانہ تخیل کا اظہار کرنا تاریخی اور عاشقانہ خیالات کو پُرور  
 پیرایہ میں تحریر کرنا آپ کا فطری حصہ تھا۔ اردو ناول نویسی کے آغاز کا سہرا بھی  
 آپ ہی کے سر پہ۔ قدرتی مناظر کا فوٹو اس ادا سے دکھایا کہ سچان لہد آپ نے  
 انگریزی فرانسیسی، عربی کی تواریخ اور افسانوں کا اردو ترجمہ اپنی زبان میں اس  
 طرح ادا کیا ہے جو اپنی آپ ہی مثال ہو۔ آپ کی کثیر التعداد تصانیف آپ کی یادگار  
 ہیں۔ جن میں تاریخ سندھ۔ مصر قدیم۔ فلورنڈا۔ ماہ ملک۔ ایام عرب۔ فردوس ہیں  
 بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کو قوم اور ملک کی خدمت ہو کر ملک بقا کی طرف تشریف  
 لے گئے اپنے سلسلہ کی فاتحہ خوانی کے لئے لکھنؤ میں ایک تربت بطور یادگار  
 چھوڑی۔

# مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت محرم

(۸)

وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء

پیدائش وسط ۱۸۳۹ء

مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت مرحوم و مغفور وسط ۱۸۳۹ء میں بمقام رام پور ضلع سہارن پور پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب شیخ انصاری و سادات سے ملتا جڑتا ہے اپنے والد بزرگوار مولانا نیاز حسن صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور انھیں سے قرآن مجید حفظ کیا۔ آپ نے صغیر ہی کے زمانہ میں دطن کو خیر باد کہہ کر محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کی ذہانت، جدتِ خدائے تعالیٰ نے آپ کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی تحصیل علم اور فنِ سخن کا شوق بچپن ہی سے قدرت نے دلیت کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد محکمہ پولیس کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی اور تحصیل علم کا سلسلہ از سر نو جاری کیا اپنے امیوں مولانا عبدالحق صاحب سہارن پوری سے فارسی کی تعلیم کی اور پھر مولانا مولوی ابوالقاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے خرمین کمال سے عربی کی خوشہ چینی کی اسکے بعد دہلی پہنچے اور مولانا عبدالحق صاحب سے عربی کی تکمیل کی اور درمیانِ تحصیل ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی اسلہ ثلاثہ میں قدرتِ شعر گوئی حاصل تھی اور فنِ سخن میں فیضانِ ازل سے ہلندہ حاصل تھا حقیقت جو صاحب کمال ”الشعراء قلاہ مذاہن“ کے مصداق اپنی طبیعت میں خود جو ہرن رکھتے ہیں وہ دوسروں کے مشورہ سے عموماً مستغنی اور بے نیاز ہوئے ہیں تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے کچھ عرصہ میرٹھ قیام کیا اور پھر بسلسلہ سدریس دہلی تشریف لے گئے۔ فیکن صاحب جو انگریزی لٹریچر کے مشہور

الشاعر پرواز اور آواز انگریزی کے شاعر مانے گئے ہیں ایک اور دو انگریزی لغت کی ترتیب میں مصروف تھے وہ آپ کے محققانہ مشوروں سے بہت کچھ مستفید ہوئے اور آپ کی وسیع النظری سے لغت مرتب ہو گیا۔ اسکے بعد آپ اخبار کوہ نور لاہور کی اڈیٹری کے لئے منتخب ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وہاں سے آدودہ اخبار لکھنؤ میں بلائے گئے۔ چند سال بعد آپ دوبارہ میرٹھ تشریف لائے اور اپنا ذاتی اخبار شمع ہند اور رسالہ پرواز جاری کیا اور پھر تاحیات میرٹھ ہی میں نوطن اختیار کر کے ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ایک ماہ قبلائے آلام رہ کر ۸۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

”و خدا بخشد بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں“

حضرت مولانا کے تبحر علمی کا اندازہ سرسری نظر سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کے بلند پایہ و بیش بہا مضامین نظم و نثر و اخلاق، تاریخ، سائنس، ادب، سیاست وغیرہ۔ غرض ہر رنگ میں موجود ہیں، محققانہ تبصرہ و تنقید آپ کا سرمایہ امتیاز تھا۔ چنانچہ آپ نے خاقانی، بیدل، عرفی جیسے جلیل القدر شعراء فارسی اور مقبلی و حماسہ جیسے سخن دان عرب کے کلام کی بسوط و مدلل شرحیں لکھ کر کالمین فن سے خراج تحسین چلایا۔ نثر کے علاوہ نظم کے بھی آپ ایک مسلمہ الثبوت اور قادر الکلام اُستاد تسلیم کئے گئے۔ داغ، امیر، جلال، تسلیم وغیرہ کی صف میں آپ کا شمار تھا مگر کلام بہت آدق ہوتا تھا اور زباوہ تر حضرت غالب اور بیدل کے رنگ میں تغزل کا شوق تھا۔ قصیدہ غزل مرثیہ، سلام، رباعی، قطعہ، تاریخ وغیرہ غرض فنِ شعر کی کوئی صنف ایسی نہیں تھیں آپ کے طائر فکر کی بلند پروازیوں کا ثبوت نہ ملتا ہو۔ آپ نے طلباء الین۔ اے

بی۔ لے۔ ایم لے۔ کے اصرار سے قصائدِ مشکبئی و خاقانی و دیوانِ غالب و نکتاتِ بیدل  
کی شروع لکھیں جو اس وقت لکھا گیا ہے۔ کلیات ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ ادبی مضامین  
کا ذخیرہ پچاس ہزار صفحات سے زیادہ ہے۔ بھاشا میں آپ کی متعدد نظمیں موجود  
ہیں جن کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے۔

غرضیکہ مرحوم نے اپنے دل و دماغ سے کام لے کر اپنی قطرتی طبّاعی و سخنِ سنجی  
کا ہر تھک چھ ثبوت دیا ہے۔



# مولانا سید سجاد حمید صاحب یلکم

(۹)

مولانا سید سجاد حمید صاحب بی۔ اے، شرفائے نہٹو ر ضلع، بجنور کی ایک قابل قدر ہستی ہیں آپ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ علوم مشرقی فارسی و عربی کی تکمیل کے بعد آپ نے علوم مغربی کی تعلیم محمدن کالج علی گڑھ میں پائی اور ۱۹۰۶ء میں اہل آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا۔ آپ محمدن کالج کے اُن قابل فخر طلباء میں سے ہیں۔ جن پر نہ صرف کالج بلکہ قوم و ملک دونوں کو ناز ہو۔ تین سال تک آپ بغداد شریف میں مقیم رہے۔ بغداد شریف سے واپس آنے پر ٹیچر کلکٹری کی کرسی نے آپ سے رشتہ پائی۔ مسلم یونیورسٹی کے مشکلات اور پیچیدگیوں سے متاثر ہو کر آپ نے رخصت حاصل کی اور مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے۔ اور کئی سال تک اس خدمت کو بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور ۳۱ جنوری ۱۹۲۶ء کو بہت نیک نامی کے ساتھ اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ آپ کے قومی کارنامے اگر ایک طرف آپ کو ملک و قوم کا سچا ہی خواہ ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف آپ کی فلمی خدمات اور دماغی کارگزاری آپ کو ادبِ اردو کا ایک بے کوٹ، بے غرض اور بے لاگ سرپرست ظاہر کر رہی ہیں۔ آپ نے مالکِ اسلامیہ خصوصاً ٹرکی کی کئی مرتبہ سیاحت کی اور زبانِ ٹرکی کے لڑے بچے کو اردو میں منتقل کرنے کی غرض سے آپ ہر وقت منہمک رہتے ہیں، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبان پر آپ کی حذا داد ذہانت اور سامعی جمیلہ نے آپ کو

اس قابل کیا کہ آج آپ بھی فخر زمانہ کملانے کے مستحق ہیں۔ آپ کی قابلیت اور علمیت  
 اور اُسی کے ساتھ اجتہادِ رائے مسلم ہے۔ قومی سوز و گداز۔ عام ہمدردی۔ بے لوث  
 محبت۔ حقیقی خدمت۔ ایثارِ نفس۔ علم و دوستی۔ صاف گوئی۔ راستبازی قدرت  
 نے آپ میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ آپ کی انگریزی۔ عربی اور فارسی قابلیت مسلم ہے  
 آپ کی انگریزی اور ترکی زبان دالی کا اقرار یورپین اہل قلم کو بھی ہے آپ کی تصنیفات  
 سے پتا چلتا ہے کہ آپ کو مختلف ممالک کے قدیم و جدید علوم تاریخ و ادب پر کافی دسترس  
 حاصل ہے اور وہ لٹریچر میں جو جدت آپ نے اختیار کی ہے وہ مبالغہ بیان نہیں۔ قلعہ  
 معلیٰ کی بلگاتی زبان سُننا چاہو تو آپ کے مضامین اٹھا کر دیکھو وہی الفاظ، وہی محاورے  
 وہی لہجہ، وہی انداز تقریر، وہی وجد و باتیں، وہی فصاحت، وہی لطافت گویا  
 آپ اپنے کانوں سے کسی خاتون کو گفتگو کر لے ہوئے سُن رہے ہیں، یہی مکالموں کا حال ہے  
 اور یہ ناول نویس کے لئے بہت دشوار گزار منزل ہے فی زمانہ فسانہ نگاری کے جواہرات  
 کو جدید طرز کی دلکش آراء میں منسلک کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر رہا۔ آپ کی موجودہ ادبی  
 خدمات نے دنیا کے ادب میں ناموری و عظمت کے وہ جھنڈے گاڑ دیئے ہیں جس کی  
 نظیر نہیں ملتی۔ آپ کو اردو قصص اور ناولوں میں بہ اعتبارِ مبالغہ نسبتِ الفاظ و محاورہ  
 فصاحت و لطافت وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی زبان میں وہ ڈان کوئی زوٹ کو حاصل ہے  
 آپ کو شعر گوئی کا شوق ہے۔ لیکن آپ کی علمی عظمت کی کفالت آپ کی دوسری  
 تصانیف سے ہوتی ہے نہ کہ آپ کی چند متفرق نظموں سے، لیکن آپ کے شعرا  
 سے بختگی کلام اور رنگینی خیالات کا کافی ثبوت ملتا ہے اور جو شعر سوز و گداز  
 میں ڈوب کر کہا ہے اور اُس سے سننے والوں پر جو اثر پڑتا ہے اُس کے دل پر

زائل نہیں ہوتا۔ اس وقت آپ کی عمر باؤن سال کے لگ بھگ ہے۔ مگر کتب بینی کا  
 شوق اس وقت تک آپ کی طبیعت ثنائیہ بنا ہوا ہے۔ آپ کی تصانیف و تراجم میں  
 خیاستان، تحکایات و احتیاسات۔ جلال الدین خوارزم شاہ، التالمت بالخیر،  
 زہرا وغیرہ نے وہ شہرت حاصل کی جو جو فی زمانہ قابل رشک ہے، غرضکہ آپ کی  
 ذات اور باب علم و ادب کے لئے سرمایہ ناز و افتخار ہے۔





# خان بہادر سر شیخ عبدالقادر صاحب

(۱۰)

خان بہادر سر شیخ عبدالقادر صاحب کے: سہی، آئی، ای، ایم، ایل۔ وباریٹ لا  
 ۱۸۰۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ فتح الدین صاحب مرحوم  
 کنوڑ ضلع لاہور کے ایک معزز خاندان قانون گوشتخان سے تھے۔ آپ کی کئی پشتیں شامان  
 مغلیہ اور گورنمنٹ برطانیہ کے معزز عہدوں پر ممتاز رہی ہیں۔ آپ کی پیدائش کے  
 وقت آپ کے والد بزرگوار محکمہ مال لدھیانہ کے معزز عہدے پر مامور تھے۔ آپ اپنے  
 باپ کی اکلوتی اور بونہار ہستی ہیں۔ علوم مشرقی کی تعلیم و تربیت کے بعد آپ نے علوم مغربی  
 کی طرف توجہ کی۔ طالب علمی کے زمانے میں آپ نے بہت سے انعامات اور وظیفے حاصل  
 کئے۔ اسکول کی تعلیم سے جو وقت بچتا تھا اُس میں آپ نے اپنے والد بزرگوار سے فارسی  
 کی پوری پوری تکمیل کی۔ سولہ برس کی عمر میں آپ کے شفیق باپ کا سایہ آپ کے سر سے  
 اٹھ گیا۔ چونکہ آپ کا علمی ذوق و شوق فطرتی تھا۔ اسلئے آپ فوراً کرسچین کالج لاہور  
 میں داخل ہوئے اور مشہور اداویب ڈاکٹر اور جے۔ جی۔ ایونگ صاحبان سے تعلیم  
 حاصل کی۔ اس اثناء میں اردو ماہرین فن کی تصنیفات پر آپ نے انگریزی زبان  
 میں بہت کچھ تقریریں کیں جو ادبی دنیا میں بہت مقبول ہوئیں۔ ۱۸۵۹ء میں آپ نے  
 بی۔ اے کلاس کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی سے اول درجہ کی کامیابی کا تمغہ فیکٹ  
 حاصل کیا اور ادبی خدمات کے ذوق و شوق سے مجبور ہو کر ۱۸۵۹ء میں پانچ اخبار

آب زور کے نائب ایڈیٹر مقرر ہو گئے اور بلا معاوضہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے  
 ۱۸۹۸ء میں اخبار آب زور کی چیف ایڈیٹری کے ممتاز عہدے پر مقرر کئے گئے اور  
 ۱۹۰۳ء تک بڑی مستعدی و خوش اسلوبی سے اس ادبی خدمت کو انجام دیا۔ ۱۸۹۸ء  
 میں ایک ادبی کتاب ڈی نیو اسکول آف اردو لٹریچر آپ نے پبلک میں پیش کی اور وہ  
 یہاں تک مقبول ہوئی کہ ۱۹۲۱ء میں دوسرے شائع ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں آپ نے اپنی ادارت  
 سے مخزن جاری کیا اور اردو زبان کی صحیح خدمت کا بار اپنے ذمہ لیا۔ ۱۹۰۴ء  
 میں آپ نے اخبار آب زور سے قطع تعلق کیا اور بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض  
 سے انگلستان تشریف لے گئے۔ ۱۸۹۸ء میں آپ انگلستان سے واپس آئے۔ اس دوران  
 سفر میں آپ داد آبجائی نور و جی اور مٹر کو کھلے سے برابر تبادلہ خیالات کرتے رہے اور دو  
 مرتبہ فرانس تشریف لے گئے اور فرانسیسی زبان کو سیکھا اور تعطیل کے زمانہ میں بیرس  
 کوئرن - میلان - وینس - قسطنطنیہ - بوڈاپسٹ - وائنا اور برلن بطور سیاحت تشریف  
 لینگے اور دارالسلطنت کے حالات و واقعات مقام خلافت میں قلم بند کر کے اہل قلم کے سامنے  
 پیش کئے جس پر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے آپ کو بہت بڑا انعام پیش کیا گیا  
 انگلستان سے واپس آ کر دو سال تک دہلی میں بیرسٹری کی۔ اسکے بعد آپ لاہور تشریف لائے  
 اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۹ء تک آپ کو پنجاب گورنمنٹ نے سرکاری وکیل کے عہدے پر ممتاز  
 رکھا۔ ۱۹۱۹ء تک آپ نے مخزن کی خدمت کی۔ اور ۱۹۲۰ء تک مخزن کی آئیری ایڈیٹری  
 سے مخزن کو زینت بخشی۔ آپ کے دوران ایڈیٹری میں پنجاب مخزن شائع ہوا جس کا پہلا  
 دوسرا حصہ سرکاری نظام کے مدارس میں طلباء کو پڑھایا جاتا ہے جس میں مولانا محمد عظیم آبادی  
 نے مخزن کے ادبی مفہامین کا مجموعہ ترمیم اور ملٹری افسران کی تعلیم کے لئے پیش کیا جو مضبوط

۱۹۱۶ء میں آپ نے حکومت میں اردو کانفرنس کی صدارت کی۔ ۱۹۲۱ء کے آغاز میں آپ نے سرکاری دیکل کے عہدے کو خیر باد کہا اور لاہور بانی کورٹ میں بیرسٹری کا مشغلہ شروع کیا۔ ۱۹۲۱ء میں آپ عارضی جج ہائیکورٹ کے عہدے پر مقرر کئے گئے اور تین ماہ تک اس خدمت کو انجام دیا۔ ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کی درخواست پر اردو ماہرین بن کی تصنیفات پر مسلسل تقریریں کیں۔ ۱۹۲۴ء کے آخر میں آپ لیجلیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں کونسل کے صدر رٹھی ہو گئے اور اس سے قبل یہ عہدہ کسی ہندوستانی کو نہیں ملا۔ صرف آپ ہی کی ذات کو یہ فخر حاصل ہوا اور پھر آپ عارضی وزیر تعلیم بنائے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے ایما سے گورنمنٹ آف انڈیا نے لیگ آف نیشن کے ساؤتھ جیس میں ایک نامیدہ کی حیثیت سے آپ کو بھیجا اور دوسری مرتبہ آپ کو یورپ کی سیاحت کا موقع ملا۔ آپ نے میٹری کولیشن کے اوپر درجوں میں اردو تعلیم دینے کی پوری سعی کی اور پنجاب یونیورسٹی کے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں اردو ایک امیشنل سبجیکٹ ہو گئی اور آپ اسکے امتحان مقرر کئے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں یورپ کی واپسی پر آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی دہلی میں صدارت کی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ نے آل انڈیا محٹون ایجوکیشنل کانفرنس کی مدد اس میں صدارت کی۔ جون ۱۹۲۸ء میں گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری اور قومی خدمات کے صلہ میں آپ کو سر کا معزز خطاب عطا کیا۔

آپ کی علمی، ادبی، اور قومی کارگزاریوں کا بقیہ جدا گانہ مضمون کا محتاج ہے جو بطور بالا میں آپ کے حالات جو کچھ قلمبند کئے گئے ہیں وہ محض ایک خاکہ ہے۔ آپ کی ذات ہندوستان کے لئے مفتیات سے ہے اور آپ اعلیٰ درجہ کے ادیب اور مدبر ہیں اگر ہمارے گوش شنوا اور چشم بینا ہوں تو آپ سے بہت سے مفید سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔

## مولانا شعیب احمد صاحبِ ندرت

(۱۱)

مولانا شعیب احمد صاحبِ ندرت ذاتی فضائل وادمان سے قطع نظر کر کے نسباً بھی بہت ممتاز درجہ رکھنے والے ہیں آپ تبار مولانا سید احمد حسن صاحبِ شوکت مرحوم و مغفور کے بیٹے ہیں آپ وسط سلسلہ عیسٰی تمام میرٹھ پیدا ہوئے آپ نے اپنے والد مرحوم و مغفور سے فارسی کی تکمیل کی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں جناب مولانا قاری محمد اسحاق صاحب سے حاصل کی اور اسکے بعد تقریباً ڈیڑھ سال مدرسہ حسینیہ دہلی میں جناب مولانا مولوی عبد العلی صاحب سے اکتسابِ علم میں مصروف رہے وہاں سے واپس آکر مدرسہ توحیدیہ میرٹھ میں جناب مولانا حاجی محمد عبدالمومن صاحب دیوبندی کے سامنے دانوئے ادب تکمیل اور انھیں سے دستاویز فیضیت حاصل کی۔

ابتداء میں سچے ماہ تک آپ اپنے والد بزرگوار کے مشہور اخبار شمع ہند کے سب ڈیٹر رہے۔ سلسلہ میں ایک ادبی رسالہ (عندلیب) آپ کی ادارت میں میرٹھ سے جاری ہوا جو تین چار سال تک جاری رہا۔ اسکے بعد آپ نے ناصر الاخبار میرٹھ کی ادارت کئی سال تک کی۔ اسکے بعد مخزن، تنویر الشرق، شمس بنگالہ، آدیب، العصر وغیرہ ادبی رسائل کے صفحات آپ کے نادر مضامین نظم و نثر سے مزین ہوتے رہے۔ سلسلہ میں رسالہ نظارہ میرٹھ آپ کی نگرانی سے شائع ہوا اور ۱۹۱۹ء تک آپ نے نظارہ کی ادبی خدمت مسلسل انجام دی۔ اسکے بعد اپنا ذاتی اخبار آئینہ اگست ۱۹۲۳ء سے

شائع کیا جواب تک جاری ہے ۔

مولانا ندرت میں خدا و قابلیت کا ادھ موجود ہے آپ نے ادبی خدمات اس  
 مستعدی سے انجام دی ہیں جس کی نظیر محال کیا معنی ناممکن ہے صحافت میں آپ کا طرز  
 بحیثیت ممتاز و سنجیدگی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے ۔ آپ نے تجربے ، مشاہدے اور  
 معلومات کے تمام درجے بہ سہولت طے کئے ہیں جن پر عبور حاصل کرنا معمولی آدمی کے  
 حیطہ امکان سے باہر ہے ۔ آپ کی بلند نظر اور وسعت خیال کا ثبوت آپ کے کلام کے  
 ملتا ہے ۔ آپ کا کلام جذبات سے پُر ہوتا ہے گو اردو شاعری کو اس وقت زوال ہو مگر  
 آپ کے مؤثر اور دلکش اور پاکیزہ کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو زوال نہیں  
 نے زمانہ عروج کا کلام بھی بخوبی دیکھا ہے ۔ اسانذہ کے کلام کے آگے کان پکڑنا ہی مناسب ہے  
 مگر حقیقت کو چھوڑ کر انصاف سے پوچھئے تو مولانا ندرت کا کلام شعرائے متقدمین سے اگر  
 بازی نہیں لے گیا تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے ۔

# مرزا محمد رفیع صاحب سودا

(۱۲)

ولادت ۱۲۵ھ

وفات ۱۲۹۵ھ

آپ کے والد بزرگوار مرزا محمد شفیع صاحب کابل سے بسلسلہ تجارت ہندوستان آئے۔ یہاں کی دل بستگیوں نے وطن ماون کو پیٹنے نہ دیا۔ آپ کی ولادت ۱۲۵ھ میں عمل میں آئی۔ دہلی میں عربی۔ فارسی علوم کی کابل دستگاہ چل کی۔ اول تو سلیمان قلی خاں اور پھر شاہ حاتم کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا۔ سودا نے ایسی مقبولیت عامہ حاصل کی تھی کہ آج اس کی مثال فصیح الملک داغ مرحوم کے سوا کسی میں نہیں ملتی۔ سودا کی شہرت کا آدازہ اس قدر بلند ہوا کہ شاہ عالم بادشاہ نے انھیں مشورہ سخن کی عزت بخشی اور یہ منصب سودا کے لئے ایک زرین تاج تھا۔ مگر سودا معمولی سی بات پر بادشاہ سے ناخوش ہو گئے اور اس رنجش نے یہاں تک طول کھینچا کہ بادشاہ کی اُستادی سے بھی ہاتھ اٹھالیا۔ اس کے بعد نواب شجاع الدولہ نے آپ کو لکھنؤ طلب کیا مگر سودا کے دل میں دہلی کی دھچکیاں جاگزیں تھیں۔ اسے لکھنؤ جانا گوارہ نہ کیا۔ مگر دہلی کے زمانہ سے جن امراء کی قدردانی کے بھروسہ پر سفر لکھنؤ سے انکار کر دیا تھا وہ پیوند خاک ہو گئے۔ ایسی حالت میں مجبوراً سودا کو لکھنؤ جانا پڑا۔ وہاں نواب شجاع الدولہ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر بد نصیبی سے نواب شجاع الدولہ کی زندگی نے بھی فنا کی۔ آپ نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ اسی زمانہ میں مرزا فائز میمن سے مرزا سودا کی خوب چلی اور اشرف علی خاں نے اس باہمی چپقلش کو خوب جلدادی نتیجہ یہ

ہوا کہ مرزا قافرنے شیخ زادوں کو برسرِ پیکار کیا اُن مفسدوں نے موقع پا کر ایک دن  
 سودا کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور کہا کہ تم نے ہمارے استاد کی نسبت سخت کلمات  
 استعمال کئے۔ نواب سعادت علی خاں کی سواری ادھر سے گزری تو نواب نے یہ  
 حالت دیکھ کر سودا کو اپنے ساتھ لیا اور نواب آصف الدولہ کے پاس لائے اور  
 کہا کہ جس شخص کو داندِ مرحوم لکھنؤ بلانا چاہتے تھے اور وہ نہ آتا تھا۔ آج وہ یہاں  
 آ کر ذیلِ دُخوار ہو رہا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے ازراہِ قدر دانی اسی وقت  
 چھ ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور انعام و اکرام اس کے ماسوا عطا کئے اور  
 یہاں تک عزت بخشی کہ جلوتِ دُخوت میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مرزا سودا کی  
 تصانیف کی ایک مجمل تفصیل یہ ہے:-

دیوان فارسی - ۲۴ مثنویاں - دیوانِ ریختہ - جمرۃ الغافلین - مجموعہ مرثیاتیات تذکرہ  
 شعرائے اُردو - کلیاتِ سودا - نو لکھنؤ پریس میں طبع ہوئی تھیں - البتہ تذکرہ اس  
 وقت نایاب ہے۔ مرزا سودا پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن خانِ آرزو کے اصرار  
 سے ریختہ کہنے لگے تھے۔ مرزا سودا نے جو مثنویاں کہی تھیں اُن میں سے دو قدیم  
 طرز پر عاشقانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور باقی مختلف عنوان پر کہی تھیں، مثلاً  
 چھڑائی کی تعریف - سرودی کی ہجو - ہاتھی کی ہجو - سخیل کی ہجو وغیرہ وغیرہ صنعتِ نصیدہ  
 گوئی میں مرزا سودا نے وہ مرتبہ پایا جو اُن سے بیشتر کسی کو حاصل نہ ہوا تھا۔  
 ہجو میں سودا کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ غزلیات میں واہ اور آہ کا فرق ہے  
 یعنی سوز و گداز کے مضامین نہیں پائے جاتے۔

آخر مرزا سودا ۱۱۸۵ھ میں بمقام لکھنؤ ستر سال ادبی خدمت کر کے ہمیشہ

کے لئے رخصت ہو گئے۔ اُن کی رحلت کو آج سو اسو برس سے زیادہ گزر گئے، لیکن اپنے کمال کے باعث اب تک زندہ ہیں اور اُن کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اپنی یادگار تصانیف بے بہا کا کافی ذخیرہ چھوڑا۔





# میر محمد تقی صاحب تیسر

(۱۳)

وفات ۱۲۵۵ھ

پیدائش ۱۲۵۵ھ

میر محمد تقی میر اکبر آباد کے ایک شریف اور ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔  
 ۱۲۵۵ھ میں عالم وجود میں آئے۔ اپنے والد بزرگوار میر عبداللہ صاحب کے انتقال  
 کے بعد دلی آئے اور اپنے ماموں سراج الدین علیخان آکڑو کے دربار کمال میں رہ کر  
 پرورش پائی۔ اور عزت و ناموری کے مدارج و منازل طے کئے۔ فکر معاش نے اکبر آباد  
 سے دلی کھینچ بلایا، اس وقت دلی مشرقی علوم و فنون کا ایک عظیم الشان مرکز بنی  
 ہوئی تھی۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب، حضرت مظہر جان جاناں صاحب،  
 حضرت خواجہ ناصر صاحب عندلیب وغیرہ جیسے بزرگوں کے دم سے دلی کو بابا علوم  
 سمجھا رہا تھا۔ خواجہ درد کے والد بزرگوار خواجہ ناصر سے میر صاحب کے گہرے  
 تعلقات تھے۔ آپ خواجہ ناصر صاحب کے مشاعرہ میں شریک ہو کر خراج تحسین  
 حاصل کیا کرتے تھے۔ دلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ اہل کمال کا مرکز بن گیا تھا نواب آصف  
 الدولہ کی فیاضانہ قدردانیوں نے ماہرین فن کو وہاں کھینچ بلایا۔ سودا پہلے ہی  
 پوپنچ چکے تھے اب میر صاحب کے لئے بھی لکھنؤ کے سودا دوسری جگہ نہ تھی۔ مجبوراً  
 اپنی چھاتی پر پتھر رکھ کر ۱۲۹۵ھ ہجری میں لکھنؤ پوپنچ نواب آصف الدولہ نے  
 ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ میر صاحب فطرتاً  
 نہایت ہی ستغنی المزاج اور توکل پسند اور خود دار انسان تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ

ذو اب سعادت علی خان نے ایک چوہدرے کے ہاتھ خلعتِ سجائی اور ایک ہزار روپیہ عیوت کا  
 بھجوا دیا۔ لیکن میر صاحب نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں ہے۔ یہ خفگی  
 اس بات پر ہوئی کہ ایک معمولی آدمی کے ہاتھ اُنھیں خلعت کیوں بھیجا گیا۔ درحقیقت  
 خود داری اسی کا نام ہے۔ میر صاحب نے خواجہ میر درد کو آدھا اور میر سوز کو پون شاعر  
 مانا ہے۔ البتہ سوز اسی جیسے جامع اور باکمال شخص نے میر صاحب سے پورے شاعر ہونے  
 کی سند حاصل کر لی تھی۔ میر صاحب کی کلیات میں قصائد، غزلیات، رباعیات، قطعات  
 خمسے، ترجیع بند، واسوخت اور مثنویوں کا پورا ذخیرہ موجود ہے اور جملہ اصنافِ سخن چڑی  
 ہو۔ ان کے علاوہ نکات الشعراء خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جس میں میر صاحب نے اُردو  
 شاعروں کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اگرچہ قصائد بہت کم شائع ہوئے۔ لیکن جو کچھ بھی  
 ہیں وہ متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ قصائد کے بعد غزلیات کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جس طرح  
 فنِ منطق کا بانی بانی ارسطو کو مانا جاتا ہے۔ اسی طرح فنِ غزل گوئی کا پہلا استاد میر صاحب  
 کو تسلیم کیا گیا ہے۔ غزلیات میں اخلاق و نصائح دنیا کی بے ثباتی، تیرنگی، زمانہ اور انقلابات  
 زندگی وغیرہ کی تصویر نہایت سوز و گداز کے ساتھ کھینچی ہے۔ غزلوں کے بعد رباعیات  
 و قطعات اور پھر منقبت میں خمس و ترجیع بند ہیں جو میر صاحب کے لئے باعثِ فخر ہیں  
 رباعیات وغیرہ کے بعد واسوخت اور مثنویاں ہیں۔ واسوخت کے موجد خود میر صاحب  
 ہیں اور جو کچھ کہا ہو خوب کہا ہے۔ مثنویاں بہت ہیں۔ شعلہ عشق، دریائے عشق، ترکارِ فنا  
 خواب و خیال، معالمتِ عشق، علی قدر مراتب سب سے شہرت پائی ہے۔ ہجو میر صاحب نے  
 بہت کم کی ہے۔ تاریخ سے تمام کلیات معرا ہے۔ شاید میر صاحب کو اس سے مناسبت  
 نہ تھی۔ مدحیہ قصائد بھی میر صاحب کی تصانیف میں موجود نہیں جس سے ان کی خود داری

کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ باوجود لکھنؤ کی دھچپپیوں کے دلی کی یاد اُن کے دل سے محو نہیں  
 ہوئی، اور اکثر اشعار میں دلی اور دلی کے احباب کا تذکرہ کیا ہے۔ آخر نینٹو سال کی گردش  
 کے بعد ۱۲۲۵ھ میں میر صاحب کا انتقال ہوا۔

شیخ ناسخ مرحوم نے ماوہ تاریخ وفات ”و او یلا مرد شر شاعر اں“  
 سے نکالا ہے۔



# خواجہ میر صاحب درو

(۱۴)

پیدائش ۱۱۳۱ھ

وفات ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ

خواجہ میر نام درو تخلص زبان اردو کے چار مکتوبات میں سے ایک مکتبہ تھے۔ ۱۱۳۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ مادری خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے ملتا ہے خواجہ محمد ناصر صاحب عندلیب آپ کے والد بزرگوار شاہ گلشن سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ یہ خاندان پیری و مریدی کے سبب دلی میں نہایت با وقعت خیال کیا جاتا تھا آپ کا دیوان غزلیات، ترجیع بند اور رباعیوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو اخلاق اور عرفان میں ڈوبا ہوا ہے۔ بیجو سے بالکل پاک ہے۔ اکثر غزلیں ستودہ میر تقی کی رخصت و توفی میں لکھی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے معاصرین میں مساوات کا حق حاصل تھا۔ فارسی میں بھی ایک دیوان کہا ہے مگر وہ بھی مختصر ہے۔ اکثر غزلیں ۱۱ یا ۱۵ اشعار سے زیادہ نہیں کہیں۔ کلام میں سادگی و سنجیدگی اور متانت کے علاوہ عرفان و درد بھی ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے اگر میر کے زمانے کی زبان سننا چاہو تو خواجہ میر صاحب درو کا دیوان اٹھا کر دیکھ لو جو تیرد مرزا کی زبان ہو وہی آپ کی زبان ہے۔ میر تقی نے آپ کو آدھا شاعر مانا ہے۔

خواجہ صاحب نے ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ یوم جمعہ ۶۸ برس کی عمر میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ کئی مہریر نے آپ کی کیا خوب تاریخ لکھی ہے۔

”حیف دُنیا سے سدھارا دہ خُدا کا محبوب“

# سید انشاء اللہ خاں صاحب النشا

(۱۵)

آپ کے والد ماجد میر انشاء اللہ خاں صاحب صدر ہندوستان میں بخت اشرف سے آئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ خطہ کشمیر کے سادات صحیح نسب سے تھے۔ وہاں کسی زمانہ میں ستمزد سے آئے تھے۔ جنہوں نے امیر الامراء نواب ذوالفقار خاں کے عہد میں دہلی آکر سکونت اختیار کی اور رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہو کر دربار شاہی کے طبیب مقرر ہو گئے۔ سلطنت کی حالت دگرگوں ہونے سے آپ مرشد آباد چلے گئے۔ اور سید انشاء اللہ خاں انشاء وہیں پیدا ہوئے۔ جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امین زادے تعلیم پاتے تھے اسی طرح سید انشاء کو بھی فارسی و عربی کی پوری تعلیم دی گئی۔ قدرت نے آپ کے دل و دماغ میں وہ جو ہر عطا کئے تھے کہ باید و شاید۔

جب ہندوستان میں انقلاب برپا ہوا تو سید انشاء مرشد آباد سے دہلی آئے اور شاہ عالم بادشاہ نے آپ کو اپنے درباریوں کے حلقے میں داخل کر لیا۔ آپ لطائف و ظرائف سے گل نشانی کر کے محفل کو لٹا دیتے تھے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم کی جڈائی بھی ناگوار تھی۔ علامہ فضل حسین خاں کی سعی سے آپ لکھنؤ آئے اور نواب سعادت علی خاں صاحب کی مصاحبت اختیار کر کے ان سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ پھر نواب کو آپ کے سوا کسی کی بات میں مزاجی نہ آتا تھا۔ بہت سنگہ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ اور اپنی تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ

اپنی یادگار چھوڑا۔ ان میں سے ایک کلیات ہے۔ اس میں (۱) اُردو غزلوں کا دیوان  
 (۲) دیوان ریختی (۳) قصائد اُردو (۴) قصائد فارسی (۵) دیوان فارسی (۶) مثنوی  
 شیر برج فارسی (۷) مثنوی فارسی بے نقط (۸) شکار نامہ فارسی (۹) ہجویں (۱۰) مثنوی  
 عاشقانہ (۱۱) ہاتھی و مہنئی کی شادی (۱۲) متفرق اشعار، سبتے، رباعیات، فقطے فارسی  
 اُردو وغیرہ۔ تاریخیں، پہیلیاں، چیتانیں (۱۳) دیوان بے نقط (۱۴) مائتہ عامل  
 زبان عربی کی فارسی میں (۱۵) مرغ نامہ اُردو میں۔

(۲) دریائے لطافت قواعد اُردو، منطق، معانی بیان وغیرہ میں۔

(۳) ایک داستان نثر اُردو میں ایسی لکھی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی، فارسی کا

نہیں آنے دیا۔

سید انشاء فن انشاء کی قلمرو میں بادشاہ علی الاطلاق تھے اور اس اعتبار

سے انھیں اُردو کا امیر خسرو کہیں تو بے جا نہیں۔



# غلام بہدانی صاحب مصحفی

(۱۶)

غلام بہدانی نام مصحفی تخلص لدولی محمد امروہی کے باشندے تھے۔ عالم شباب میں وطن کو خیر باد کہہ کے دہلی آئے اور تفصیل علم میں مشغول ہوئے بچپن ہی سے عزت اور مسکینی اور ادب کی پابندی فطرتی طور پر طبیعت میں موجود تھی۔ اسی وجہ سے بزرگان دہلی سے ہم جلس ہوئے کافر حاصل ہو گیا۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں باریاب ہو کر ملازم ہو گئے۔ زبان فارسی اور ضرورتاً فن سے باخبر تھے اور نظم و نثر کی کتابوں کا مطالعہ کافی وقت تک کیا تھا۔ جس سے معلومات وسیع اور نظر بہت بلند ہو گئی تھی۔ محاورات قدیم میں میر سید سہروردی اور میر کا متبع کرتے تھے۔ سید انشا اور جبرأت کی نسبت دیرینہ سال تھے۔ سہراپاشن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آمانی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ آپ کے صد ہاشاگرد تھے۔ سید انشا، جبرأت، تمیر حسن وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ غرض جب تک زندہ رہے لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۲۸۵ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے آپ کی تصنیفات میں اردو کے سات دیوان ایہ نادر ہیں جن میں ہزار ہا غزلیں اور بہت سے قصیدے اور ابیات اور رباعیات اور معمولی تصنیفیں ہیں۔ وہ تذکرے شعرائے اردو کے۔ ایک تذکرہ فارسی کا ایک دیوان فارسی کا لکھا۔ آٹھویں دیوان میں سید انشا کے جملگئے زیادہ تعداد میں ہیں۔ اکثر غزلیں نہایت سنگلاخ

زمینوں میں کسی میں آپ کے کلام میں میر سوز کا انداز اور میر صاحب کی جھلک بھی پائی جاتی ہے  
 قصائد میں شوکتِ انفاظ، بلند پردازی، فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور ان کی درست  
 نشستیں موجود ہیں، البتہ بندشوں کی چستی اور جوش و خروش کی تاثیر خال خال ہے۔  
 واقعاتی تاریکیوں میں قدر لکھی ہیں خوب لکھی ہیں تمام کلام شوخی سے مبرا ہے جو کچھ کہا  
 ہے اصول سے ناپ کر اور قواعد سے نوا کر کہا ہے۔ ظریفانہ انداز بہت زیادہ قابل  
 تلاش ہے۔ فن سخن کو ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کا بہترین کلام نکل جاتا تھا  
 اور سب کلام بیچ جاتا تھا۔ طبیعت میں بہت روانی تھی ایک ہی زمین و قافیہ میں صد ہا شعر  
 کہتے تھے اور ان سے مالی فائدہ اٹھاتے تھے۔ بچوں میں قدر رکھی ہیں زیادہ تر سینہ  
 بہ سینہ چلی آتی ہیں۔ سید انشاء سے بہت کچھ معرکہ آرائی رہی ہے اور باہمی ہجو کا  
 بازار خوب گرم رہا ہے۔



# شیخ امام بخش صاحب ناسخ

(۱۶)

۳۲ آپ کے والد شیخ تھہ انجش لاہور کے باشندے تھے نبفشہ اور زعفران وغیرہ اشیاء قیمتی کا سبب دشمنی کی تجارت کرتے تھے بعض کہتے ہیں کہ اس دولتمند شیخ نے آپ کو مستنبی کیا تھا فیض آباد میں ان کی قسمت سے یہ ستارا چمکا کہ فلک نظم کا آفتاب ہوا اور اس دولتمند سوداگر شیخ خدا بخش نے اپنی فرزند میں لیکر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہو کر شیخ امام بخش ناسخ کہلائے اور اس مجازی باپ کی بدولت دنیوی ضروریات سے بے نیاز رہے۔ لکھنؤ کے دار الخلافہ ہو جانے کی خوشی میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور ٹکسال محلہ میں سکونت اختیار کر کے شعر و سخن کے کھوٹے کھرے مضامین کو برکھنا شروع کیا۔

حافظ دآرث علی لکھنؤی سے فارسی پڑھی اور علمائے فرنگی محل سے بقدر ضرورت عربی کی تعلیم پائی اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی۔ مگر زبور فن کی ضروریات باخبر تھے اور نظم سخن میں ان کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے مگر ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ باہر فن کی کجائی اور اہل کمال کی صحبتوں سے ان کی طبیعت خود بخود اصلاح پاتی رہی۔ رفتہ رفتہ خود اصلا میں دینے لگے بعض سرن رسیدہ اشخاص سوسا گیا ہو کہ ابتدا میں شیخ مصطفیٰ سے اصلاح لیتے تھے مگر کسی شعر پر ایسی تکرار ہوئی کہ ان سے مشورہ لینا پسند کر دیا اور تنہا و صاحب سے عالم تنہائی میں مشورت کرتے رہے۔ خدا داد سرمایہ کی بدولت کسی کی ملازمت اختیار نہ کی اور نہایت خوش حالی سے زندگی بسر کرتے رہے جب آپ پہلی مرتبہ آلہ آباد محلہ دائرہ شاہ جہل میں آئے تو راجہ چند دلال نے بارہ ہزار روپے

بھیج کر بلانا چاہا آپ نے لکھ بھیجا کہ اب میں نے سیدہ کا دامن پکڑا ہے اسے نہیں چھو سکتا  
یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا۔ راجہ موصوف نے پھر ہندوہ ہزار روپے بھیج کر  
آپ کو بلایا اور وعدہ کیا کہ میں ملک الشعراء کا خطاب بھی دلاؤں گا اور دربار کی عاضری  
سے مستثنیٰ کر دوں گا۔ مگر آپ کی آزاد طبیعت نے منظور نہ کیا۔ آپ کو ریاضت کا بہت شوق  
تھا۔ دیباہی ڈیل ڈول بھی رکھتے تھے۔ بلند وبالا فراخ سینہ۔ منڈا ہوا سر۔ کھاروے کا  
لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ جاڑے میں تن زیب کا کرتہ بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھنیٹ  
کا دوسرا کرتہ پہن لیا۔ دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے اور اس میں کئی کئی دلت  
کی کسر نکال لیتے تھے۔ آپ کے تین دیوان ہیں مگر دو مشہور ہیں۔ مدح بہت کم کی ہو اور  
ہجو سے ہمیشہ اپنے دامن کو پاک رکھا۔ ایک طنزی حدیث مفصل کا ترجمہ ہے میر علی ایسٹرننگ  
نے اسے ترتیب دیا ہے۔ ایک مثنوی و شریف بھی آپ کی تصنیف سے ہے۔ آپ کا کلام ظاہری  
عبیوں اور لفظی سقموں سے بہت پاک ہے۔ غزلوں میں شوکت اللفاظ۔ بلند پروازی اور  
نادک خیالی بہت ہے۔ صاحب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی روش میں ترتیب دے کر ایسا  
کمال کیا ہے کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصرخانی کی حد تک پہنچ گئے۔ دیوان کے آخر میں  
بہت سی عمدہ تاریخیں ہیں سنہ ۱۱۵۰ھ میں فوت ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۶۴-۶۵ برس  
کی عمر تھی مگر زخمی نکلے تھے کہ تقریباً سو برس کی عمر ہوگی۔

# خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق دہلوی

(۱۸)

پیدائش ارزی الحجہ ۱۲۰۴ھ وفات ۲۴ صفر ۱۲۶۱ھ

حضرت ذوق کے والد شیخ محمد رمضان دلی کے ایک غریب سپاہی تھے۔ کاتبی دروازہ میں رہتے تھے۔ ارزی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو ذوق نے اس دنیا میں قدم رکھا حافظ غلام رسول صاحب شوق کے آگے زانوئے ادب تکیا۔ فارسی و عربی وغیرہ میں انھیں سے دستگاہ حاصل کی۔ جب شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا تو ابتر اند خود ہی کچھ موزوں کر لیتے تھے۔ مگر کسی کو دکھاتے نہ تھے جب کچھ جھجک کم ہوئی تو حضرت شوق ممدوح سے اصلاح لینے لگے۔ مگر ان سے کچھ تسکین خاطر نہ ہوئی تو یہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ فی الحقیقت شاہ نصیر کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنے کے بعد انھیں وہ عزت و توق حاصل ہوئی جو آج تک ان کے نام سے وابستہ چلی آتی ہے۔ شاہ نصیر شاعری میں بہادر شاہ دلی عہد کے استاد تھے لیکن جب وہ دکن چلے گئے تو یہ خدمت میر کاظم حسین بیکر دہلوی کے سپرد ہوئی۔ میر بیکر ار، ذوق کے ہم کتب اور خواجہ تاش کے بھائی تھے۔ میر کاظم حسین کو مسٹر جان افغسن کے میر منشی ہونے کے بعد قلعہ کے تعلقات سے مجبوراً کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔ شاہ نصیر پہلے ہی دکن چلے گئے تھے اب بہادر شاہ کی غزلیں کون دیکھ سکتا تھا آخر ذوق پر ہی نظر انتخاب پڑی۔ بہادر شاہ کے استاد ہو جانے سے ذوق کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور بڑا فروغ پایا لیکن مالی نفع زیادہ نہ تھا صرف چار روپے ماہوار ملتے تھے جو ان کی خورد و نوش کے لئے ناکافی تھے۔ مگر مولف

اِس پر اعتراض ہے۔ اگرچہ اُس زمانے کے چار روپے آج کل کے پچیس روپے کے مساوی ہیں تاہم اُس تندر شاہ کے لئے اتنی قلیل تنخواہ مغلیہ خاندان کی فیاضیوں کے دامن پر ایک دھبہ ہے۔ بہر حال عیدین اور دوسری تقاریب پر تہنیتیں، قصیدے پیش کرنے پر خطابات، خلعت۔ جاگیر اور دیگر قسم کے انعامات سے ذوق کی اُس کمی تنخواہ کی پوری پوری تلافی اور بہت افزائی ہو جاتی تھی۔ ذوق کے فرزند خلیفہ شیخ اسماعیل باغات شاہی کے محافظ تھے اور بہادر شاہ کے دربار میں اُن کی خاصی و نفعت تھی۔ ذوق کی عمر ۱۷ سال کی تھی کہ مرزا ابوظفر بہادر شاہ کے ہاتھ میں عثمان حکومت آئی۔ ذوق نے ایک قصیدہ مدحیہ پیش کیا جس پر تنخواہ میں اضافہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد بہادر شاہ کے غسلِ صحت پانے پر آپ نے ایک قصیدہ پیش کیا جس پر بہادر شاہ نے خطاب خان بہادر کے علاوہ ایک خلعت اور ایک ہاتھی مع حوضہ نقری عطا کیا اس کے بعد ایک قصیدہ اور پیش کیا جس کے صلہ میں بہادر شاہ نے ایک گائیکوں جاگیر میں عطا فرمایا۔

صفر ۱۰۲۷ھ کی ۲۴ تاریخ اور جمعرات کا دن تھا کہ اس فرماں روا سے ملک سخن نے ۱۷ دن بیمار رہ کر اس عالمِ فانی سے ملک جادوانی کی طرف رحلت کی۔ ذوق کے علمی و ادبی کارنامے ایسے ہیں کہ اُن کا نام قیامت تک زندہ رکھیں گے۔ خصوصاً قصائد کے میدان میں توجہ دہائی گاؤں دیاسی۔ مرنے سے کچھ روز پیشتر یہ شعر کہا تھا

”کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا  
کیا نب آدھی تھا خُدا منفرت کرے“

ابتدائی تعلیم تو جیسی کچھ ہوئی تھی وہ چنداں قابلِ تذکرہ نہیں لیکن انھیں تحصیلِ علوم و فنون کا بے حد شوق تھا چنانچہ اپنی ہی کوشش سے انھوں نے مروجہ اُس مثنوی کی تحصیل تکمیل کی تاریخ۔ تفسیر۔ لفظوں۔ موسیقی۔ نجوم۔ رمل۔ ان سب میں ذوق نے

ہمارے نامہ اور واقفیت کا ملہ حاصل کی تھی، لیکن ۳۶ سال کی عمر میں تمام ”منہیات“ سے توجہ منقطع کی اور اس توبہ کی تائید کئی عرصے  
 ”اے ذوقِ بگوسہ بار توبہ“

شاعرے میں شاہِ نصیر کے ایما سے ذوق کے کلام کی گرفت ہوتی تھی مگر ذوقِ بندہ  
 شکر جواب سے معترضین کا منہ بند کر دیتے تھے۔ شاہِ نصیر و ذوق کے جھگڑوں کی تفصیل  
 ”آبِ حیات“ میں موجود ہے۔

حق یہ ہے کہ ذوق کا کلام بہ اعتبارِ مشائی و طباعی آپ ہی اپنی نظیر ہو۔ چنگیزی و خیال  
 منزلتِ کلام۔ صفائی زبان۔ غرض ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ شاہِ نصیر ذوق کے استاد  
 تھے اور شاگرد کا استاد کا ہمعصر ہو جانا بھی کچھ کم فخر کی بات نہیں۔

# نجم الدولہ دبیر الملک منہاسی صاحب غائبی

(۱۹)

تاریخ پیدائش ۸ رجب المرجب ۱۲۱۰ھ  
 تاریخ وفات ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ  
 آپ ۸ ماہ رجب المرجب ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک قوم کے ایک ترک تھے  
 اور ان کو سلسلہ نسب تو راہن فرید دل تک پہنچتا ہے۔ سنی قیوں کے ان نزاع کے  
 بعد ان کے جد امجد ہندوستان آئے شاہ عالم کا زمانہ تھا اور سلطنت کا شیرازہ  
 بکھرا تھا آپ کو ایک فوجی عہدہ پر مامور کیا گیا۔ جب سلطنت کا آفتاب ڈھلنے لگا تو  
 غالب کے والد بزرگوار مرزا عبداللہ بیگ تلاش مہاش میں گھسوا آئے اور آصفیہ الدولہ  
 کے خزانہ میں پرچہ عرصہ تک ریزہ چینی کرتے رہے وہاں سے زمانہ نواب نظام علی خاں  
 حیدر آباد کو کن مرجعت کی یہاں بھی فوجی خدمت فوری مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد دکن سے  
 آگرہ چلے آئے اور راجہ پنجا در سنگھ دالی اور نے اپنے یہاں فوجی خدمت پر مامور  
 کیا اور وہیں ایک معرکہ میں کام آگئے۔ راجہ گروہ میں مدفون ہوئے۔ اس وقت غالب  
 کی عمر پانچ سال کی تھی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر غالب کی غورہ پر دافت  
 اُن کے چچا نصر اللہ بیگ نے کی تاہم ایک کے زمانہ میں اُن کے چچا سرکاری  
 فوج کے رسالدار تھے۔ فوجی خدمات کے صنف میں ان کو ضلع آگرہ میں دو پرگنہ سٹے  
 جن کے محاصل سے خوشحالی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ عالم بلوغ تک  
 غالب آگرہ میں مقیم رہے۔ ۱۲۲۰ھ میں جب ۱۲ سال کے ہوئے تو ان کی شادی نواب  
 مرزا الہی بخش معرٹ کی صاحبزادی کے ساتھ ہو گئی اور اس طرح ان دور و عمل

کے باہم منسلک ہونے سے غالب کی آمد و رفت کا سلسلہ دہلی ہو گیا اور آخر کار مستقل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ دہلی کو اس وقت مٹ چکی تھی مگر سسزل کی محبت اور نئے اغراض کی کشش کے علاوہ ایک بات غالب کو دہلی کھینچ لائی کہ ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ کو فن شعر سے خاص دلچسپی تھی اور اُس نے باکمال شعراء کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا جب تک ذوق زندہ رہے۔ ظفر کو اصلاح دیتے رہے ان کے انتقال کے بعد یہ عزت غالب کو نصیب ہوئی۔ چنانچہ ۱۱۶۱ھ میں بادشاہ نے انھیں تجسم الاموال و بصر الممالک، نظام جنگ کے خطاب اور چھ پارچہ خلعت سے سرفراز فرمایا۔ خانہ دان تیموریہ کی تاریخ مرتب کرنے کا اہم کام ان کے سپرد کیا گیا اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ بطور وظیفہ مقرر ہو گئے اور خاص خاص موقعوں پر بادشاہ کی جانب سے ہدایہ اور تحائف آیا کرتے تھے مگر گردش زمانہ سے بسا اوقات غالب کو وقت پر کبھی وظیفہ نہیں ملتا تھا۔ دو سال تک بہت تکلیف سے لسبر کی پھر رام پور کے علم دوست اور سخنی پرورد نواب یوسف علی خاں مرحوم نے حق استادی کے معاوضہ میں ان کا سو روپے مشاہرہ کا استمراری وظیفہ مقرر کر دیا جو ان کے دم واپس تک بدستور جاری رہا۔ نواب یوسف علی خاں مغفور دلی رام پور کے انتقال کے بعد جب مرزا غالب رام پور تشریف لے گئے تو نواب کلث علی خاں نے بھی ان پر خاص عنایت فرمائی اور سابقہ وظیفہ بدستور بحال رکھا۔ سرکاری پشن سات سو روپیہ سالانہ جو ہز ماہِ غدِ تین سال تک بند ہو گئی تھی پھر جاری ہو گئی اور یہ دونوں رقمیں غالب کی متوسط زندگی لسبر کرنے کے لئے کافی تھیں۔ فخر کے بعد جب انھیں فائدہ کشی کی لذت پہنچی تو ان کی خبر گیری ان کے ہندو احباب و تلامذہ کرتے تھے۔ منشی ہر گوپال لکھنؤ صیت سے مرزا غالب کے ساتھ ملوک ہوتے تھے

غالب کے سات بچے ہوئے مگر سب دارغ مفارقت دیا۔ زین العابدین عارف "جو ان کی بہوی کے رشتہ سے بھانجے ہوتے تھے" ان کو غالب اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے عین غنفوان شباب میں گزر گئے اس صدمہ جاں کا وہ سے غالب بہت ہی نحیف و لاغر ہو گئے یہاں تک کہ چلتا پھرنا دشوار ہو گیا۔ ہر وقت پلنگ پر لیٹے رہتے تھے۔ مرنے سے قبل یہ شعر در زبان تھا

دم داپسین بر سرِ راہ ہے      غمِ یزداد اللہ ہی اللہ ہے

آخر میں مصائب سے نجات پانے کا وقت بھی آگیا اور ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۱۸۶۹ء کو اس دارِ ناپائیدار سے ۶۳ برس ۴ ماہ کی عمر میں راہی ملک جادو دانی ہوئے۔ اور حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ کی درگاہ میں بہنیکے لئے آرام فرمایا۔ وہ آہ غالب بہ مرد، مادہ تاریخ و فائنات ہے۔

پچھلے دنوں غالب کا مرزا پرورد خاں ہونے کو تھا لو اب احمد سعید خان صاحب طالب نے اس کی از سر نو مرتب کرائی اور غالب کی یادگار کو تعمیر کی صورت میں قائم رکھا ہندوستان میں امیر خسرو فیضی کے بعد فارسی کلام میں غالب ہی کا مرتبہ تھا ۱۲۹۹ء میں آپ کا اردو دیوان مرتب ہو کر شائع ہوا۔ نشر میں آپ کے رقعات کے دو مجموعے یادگار زمانہ میں۔ ایک خود ہندی۔ دوسرا اردو کے معنی۔ غالب کو جو عبور و قدرت فارسی زبان پڑھتی اُسی کی جھلک ان کے ابتدائی کلام میں پائی جاتی تھی۔ الغرض غالب نے تاریخِ اردو میں اپنی عظمت و شہرت کے وہ پائیدار نقوش چھوڑے ہیں۔ جو آنے والی نسلیں کو غالب کی ضرورت نشانی سے باخبر کرتے رہیں گے۔



# مرزا سلامت علی صاحب دبیر

(۲۰)

پیدائش ۱۲۲۳ء      وفات ۲۹ محرم ۱۲۹۲ء

مرزا سلامت علی دبیر کو ۱۲۲۳ء نے آغوش ہستی میں لیا۔ آپ خاندانی شاعر تھے تحصیل علوم عربی و فارسی سے انفرادی کامل حاصل کر کے آپ کو ابتدا میں مرثیہ خوانی کا شوق پیدا ہوا اور اس فن کو عرش معلیٰ پر پہنچا دیا۔ آپ میر مظفر حسین ضمیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور اس فن کی پوری تکمیل کرنے کے بعد یہاں تک شہرت حاصل کی کہ میرہ ضمیر کو آپ کی خدا داد ذہانت پر رشک پیدا ہوا۔ مزید براں آپ کی سلامت روی - برہنگاری، مسافر نوازی، سخاوت، منکسر المزاجی نے اس قدر مقبولیت عاتقہ حاصل کی تھی کہ جس کے اظہار کے لئے الفاظ میسر نہیں ہو سکے۔ مضامین کی بلاغت - غم انگیز اشارات - دلگداز انداز اور مناظر قدرت کے ساتھ مضمون آفرینی و استعارات کا جوہر دکھانا اور اس رنگ میں اپنے استاد کا متبع کرنا - جھنجھکا عالم - گرمی کی شدت - فوجوں کی آمد - جنگ کی تیاری گرمی سے بچنے کی تدابیر - فوجوں کا داخلہ - میدان جنگ ہنگامہ رزم - فوج کی صف آرائی - دھڑکیوں کی ہر آواز مائی - فنون جنگ، گھوڑوں کی تعریف - تلوار کی تعریف - نفرت دنیا - محبت عقبی اور کسی مرثیہ کی ابتداء میں تمام ہمارے ہوں کا شہید ہونا - اور اس کے بعد عمر یوں کا یکے بعد دیگرے فنا ہونا - بچوں کا جام شہادت پینا - پھر امام عالی مقام کا رن کی اجازت کے واسطے خیمہ میں آنا ان واقعات کو آپ نے بلاغت و شوکتِ الفاظ کے ساتھ نہایت درخشاں طرز میں نظم کیا ہے

مرزا دیر نے اگر جنگ شب عاشورہ کا جگر خراش واقعہ یا رد انصار کا دہتر تک قتل ہوتے  
 رہتے۔ پھر حضرت علی احمدؒ کا شہید ہونا۔ اور خصوصاً حضرت یانوکا بین تو نہایت ہی  
 دردناک طور پر نظم کیا ہے۔ آپ نے ۲۲ سال کی عمر میں کم از کم تین ہزار مرثیے لکھے  
 ہونگے۔ سلاموں۔ اور نوحوں، اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔

۲۹۲ مجرم شاہ کو آپ کی روح لطیف نے جسم خاکی سے مفارقت اختیار کی  
 علماء کرام اور عائدہ شہر آبجی تجنیز و تکفین میں شریک تھے۔ اس وقت مرزا دیر ہماری  
 آنکھوں سے پنہاں ہیں مگر وہ ایسی یادگار چھوڑ گئے ہیں جو قیامت تک ان کے نام کو  
 زندہ رکھے گی۔

# میر بر علی صاحب انیس

(۲۱)

پیدائش ۱۲۱۵ء وفات ۱۲۹۱ء  
 میر بر علی انیس کے والد بزرگوار میر حسن خلیق اور جد اعلیٰ میر حسن دہلوی تھے۔ میر حسن دہلوی کے والد میر خاں اور جد امجد میر تاجی ہر دی تومتہ اللہ علیہ تھے۔ جو بہرات سے آکر پرائی دتی میں آباد ہوئے تھے۔ ۱۲۱۶ء میں آپ بمقام فیض آباد پردہ عدم سے عالم وجود میں تشریف لائے۔ لکھنؤ میں تربیت پائی اور عربی و فارسی میں دست نگاہ کامل حاصل کرنے کے بعد ضروریات فن میں اپنے شفیق باپ سے مشورہ کیا اور انھیں سے خاندانی کمال حاصل کیا۔ ابتدا میں آپ کو غزل گوئی کا شوق تھا مگر اپنے والد بزرگوار کی نصیحت سے انہیں پرہیز کر غزل گوئی کو سلام کیا اور اس صفت سخن پر توجہ فرمائی جو دین و دنیا میں کام آنے والا سرمایہ ہو۔ میر انیس کے دو بھائی اور تین بہنوں آپ میر غنی انیس، میر حسن لاہور تھے اور میر بر علی انیس کے فرزند میر وحید اپنے وقت کے استاد اور فخر سلف تھے۔

میر انیس کے تین صاحبزادے تھے۔ میر خورشید علی نفیس، میر محمد سلیم، میر عسکری رئیس بن دسال کے علاوہ فن کے اعتبار سے بھی میر انیس اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھے آپ کے مرثیہ کو بلا استیجاب دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا کافی ہو کہ آپ نے اپنے قابل فخر بزرگوں کا نام اچھی طرح روشن کیا ہو۔ گویا ابھی تک مرثیہ گوئی آپ کے خاندان کا مذہبی

تذکرہ ہی۔ آپ کا اندازہ میان نہایت مستحکم تھا ہوا۔ تعقید سے مبرا سلاست فصاحت  
 حسن محاورات سے لبریز اور اس درجہ بقبولیت عامہ حاصل کر چکا ہے جو مرزا دبیر کو میسر نہیں ہوا  
 مناظر قدرت کی تھوہیر کھینچنا آپ کا حصہ تھا۔ صبح کا عالم سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور  
 آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام کی آمد اسی شب کی رحمت کا سماں۔ رات کا  
 ستائنا۔ تاروں کی چھانوں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے  
 دکھانا۔ گرمی کی تیزی۔ اس میں بوڑوں کا چلنا۔ خاک اڑنا۔ طہر کا وقت۔ فوجوں کا  
 امنڈنا۔ رزمیہ منظر اور اس میں معرکہ کا زور و شور۔ تلاطم۔ ہنگامہ کے ساتھ ہل چل  
 شور و غل۔ نقاروں کی صدا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز۔ ہتھیاروں کی جھنکار۔  
 دیواروں کی چپک دمک۔ تیردوں کی سن سنابٹ۔ لکانون کا پچکنا۔ یغیوں کا گر جنا  
 پھر بہادریوں کا استقلال کے ساتھ جنگ میں جانا۔ باہم معرکہ آرائی کرنا۔ فنون جنگ  
 دکھانا اور اسکے ساتھ اسلحہ جنگ اور دیگر سامان جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچنا۔ اور  
 پھر فتح و شکست کی دو متضاد صورتیں بیان کرنا اور پھر اس صورت سے بیان کرنا  
 کہ سنسنے والوں کا دل ہلجائے اور اُن کو معلوم ہو کہ گویا ہم معرکہ جنگ میں خود شریک  
 ہو کر یہ واقعات چشم خود دیکھ رہے ہیں۔

غرض کہ میر انیس طرح آل رسول ہونے کی حیثیت سے شاعری میں وہ ناموری و  
 عظمت حاصل کر چکے ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ گویا قدرت نے مرثیہ گوئی کا اُن پر خاتمہ  
 کر دیا اور خاتم الکلام کا لقب عطا کیا۔ غرض جس حالت کو دکھایا ہے اُس کا سماں باز نہ  
 دیا ہے۔ میر صاحب نہایت نیک مزاج۔ مہذب و متین تھے۔ کتابی چہرہ۔ سڈول منہ  
 گندی رنگ۔ کرنجی آنکھیں اور گول بدن تھے۔ ضعیفی کے باعث کمر کسی قدر خم

ہو چلی تھی۔ ہاتھ میں چاندی کی شام کی جڑیا۔ انگلیوں میں فیروزے انگوٹھیاں لباس میں  
 دہلی کا تیتج کرتے۔ ڈھیلی ٹھری کا پانچا۔ گھٹنوں تک مہین شربتی کا کرتا شیچی  
 کمر توئی کا جامدانی انگرکھا۔ چوگوشیہ ٹوپی ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ مونچھیں بڑی بڑی  
 اور یہی وضع ان کے جد امجد تیرجن کی تھی۔ چہرے سے رعب و منانت کے آثار ظاہر  
 ہوتے تھے۔ سبزی منڈی سے ہو کر چوک میں اشیاء ضروری خریدنے کو تشریف لے  
 جاتے تھے۔ ایک ملازم ضرور ساتھ ہوتا تھا اور زمانہ کے انقلاب سے متاثر ہو کر  
 ۴۷ سال بعد ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ بروز چار شنبہ تمام کھٹو اس جہانِ قانی سے عالم  
 باقی کی طرف رحلت فرمائی اور اپنی یادگار تصانیف بے ہما کا کافی ذخیرہ چھوڑا۔

# میر ہمدی حسین صاحب مجروح

(۲۲)

میر ہمدی حسین، مجروح ایک خوشگوار شاہ میر حسن نگار کے بیٹے تھے۔ دلی میں دلی کے بعد سودا اور تیرنے جو محفل قائم کی تھی اور جس کی حدارت کی عزت انشا شاہ نقیر ذوق غالب کے حصہ میں کیے بعد دیگر آئی تھی اسی محفل کی مجروح آخری شمع تھے۔ مجروح کے عالم طفلی میں دلی گلزار تھی اور غالب ذوق مومن۔ آرزو شفیقہ صہبائی نیز رفیعہ حبیبہ بالکمال اپنی نغمہ سنجی کے زمانے گارہے تھے۔ ان اہل کمال کی صحبت نے مجروح کے طبعی شوق کو چار چاند لگا دیئے۔ استاد بھی نصیب سے غالب نے جن کا نظیر دنیا کے شاعری میں اردو آج تک نہ پیدا کر سکی اور جو افادے حضرت غالب سے حاصل کئے ان سے تمام طالبان کمال کو مستفید کیا۔ عذر ۱۸۵۷ء کے بعد مجروح دلی سے پانی پت گئے اور کچھ زمانے تک انصاریہ محلہ میں مقیم رہے۔ مہاراجہ آلور کی طلبی پر آلور گئے۔ مجروح کے بھائی سید سرفراز حسین مہاراجہ شیو دان سنگھ والی آلور کے مصاحب تھے۔ میر مجروح کو نائب تحصیلکداری اور پھر تحصیلداری کے عہدے پر ممتناز کیا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد جے پور رہے اور وطن کی کشش سے مجبور ہو کر واپس آئے۔ حضرت حاجی میر مجروح کے استاد بھائی تھے ایک استاد کے دوستاگرد ایک ہی زمانہ دیکھے ہوئے ایک ہی قسم کی تعلیم پائے ہوئے تھے جذبات و خیالات میں ایک دوسرے سے بے تعلق ہونے کے باوجود کبھی کبھی ہم آہنگ بھی ہو جاتے تھے

مخرج کی قوتِ تخیل کی بلند پروازی گویا آسمان سے تارے توڑ کر لاتی تھی۔ حق یہ ہے کہ مجروح کے کلام میں ذوقیات کی حلاوت اس درجہ موجود ہے کہ دل اس کے مزے میں پڑ کر کسی اور طرف ناگاہ نہیں ہوتا۔ زبان کے لحاظ سے مجروح کا دیوان اُردو لطیفہ چکر بہترین کا زمانہ ہے۔ خیالات کی نیرنگی اور تخیل کی گونا گونی مجروح کی غزلیات کو گلزار بنائے ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تاریخ مشاعرہ جو مولانا حسرت کی کوشش کا نتیجہ تھا مجروح کی شرکت کا آخری جلد تھا۔ ۵ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دنیا کی مکروہات سے سنا رہ کر کے درگاہِ قدم شریف کے عین زیرِ فصیل عیش و آرام کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔



## منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی

پیدائش ۱۶ شعبان المعظم ۱۲۲۳ھ (۲۳۳) وفات ۱۹ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ

منشی مفتی امیر احمد صاحب امیر مینائی مولوی کرم محمد صاحب مینائی کے چھوٹے صاحبزادے تھے ۱۶ شعبان المعظم ۱۲۲۳ھ میں بروز دوشنبہ بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے آپ کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے اسی اعتبار سے آپ مینائی مشہور ہوئے اس وقت شاہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ آپ کے والد ماجد مولوی کرم محمد صاحب علوم عربی و فارسی کے ایک متبحر عالم تھے کتب درسیہ متداولہ عربیہ کی ابتدائی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی اور پھر علمائے فرنگی محل کے علاوہ حاجی مفتی محمد سعد اللہ صاحب مرحوم خلف الرشید مولوی محمد نظام الدین صاحب مغفور مراد آبادی اور مفتی صدر الدین خاں آرزو دہلوی کے خرم علم سے پوری پوری خوشہ چینی کی اور فنونِ جفر و نجوم کو بھی باقاعدہ حاصل کیا تھا۔ خاندانِ چشتیہ صابریہ میں قطب الارشاد حضرت امیر شاہ صاحب قدس صاحب سجادہ سے شرف بیعت حاصل کیا اور فرقہٴ خلافت بھی انھیں سے مرحمت ہوا۔ فن سخن میں منشی مظفر علی خان آسیر لکھنؤی سے تلمذ تھا۔ حضرت امیر شیخ متصفی کے مایہ ناز شاگرد تھے تمثیر الدولہ، دبیر الملک کے دو خطاب سلطنتِ اودھ سے عطا ہوئے تھے اور حضرت آسیر کی بدولت اودھ کے آخری حکمران واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق ہو گیا تھا اور مصاحبین شاہی کے زمرہ میں داخل ہو گئے تھے، ۱۲۴۸ھ میں جب کہ غدرِ شہنشاہ کی قیادت آفرین شورش مسٹ چکی تھی اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا تو آپ راہپور تشریف لائے آتے ہی نواب یوسف علی خاں ناظم کی قدر شناسی اور بروقت فیاضی نے فسر



معاش سے فارغ انہال کر دیا اور مفتی عدالت کا معزز عہدہ عطا کر کیا اسکے بعد مشورہ سمجھنے کی  
 عزت بھی بخشی۔ اس وقت امیر صاحب کی وضع نہایت سادہ اور رویشانہ تھی سر پر لکھنؤ  
 کی چوگوشہ ٹوپی گھنٹوں سے نیچا کرتے کبھی کبھی اس پر صدری بھی پہن لیتے تھے لکھنؤ کی  
 قدیم وضع کا پانچجامہ اور کبھی گلبدن کا بھی پہنتے تھے اکثر ہاتھ میں تسبیح ہوتی تھی دوبارہ  
 جاتے تھے تو عبا یا چھ زریب تن فراتے تھے نواب ناظم کے بعد ۱۲۸۱ھ ہجری میں نواب  
 کلب علی خاں مرحوم کی قدر دانی نے آپ کے مرتبہ عزت کو اور بھی فروغ دے دیا۔ داغ  
 جلال۔ آسیر۔ تسلیم۔ حیا۔ تجر قلق۔ یتیم۔ عروج۔ وغیرہ بھی نواب کلب علی خاں کے دہن دست  
 سے وابستہ تھے ایسے باکمال حضرات کی موجودگی میں نواب کلب علی خاں کو اپنی استادی  
 کے لئے امیر مینائی کا منتخب کرنا آپ کی امتیازی شان کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ نواب  
 کی آنکھ بند ہوتے ہی پیشرازہ بکھر گیا جس کا منہ جدھر اٹھا چلا گیا۔ ۱۲۸۹ھ میں نواب میر  
 محبوب علی خاں مرحوم و مغفور والی دکن نے بھی دوران سفر کلکتہ میں امیر صاحب کو بمقام  
 بناؤں شرف باریابی بخشا اور الطاف خسروانہ سے سرفراز فرمایا۔ ۳۔ ۴ سال رام پور کے  
 قیام کے بعد ۱۰ جمادی الاول ۱۲۸۹ھ کو امیر مینائی مع خلف اوسط منشی لطیف احمد اختر  
 و شاگرد رشید حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری حیدر آباد تشریف لے گئے اور فیض الملک  
 نواب مرزا خاں صاحب داغ دہوی نے آپ کو افضل گنج میں اپنے مکان پر ٹھہرایا۔ ابھی  
 صعوبات سفر اور کسل راہ سے ہوش بجا نہ ہوئے تھے کہ امیر مینائی ایک مہینہ نوہ روز  
 بمقام آلام رہ کر ۳۰ برس ۱۰ ماہ کے سن میں بتاریخ ۱۹ جمادی الآخر ۱۲۸۹ھ مطابق  
 ۱۳ اکتوبر ۱۲۸۹ھ بمقام حیدر آباد دکن جاگوں خلدی میں ہوئے۔

امیر مینائی کے ہمت سے رسائل و مسودات غیر مرتب ہنگامہ غدر میں تلف ہو گئے تھے

اس لئے جو تحریریں ترتیب پاگئیں اور جو کتابیں شائع ہو گئیں ان کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔  
 ارشاد السلطان و نہایت السلطان یہ دونوں کتابیں صدر سے قبل تصنیف فرما کر  
 واجد علی شاہ کے حضور میں پیش کیں جن پر خلعت و انعام و حرمت ہوا تھا۔ غیرت بہارستان یہ  
 ابتدائی کلام صدر میں تلف ہو گیا جس میں لکھنؤ کے مشاعروں کی غزلیں اور مدحیہ قصائد  
 تھے۔ سترہ بصیرت میں الفاظ عربی و فارسی جو غلط زبان زد اور مستعمل ہیں انکی تصحیح فرمائی رہا۔  
 اس میں اردو مصطلحات و محاورات کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ نور تجلی۔ ابر کرم یہ دونوں فتویاں  
 حکایات و روایات۔ اخلاق و معرفت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ذکر شاہ انبیاء یہ نعتیہ مثنوی جس میں  
 حال و ولادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ داسوخت اردو رشکایت بخش خیال جمع محمد لغبار  
 صفیر آتشبار۔ آبانگ اضطرار۔ یہ ۶ داسوخت ۸۸۷ میں تصنیف کئے تھے۔

مختار خاتم النبیین میں شعراء رام پور کا تذکرہ ہو ۲۹ جلد میں تالیف ہوا۔ نمائش کے اسرار  
 احکام وادعیہ نماز کا ذکر ہے۔ زاد الامیر فی دعوت البیشر النذیر میں خواب رسالت آب کی  
 ولادت باسعادت کا حال ہے اور اس کے تاریخی نام خیابان آفرینش سے ۱۳۵۰ تکھے ہیں۔  
 ترانہ الغیب پہلا عاشقانہ دیوان ہو جو ان کی مضمون آفرین طبیعت کا اصلی نمونہ ہے صنفی و عشق  
 ۱۳۱۳ میں دوسرا عاشقانہ دیوان مرتب ہوا۔ اس میں حضرت داغ کی بہت سی ہم طرح غزلوں کا جواب ہے  
 جو ہر انتخاب گو ہر انتخاب میں مفرات اردو کا مجموعہ ہے۔ دیوان تصائد اردو صنم خانہ کے لیے  
 طبع کی نوبت نہیں آئی۔ امیر اللغات کی تین جلدوں میں اردو زبان کے متبسط اور پیش رفت و  
 محاورات ہیں جس کی وہ جلدیں چھپ گئی ہیں یکتوبات امیر میں خاص خاص موعوں پر اپنے ارشاد  
 تلامذہ سے روحانی معانقہ کیا ہے اور اکتساب علم و ادب میں ان کی نمائندہ رہ نمائی  
 فرمائی ہے۔

# فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب دہلی

پیدائش ۱۲۶۴ھ وفات ۹ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ (۲۴)

فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب دہلی مرحوم نواب نجر الدولہ ستم جنگ نواب  
 آج بخش خاں صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خان صاحب برادر کلاں  
 نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب نیر مرحوم جاگیر دار لوہارو کے بیٹے تھے۔ نواب احمد بخش  
 خاں مرحوم کے والد بزرگوار عارف جان صاحب مرحوم مع اپنے بڑے بھائی قاسم جان صاحب  
 مرحوم دہلی خان صاحب مرحوم کے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے نواب قاسم جان  
 صاحب مرحوم نے شاہ عالم روشن اختر شاہ دہلی کی ملازمت اختیار کی اور حسن خدمات  
 کے صلہ میں جاگیر اور نواب شرف الدولہ سہراب جنگ بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ دہلی مرحوم  
 ۱۲۶۴ھ میں دہلی پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت سے فلاح ہو کر حضرت ذوقی مرحوم کے  
 سامنے نوازے ادب کیا۔ غدر ۱۲۸۵ھ کے زمانہ تک دہلی میں قلعہ شاہی سے تعلق رہا۔ غدر  
 ۱۲۸۵ھ کی قیامت آفریں شورش فرد ہونے کے بعد نواب یوسف علی خاں صاحب ناظم  
 والی رام پور کی بروقت فیاضی اور قدر شناسی نے اہل کمال کو اپنے یہاں بلا کر فکر معاش  
 سے آزاد کر دیا۔ چنانچہ حضرت ذوقی کو بھی نواب صاحب نے رام پور بلایا۔ نواب ناظم کے  
 بعد نواب کلب علی خاں نے قوشہ خانہ کا عہتم بنایا۔ نراش خانے اور صطیس کی خدمت کے  
 سوا اپنی مصاحبت کی عزت سے بھی سرفراز کیا اور یہاں تک عزت بخشی کہ اپنے ہمراہ  
 حرمین شریف کی زیارت سے بھی مشرف کیا۔ نواب کلب علی خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی  
 ریاست کے اندرونی اور بیرونی انتظامات میں بہت کچھ روو بدل ہوا اور سب سے پہلے

شعراء کے نام متوسلین ریاست کی فہرست سے خارج کئے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جس کا منہ  
 جدھر اٹھا چلا گیا۔ یہیں سے حضرت داغ بھی ۳۱ھ میں حیدرآباد دکن پہنچے  
 اور کچھ عرصہ بعد حضور نظام دکن کے دربار میں حاضری کا موقع ملا۔ چار برس تک  
 امید داری کی اور اس عرصہ میں دو ایک مرتبہ دہلی بھی آئے ۳۲ھ میں فرمانِ صفی  
 نافذ ہوا اور حضور نظام دکن نے مشورہ کسٹن کی عزت بھی بخشی۔ کہتے ہیں کہ حضور نظام  
 دکن کے کلام کی دستی و اصلاح کا کام عجیب طور پر انجام پاتا تھا جو بد اثر غزل لیکر آتا تھا  
 اور حضرت داغ اُسے دیکھ کر اور ضروری اصلاح کے بعد واپس کرتے تھے لیکن حضور نظام  
 دکن اس کو متواتر واپس کرتے تھے کہ یہ لفظ یا مصرعہ اچھا نہیں بدل دیا جائے یا اس شعر کو  
 اس دھنگ سے لکھا جائے اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوتا تھا کہ غزل ہو اور ہو جاتی تھی  
 اور حضرت داغ اپنے وسیع النظر اور متاثر شاگرد کی اصلاح میں غیر معمولی فکر سے کام لیتے  
 تھے اسی طرح دریادل و قدر شناس شاگرد بھی اپنے استاد کو توجہاتِ شاہانہ اور قابلِ شک  
 عزت و وقعت اور ناز و برداری سے سرفراز کرتا تھا اسکے بعد یہاں تک قدر دانی کی کہ  
 جہاں اُسنادِ ناظم یا رجنک۔ دبیر الدولہ نواب نصیح الملک کے مغزِ خطابوں سے  
 متاثر فرمایا۔ حضرت داغ بارہ سال کی عمر سے قلعہ دہلی میں دلی عہد کی خدمت میں رہے  
 اس کے بعد کم و بیش چالیس برس دربارِ رامپور میں باریاب رہے اور پھر حیدرآباد  
 دکن محلہ محبوب گنج میں دربارِ دکن کے فرمان سے مقیم رہے۔ دربارِ دکن سے عطیات  
 شہادت کے علاوہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ بطور تنخواہ ملتا تھا اور اسی قدر آپ کے اعزاء اور  
 متوسلین بھی پاتے تھے اسکے علاوہ ایک گالوں بھی عطا ہوا تھا جو آخر وقت تک  
 آپ کے قبضہ اور تصرف میں رہا اٹھارہ برس تک حضور نظام دکن نے جو کچھ بھی تدانی کی

وہ اہل کمال کے لئے باعثِ رشک ہوئی۔

حضرت داغ کی زندگی میں ان کے تین دیوان شائع ہو چکے تھے گلزارِ داغ آفتاب  
 داغ - منتاب داغ - پہلا دیوان اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ راجپور میں مقیم تھے،  
 آفتاب داغ میں کچھ غزلیں راجپور کے زمانہ کی ہیں کچھ اس کے بعد کی۔ منتاب داغ  
 حیدر آباد کن میں شائع ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ یادگارِ داغ  
 کے نام سے چھپا ہے۔ ان دیوانوں کے علاوہ ایک مختصر فنوی فریاد داغ بھی ہو جو ۵۵  
 صفحوں پر ختم ہوئی جو جس کی زبان نہایت سلیس اور فصیح ہے بیان کا تسلسل  
 قابلِ تعریف ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ فریاد داغ میں  
 سلاستِ زبان اور روانی کلام کی وہی حدیں پہنچی ہوئی ہیں جو داغ مرحوم کی مایلا تیانہ  
 خصوصیت ہے حضرت داغ نے اکثر تارخی مادے جو خاص مواقع پر فی البدیہہ کہے ہیں  
 بہت مشہور ہیں۔ حضرت داغ کی زبان کی بابت زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے جو سادگی اور  
 صفائی اردو میں انہوں نے پیدا کی ہو وہ انھیں کا حصہ ہے فصیح الفاظ عام فہم ترکیبیں  
 جربستہ محاورے۔ سلجھی ہوئی بندشیں۔ رد و قرہ کی صفائی اور اس کے ساتھ سوز و گداز ان  
 تمام اعتبار سے ان کا طرزِ بیان بے نظیر اور ان کا تمام کلام زبان کے محاسن سے  
 لبریز ہے۔ زبان کی طرح حضرت داغ نے حسبِ ضرورت تشبیہات و استعارات جو جہاں  
 کام لیا ہو وہاں میانہ روی کو بھی مد نظر رکھا ہے اکثر غزلیں ناسخ و تمثیل۔ ذوقِ شباب کی  
 زمیوں میں بھی کہی ہیں ان زمیوں میں حضرت داغ نے اپنا جدِ اگلا رنگ قائم کر کے کامیابی  
 حاصل کی ہے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ حضرت داغ اپنے رنگ کے موجد  
 تھے ان کی دیکھی کچھی اکثر شعرا نے ان کی تقلید کی لیکن نقل میں اصل کا رنگ کہاں،

متقدمین میں جرات کا رنگ حضرت داغ سے ملتا ہوا ہے لیکن حضرت داغ جس منزل پر پہنچے ہیں جرات کو دہاں کی ہوا بھی نہیں لگی اور محاسن کے ماسوا سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے جذبات بالکل بچرل ہیں اور اسی وجہ سے ان کا کلام تاثیر سے دست و گریبان ہے۔ کلام کی شوخی۔ طرز بیان کی جدت۔ خیالات کی برستگی یہ تمام باتیں حضرت داغ کے کلام میں کوٹا کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ باہمی رمز و کنائے۔ محاورے۔ رد و مرہ اور شعراء کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ لیکن حضرت داغ نے ان پر جدت کا ایسا رنگ چڑھایا ہے کہ گویا یہ انھیں کا خاص ایجاد ہے حضرت داغ کے شاگردوں کا بہت وسیع دائرہ ہوا اور کوئی شہر ایسا نہیں جہاں آپ کا نام لیا نہ موجود ہو۔

آخر ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۷ فروری ۱۹۰۵ء کو اس دائرہ فانی سے عالم بقا کی طرف رحلت کی اور اپنے اقربا کو داغ مفارقت دیا۔

# خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کبر تصوی

پیدائش نومبر ۱۸۴۷ء (۲۵) وفات اکتوبر ۱۹۲۲ء

آپ نومبر ۱۸۴۷ء میں بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے اور علوم مشرقی فارسی و عربی کی تعلیم پاکر علوم مغربی کی طرف توجہ کی ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان دیا اور اول درجہ کی ڈگری حاصل کی ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار پر تقرر ہوا ۱۸۷۷ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے مثل خواں ہوئے اور کچھ دنوں بعد وکالت شروع کی ۱۸۷۸ء تک کالت کا مشغلہ جاری رہا۔ ۱۸۸۰ء میں دوبارہ سرکاری ملازمت حاصل کی اور منصف ہو گئے اور منصفی سے درجہ بدرجہ ترقی پا کر ۱۸۸۸ء میں سب ججی حاصل کی ۱۸۹۳ء میں جج عدالت خفیفہ درجہ اول ہوئے اور پھر جج ہو گئے۔ کئی سال تک بارہ سورہ پے ماہو اور پاتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے جڈیشل سرس کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۰۳ء میں اپنے مستقل عہدہ ججی الہ آباد سے نہایت نیک نامی کے ساتھ سکندرشہس ہو کر پٹنن لے لی اور الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہو گئے۔

نشی غلام حسین صاحب دچند شاگرد رشید حضرت خواجہ آتش سے شرف تلمذ حاصل کیا اور مغربی خیالات کو مشرقی لباس پہنا کر ایشیائی رنگ میں رنگنا آپ کی فطرت میں داخل تھا۔ نئی روشنی والوں کو انگریزی معاشرت اور تمدن سے معاشرت اختیار کرنے کا جو پہلو آپ نے اپنی تصانیف میں اختیار کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔

سامعین کے قلوب آپ کے طریقہ انصاف سے بہت جلد اثر پذیر ہوتے ہیں آپ نے اپنی ہر اثر تمثیلات سے قلوب پر ایسا فوری اثر ڈالا جس کی نظیر محال کیامعنی قطعی ناممکن ہے۔

متغربی مشاہیر کے کلام کا اردو ترجمہ اس خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے کہ سبحان اللہ جن عشق کے مضامین آپ کے کلام میں بہت کم پائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور صحیح جذبات کے جواہرات سے پُر ہے۔ آپ کی شاعری نے ثابت کر دیا کہ ایک خوش گوشا عر کے لئے ہجر و وصل، گل و بلبل وغیرہ کی کہانی مایہ ناز نہیں۔ بلکہ وہ اپنی سچی اور درد انگیز لڑائی سخی سے جذبات کا ایک کوس پریرا میں نظم کر سکتا ہے اور اس سے سنسنے والوں پر جو وجد کی حالت طاری ہوگی اُس کا قلمبند کرنا ناممکن ہے۔ اساتذہ متقدمین متاخرین سے علیحدہ ہو کر جو ایک جدید مسلک آپ نے اختیار کیا ہے اُس کی مثال صرف انھیں کے کلام میں ملتی ہے آپ کی وسیع النظری بلند پروازی اور قادر الکلامی نے سامعین کے دلوں پر مقبولیت کا ایسا سنگہ جابایا ہے جو کسی طرح زائل نہیں ہوتا۔ پولیٹیکل اور سوشل معاملات میں جو کچھ کہا ہے وہ قوم و ملک کے لئے ایک دستور العمل کی طرفت آمیز پیرایہ میں فلسفیانہ نکات حل کر دیا یا کوئی سبق آموز نتیجہ نکالنا تو آپ کی فطرتی طبیعت کا خاصہ ہے مگر سنجیدہ و متین طرزِ تغزل جو ہمہ تن حکمت و اخلاق پر مبنی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے دیوان اٹھا کر تغزل کی شان دیکھی جائے تو ہر لفظ و فقرہ ہدایت نظر آتا ہے طریقہ کلام کی بابت یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس خاص رنگ سے تو سارا ہندوستان آپ کا زیر اثر ہے۔ ہندوستان میں نہیں بلکہ اردو دنیا میں کبرآبادی فطرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ اور نہایت حیرت انگیز انداز بیان لے کر آئے تھے، جس نے شیخ سعدی و حکیم سنائی کو نہ دیکھا ہو وہ اکبر کو دیکھے۔ آپ کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں چوتھا مرتب ہو رہا تھا کہ آپ نے قوم کو داغ مفارقت دیا اور اکتوبر ۱۹۲۷ء کو اس دیرِ ناپائیدار سے رحلت کر کے ملکِ بقا میں سکونت اختیار کی اور تربتِ پاک الہ آباد میں ہے۔



# پندت برج زاین صاحب حکمت

پیدائش ۱۸۸۲ء (۲۶) وفات ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء

پندت برج زاین صاحب حکمت ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور عالم طفلی میں لکھنؤ آکر ابتدائی تعلیم شروع کی تحصیل علم سے فارغ ہو کر علم مغربی کو باقاعدہ سیکھا ۱۹۰۶ء میں کینیڈا کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی۔ آپ نے نیچرل شاعری کی طرف پوری پوری توجہ کی آپ کی تصنیفات نے نیچرل شاعری کو جو تقویت پہنچائی ہو اس کا اعتراف ان لوگوں کو بھی ہے جو آپ کو اس عزت کا مستحق نہیں سمجھتے جو انھیں ملک و قوم نے بخشی ہے مختلف موضوع پر آپ کی متعدد و تصانیف سے علمی عظمت کی کفالت ہوتی ہو جس سے وسیع المعلومات اور بلند فکر ہونے کا بہت کچھ ثبوت ملتا ہے۔ سولہ ماہ ۱۹۰۷ء میں کمرے سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا آپ نے عامیانه تغزل کے میدان کو چھوڑ کر نیچرل شاعری کے میدان میں تازگی خیالات شاعرانہ لطافت اور قومی جذبات کے ایسے جوہر دکھائے ہیں جو آج تک دل پر نقش ہیں۔ قومی مناظر کو اکثر جگہ اس صفائی سے دکھایا ہے کہ سبحان اللہ آپ کے کلام میں حضرت آتش مروج کی جھلک نظر آتی ہے اور سندس میں حضرت انیس کا نتیجہ ہے۔

۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو آپ ایک مقدمہ کی بیرونی کے لئے رائے بریلی گئے تھے کہ یکایک فوج میں مبتلا ہوئے اور زبان بند ہو گئی، بجے شام کو رائے بریلی کے اسٹیشن پر پر انتقال ہوا۔ آپ کی لاش لکھنؤ لائی گئی اور آپ کے اقربا نے سب آخری مراسم

ادا کئے۔ گو آپ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں مگر آپ کی تصانیف آپ کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھتی ہیں، ایک مجموعہ صحیح وطن کے نام سے اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جو ادبی دنیا میں آپ کی زندہ یاد گار سمجھا جاتا ہے۔ فرن ڈراما نویسی میں بھی آپ کافی ہمارت رکھتے تھے چنانچہ ایک کلمہ ڈراما تحریر فرمایا ہے جس نے اہل کمال سے کافی خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کئی اور تصنیفیں بھی پاک سے مقبولیت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکی ہیں۔



# ڈاکٹر محمد اقبال - ایم لے پی ایچ ڈی

(۲۷)

آپ شش دہائیوں میں پیدا ہوئے۔ قدیمی وطن سیالکوٹ جو شمس العلماء مولوی سید میر حسن صاحب سے علوم مشرقی فارسی عربی کی کامل تعلیم پائی، علم ادب سے طبیعت میں مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ اس لئے مولوی صاحب موصوف کی تعلیم سونے پر سہاگہ ہو گئی چونکہ طبیعت میں شعر و سخن کا فطری مذاق موجود تھا اسلئے آپ نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں سیالکوٹ کے مشاعروں میں شراکت شروع کی اور حضرت داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ سیالکوٹ کالج میں ایف لے کا اس تک تعلیم پائی اور لاہور کالج سے ایم لے کی ڈگری حاصل کی۔ سٹرٹامس آرنلڈ صاحب سے علم فلسفہ سیکھا اتفاق سے سٹرٹامس آرنلڈ انگلستان چلے گئے، بھٹانہ میں شفیق استاد نے آپ کو انگلستان بلایا اور جس مذاق کی بنیاد مولوی سید میر حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں حضرت داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا اس کے آخری مرحلے سٹرٹامس آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر میگزٹیکرٹ براؤن نیکلسن اور سارلی کے مفید لیکچروں سے آپ نے حیرت انگیز ترقی حاصل کی۔ پروفیسر نکلسن نے آپ کی مشہور فارسی نظم استراذ جہودی کا انگریزی ترجمہ کر کے اور اس پر دیباچہ و توحاشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو آپ سے روشناس کیا کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آپ جرمنی گئے اور علمی دنیا کے اعلیٰ مدارج طے کر کے واپس آئے۔ آپ نے رمانہ قیام یورپ میں بہت سی فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کا خلاصہ ایک محققانہ کتاب کی

صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کو دیکھ کر اہلِ جہنم نے آپ کو ”ڈاکٹر“ کا علمی درجہ دیا اور گورنمنٹ بنگالیہ نے ازراہِ قدردانی ”سر“ کا ممتاز خطاب عطا کیا۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں آپ کی نظم ہائیکو خزن میں شائع ہوئی جس سے آپ کی اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک آپ کی شاعری کا ایک دوسرا دور شروع ہوا (یہ وہ زمانہ ہے جو آپ نے یورپ میں بسر کیا) یعنی آپ کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعہ اتھار

خیال بنالیا۔ فارسی میں آپ کے قلم سے تین کتابیں اس وقت تک نکلی ہیں ”اسم اربخودی“، ”دو رموز بیخودی“ اور ”پیامِ مشرق“ جو لوگ آپ کے اردو کلام کے دلدادہ ہیں وہ ان کتابوں کو فارسی زبان میں دیکھ کر بہت مایوس ہوئے ہونگے۔ مگر انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ فارسی نے وہ کام کیا ہے جو اردو سے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کا مجموعہ بانگ درا کے نام سے ستمبر ۱۹۲۳ء میں تین ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ بانگ درا تین حصوں میں منقسم ہے حصہ اول میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں موجود ہیں حصہ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک کی اور حصہ سوم میں ۱۹۰۷ء سے لیکر آج تک کا اردو کلام ہے۔ یہ دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسا مجموعہ نہیں شائع ہوا جس میں خیالات کی فردانی مطالب و معانی کی سمجھی تصویر۔ تجربے و مشاہدے کا پنچوڑا اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہو۔

اس وقت تک آپ کی عمر ۶۲ سال کے لگ بھگ ہو اور آپ کو لیمپٹیک کونسل صوبہ پنجاب کی ممبری کا بھی فخر حاصل ہو گا آپ حضرت داغ مرحوم کے شاگردِ رشید ہیں

اگر آپ کا مذاق سخن حضرت غالب مرحوم کا رنگ قبول کرتا ہے۔ نارسائی میں حس انفا  
شیرازی کے رنگ میں اکثر غریب کئی ہیں جن کے دیکھنے اور سمجھنے سے آپ کی خدا  
داد و بابت اور عروج فکر کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے صحیح جذبات  
اور دلکش نظموں کی داد کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔

”اللہ کرے زودِ قلم اور زیادہ“



# حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانچوری

(۲۸)

حافظ سیاح جلیل حسن صاحب جلیل مانچوری وہ خوش نصیب اور صاحب کمال شاعر ہیں جن کو حضرت امیر مینائی کے فیضانِ صحبت اور تلمذ نے نہ صرف ادبی دنیا میں شہرہ کی بلکہ دنیوی فکری سے بھی ناریخ اہل کر دیا آپ امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ سے ہیں۔ امیر اللغات کی ترتیب میں آپ نے وقت صرف کیا اور حضرت امیر مرحوم کا بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔ اجمادی الآخر ۱۳۱۸ھ کو آپ حضرت امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد دکن پہنچے اور ۱۳۲۲ھ میں وزارتِ پناہ کے شریک سفر رہے۔ ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ کو چند اجاب کے اصرار سے آپ نے ایک سالہ تذکیر تائیت شائع کیا جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تائیت بہت واضح طور پر تہائی ہے یہ رسالہ آپ کی محققانہ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے ۱۳۲۸ھ میں میر محبوب علی خاں صاحب مرحوم سابق تاجدار دکن نے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ عطا فرمایا اور اپنی استاد کی کا بھی شرف بخشا اور حضرت داغ مرحوم کی جگہ پر مامور کیا اور جلیل القلم کے معزز خطاب سے سرفراز کیا یہ بین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد نے بھی ایک سو روپے ماہوار کا استمراری وظیفہ عطا کیا ۱۳۲۸ھ میں پکا دیوان "تاج سخن" شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرا دیوان بھی شائع ہوا جو خاص خاص حاصلِ حباب میں تقسیم کیا گیا۔ آپ کا کلام زیادہ تر حضرت امیر مینائی کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو جانشینی کا مرتبہ حاصل ہوا۔ زبان کے لحاظ سے آپ کے دونوں دیوان آدھ دو لفظ بجز کا بہترین کا نام ہیں۔ آپ کی زبان فصیح جملوں کی ترکیب سلیجی ہوئی۔ استعارے قریب الفہم۔ تلخیصات مانوس۔ غرض جو صفات کسی شعر کو ذوقِ سلیم کے لئے پر لطف بنا دیتے ہیں وہ آپ کے کلام میں موجود ہیں اور یہ سب خوبیاں حضرت امیر مینائی کی بانئیں صحبت کا نتیجہ ہیں۔

# مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت ہانی بی لے

(۲۹)

فدائے قوم مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت ہانی سے اہل زمانہ بخوبی واقف ہیں آپ کا  
مولانا وطن منسوب بن "ایک مردم خیز اور مشہور قصبہ ہے۔ آپ نے بی لے، محمد طن کالج علی گڑھ میں اس  
کیا طالب علمی کے ہی زمانہ سے آپ کو قوم و ملک کے ساتھ قلبی محبت ہو چکی تھی اظہارِ اسیرت و محبت آپ نے اپنی  
کئی بار اپنے قومی فلاح و سبودی کی وجہ سے شدید مصائب برداشت کئے لیکن ضمیر اور کوشش نے اسے  
خلاف کبھی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کی بہت کم ایسی باتیں ہیں جنہوں نے پختگی کے ساتھ اپنے دل  
نیچل کر ایک کر دکھایا ہو، آپ منشی امیر اللہ صاحب تسلیم کے شاگرد رشید ہیں، آپ کے کلام میں خوش  
نوسن کی جھلک نظر آتی ہے جو شعر سوز و گداز میں دُوب کر کہا ہے اُس کا مزہ دل سے نکل نہیں  
ہوتا سلسلہ سے سلسلہ تک یعنی زمانہ طالب علمی مولانا نے فقیہ و علمی گدھ کا کلام جس میں  
غزلوں کے علاوہ قصائد مشنویاں اور بہت سی انگریزی نظمیں کو ترجمے میں لکھے پاس محفوظ ہیں آپ نے  
"اردو" معنی اُن کے اجرا کو سلسل ادبی خدمت انجام دی جو وہ قابلِ عدا تائش ہے۔ فردری سلسلہ  
میں آپ کی کل مختصر غزلیات کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ہے جو ادبی رسائل میں شائع ہو کر بہت کچھ خرچ تحسین  
حاصل کر چکا ہے۔ اس کے بعد کئی حصے اور بھی شائع ہو چکے ہیں جو پاکیزہ خیالات، صحیح جذبات و اوقات  
قلبی تخیل کی بلند پروازی اور علم ادب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دیوان غالب کی شرح خوب لکھی ہے اور اس کا  
مقدمہ بھیجنے کے قابل ہے۔ اخبار "مستقل" کا پورے جو اس وقت آپ کی ادارت میں نکل رہا ہے اس کے  
قومی دلیکے کا زمانہ اظہار من الشمس ہیں۔ مولانا حسرت نے فلسفہ محبت کے رموز پر جہاں قلم اٹھایا ہے  
وہاں زیادہ تر بہت بلند جذبات کا اظہار کیا ہے اور قدرت پر کیا ایسا درمندانہ اظہار کیا ہے جو فی زمانہ قابلِ شکر ہے

# یمن السلطنت ہمارا جہ سرکش پرشاد صاحب

(۳۰)

یمن السلطنت ہمارا جہ سرکش پرشاد صاحب شاد جی سی آئی ای ریاست حیدر آباد دکن کے  
سابق وزیر اعظم ہیں۔ عہدہ وزارت کے بعد کچھ عرصہ تک پیشکار رہے۔ ۱۸۶۶ء میں آپ جلوہ  
افروز دکن ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۸ سال کے لگ بھگ ہے۔ آپ نے عہدہ  
وزارت میں وہ کام انجام دیئے ہیں جن کی مثال محال کیا معنی ناممکن ہو۔ آپ کا لٹریچر  
نراق نہایت مستحضر اور متین ہو اور دو فارسی کے علاوہ انگریزی و عربی پر پوری پوری دستگاہ  
ہو۔ آپ کی کئی نادر و اعلیٰ تصانیف شائع ہو چکی ہیں، آپ کا کلام حسن تخیل، سلاستِ زبان،  
خوبیِ محاورات، بندشِ الفاظ، نواسے ترکیب، غرض تمام محاسنِ لفظی و معنوی کا اعلیٰ نمونہ  
ہوتا ہے۔ آپ کا بیشتر کلام رنگِ تصوف میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ جس سے پورا پورا اخلاقی سبق  
حاصل ہوتا ہے۔ آپ نثر بھی خوب لکھتے ہیں فنِ ناول نویسی میں بھی آپ کو کافی مہارت ہے۔  
چنانچہ فسانہ شہید کے نام سے ایک ناول شائع ہو چکا ہے پنجاب میں آپ نے زناہ عام  
کے لئے بہت کچھ مالی امداد فرمائی اور جا بجا ہندو مسلمانوں کو برابر تقسیم زر و دولت سے  
سرفراز فرمایا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں اس وضع اور خیال کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔



# تعارف

مندرجہ ذیل حضرات کے حالات زندگی باوجود سعی حاصل نہ ہو سکے اس لئے کیونکہ  
نے بطور تعارف مختصر اُن کے اوصاف حمیدہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی کا نام ادبی دنیا میں تعارف کا محتاج نہیں، جس نے  
انجاء الملکال کی زیارت کی ہوگی وہ آپ کے زور قلم، ادبی خدمات اور قومی جذبات کا اندازہ کر سکتا ہے  
منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی آج کل بھوپال میں مقیم ہیں طبیعت میں شوخی اور مزاج میں رنگینی  
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو نظم میں بلند پروازی اور نزاکت سے کام لیتے ہیں نشر میں ایک خاص رغبت رکھتے ہیں۔  
ظفر الملک لوی سختی علی صاحب کا کوڑی لکھنؤ کے مشہور ادبی رسالہ "الناظر" کے قابل اڈیٹر ہیں  
آپ کی انگریزی قابلیت نہایت اعلیٰ ہو تصوف کی جانب میلان زیادہ ہو، نہایت منکسر مزاج اور فرشتہ  
خصلت انسان ہیں آپ نے اردو زبان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو اور ہر وقت انھیں  
خیالات میں متغرق رہتے ہیں اخبار "مشیر بہار" میں "بھی آپ کی اڈیٹری کا فخر حاصل کر چکا ہے۔  
شاہ نظام الدین صاحب لکھنؤ آگرہ، کٹرہ میوہ میں رہتے ہیں آپ ایک معزز خاندان کے چشم  
چراغ ہیں ادبی خدمات میں ہر وقت منہمک رہتے ہیں سالہ دولقاد، کو آپ کی ادارت کا فخر حاصل  
ہے اور جو دوی سالہ سے جزی سنہ ۱۹۲۰ء تک دولقاد کے اجراء سے جو ادبی خدمت آپ نے  
کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

سان الملک سید ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی حضرت امیر سنیائی مرحوم کے بہترین شاگرد ہیں  
آپ حضرت داغ مرحوم کا تتبع کر رہے ہیں آپ کا انداز بیان بہت دلغریب ہو، نشر میں خاص رغبت رکھتے ہیں۔

منشی سلطان احمد صاحب خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب ٹیڈ ککھر کے عزیز میں شریف  
 لکھتے ہیں درہر وقت زبان اُردو کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہتے ہیں آپکا اندازِ تحریر اخلاقی مذاقِ لئو ہوئے ہوتا ہو  
 مولانا سید علی حمید صاحب نظم طباطبائی لکھنوی پروفیسر عربی نظامیہ کالج حیدر آباد دکن بہت  
 عالی خیال اور بلند پر داز اور مسلم الثبوت اُستاد ہیں آپ کی معنی آفرینی اور سخن سنجی اور زبانِ مستند  
 ہے آپ اس وقت معناتِ زمانہ سے ہیں تاجرِ علمی کے اعتبار سے آپ کا پایہ نہایت بلند اور رفیع ہے۔  
 سحر البیان مولوی شیخ احمد علی صاحب شوقِ مرحوم لطحاتِ لکھنؤ کے باشندے تھے، عربی و فارسی  
 کی تکمیل کے بعد آپ نے فنِ سخن کی پوری پوری تعلیم پائی تھی، علمِ مغربی سے بھی واقفیت رکھتے تھے  
 فنِ عروض کے ماہر تھے، مظفر علی صاحب اسیر لکھنوی کے بہترین شاگردوں میں سے تھے، ایک عرصہ  
 تک اخبارِ آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ لکھنؤ سے بھوپال آئے اور نائب ناظم مقرر ہو گئے، ۱۳ سال  
 بعد اس خدمت سے سبکدوش ہوئے اور پنشن لیکر رامپور چلے گئے، یہاں لیلیٰ امیر اللغات کی خدمت  
 آپ کے سپرد ہو گئی اور کئی سال اس خدمت کو انجام دیا، رامپور سے آنے چاہے گئے اور تازہ لیت  
 اپنی بیٹی کے پاس رہے۔ کئی دگلدہ زمنیوں نے آپ کی یادگار ہیں جو قدرت آپ کو نظم میں حاصل تھی  
 وہی نثر میں تھی آپ نے اپنے کمال کی بدولت لافانی عظمت اور دیر پا شہرت کے وہ مدارج  
 طے کئے ہیں جو فی زمانہ اُردو شعراء میں بہت کم ان کے مقابلہ میں آسکتے ہیں۔





---

**Printed at  
The Agra Akhbar Press,  
Agra,**

---

